شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ایک سیاسی مطالعہ

مرتبہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلام

پاکستان

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ایک سیاسی مطالعہ

مرتبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلام

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ

ایک سیاسی مطالعہ

مرتبہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

اشاعت : جنوری ۱۹۸۷ء
طابع : المخزن پرنٹرز۔ پاکستان چوک، کراچی

نظرِ ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن

مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ پاکستان

فہرست

پیش لفظ

یہ کتاب پہلی بار جنوری ۱۹۸۷ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ مارچ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی پر دہلی میں سمینار ہونے والا تھا۔ اس کتاب کو سمینار کے مندوبین کے نام معنون کیا گیا تھا۔ گویا کہ یہ سمینار کے مندوبین کے لیے پاکستان میں حضرتؒ کے عقیدت مندوں اور وابستگانِ سلسلۂ عالیہ کی طرف سے ایک تحفہ تھا۔

اس کے باوجود کہ یہ کتاب بڑی عجلت میں مرتب کی گئی تھی، لیکن چوں کہ سیاسی افکار و خدمات کی جہت سے حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کے مطالعے کی یہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی، پاکستان میں اسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ اس سے پہلے پاکستان یا ہندوستان میں اس قسم کی کوئی کوشش عمل میں نہیں آئی تھی۔ چوں کہ یہ کوشش پاکستان میں عمل میں آئی تھی، ہندوستان میں اسے حیرت سے دیکھا گیا۔ بعض حضرات نے یہ کہا کہ اس کام کو اس سے بہت پہلے ہندوستان میں ہونا چاہیے تھا اور اس سے بڑے پیمانے پر۔ انھوں نے پاکستان سے اس کتاب کی اشاعت کو پاکستان میں بدلتے ہوئے رجحانات کا اشاریہ بھی سمجھا۔ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں تھوڑی سی عدم واقفیت یا غلط فہمی کارفرما ہے۔

بلاشبہ مختلف اسباب کی بنا پر قیام پاکستان کے اوائل میں ایک جذباتی فضا تھی اور ایک حلقے میں ان بزرگوں کا تذکرہ پسند نہیں کیا جاتا تھا، جنھوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور جن کا خیال تھا کہ قیام پاکستان سے پورے ہندوستان کے خصوصاً اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اور مجموعی طور پر ہندوستان میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمان رہ جائیں گے جن کے مفادات کو نظر انداز نہیں کر دیا جانا

چاہیے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ جوش ٹھنڈا پڑتا گیا، جذباتیت ختم ہوتی گئی اور لوگ کھلے دل سے ہر طرح کے واقعات و مسائل پر ایک دوسرے کی بات سننے اور سنجیدگی کے ساتھ بحث و مذاکرہ کے لیے تیار ہوتے گئے۔ اب اگر پاکستان میں سیاسی بنیاد پر کسی دائرۂ فکر اور حلقۂ مفادات میں حضرت شیخ الاسلام کو پسند نہیں کیا جاتا تو اس پر تعجب کیوں ہو! ہندوستان پاکستان میں تو ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو اسلام کے دیوبندی مکتبۂ فکر کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا۔ اور اس سے کہیں زیادہ وسیع حلقہ ہے جس میں مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری مرحوم لیاقت علی خاں کو پسند نہیں کیا جاتا اور ایسے اخبارات ہیں جن میں ان پر کبھی کوئی مضمون حتیٰ کہ ان کے یوم شہادت پر بھی کبھی کوئی مضمون نہیں چھپتا۔ البتہ ان کی مخالفت کی جاتی ہے۔ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی سیکڑوں شخصیات ہیں جنھیں یکسر فراموش کر دیا گیا اور سندھ سرحد اور بلوچستان کی سیکڑوں ادبی سیاسی شخصیات کو نصاب تعلیم میں جگہ دی گئی ہے، جن کا تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہ تھا۔ تعلق تھا تو لاگ کا نہ کہ لگاؤ کا۔

اس غلط فہمی کو بھی دور کر لینا چاہیے کہ یہ مخالفت اور ناپسندیدگی صرف لیگی حضرات کی طرف سے اور صرف سیاسی بنیاد پر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس فضا کی تخلیق میں سب سے زیادہ حصہ ان حضرات کا ہے جو دیوبند ہی کے مذہبی مکتبہ فکر اور خانقاہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس مخالفت کا گڑھ دارالعلوم کراچی اور جامعہ اشرفیہ، لاہور ہے۔ پھر اگر ان حضرات نے یہاں کی سیاست کو کسی حد تک متاثر کیا ہے تو اس سے زیادہ تو ان کی ذریات نے خود دیوبند کے باقیات الصالحات کو وہیں آزمائش میں ڈالا ہے۔ اس صورت حال میں پاکستان میں حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کی مخالفت اور ناپسندیدگی کا صرف پاکستان کے ماحول، اس میں لیگی حضرات، بریلوی مسلک اور جماعت اسلامی کی مصلحت و سیاست ہی کو کیوں کر ملزم گردانا جاسکتا ہے۔

اس بات کو بھی بالکل فراموش نہیں کر دینا چاہیے کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ملک کی سیاست کو جو فرقہ وارانہ آب و رنگ دیا گیا تھا، اس کے اثرات

ایک دم ختم نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن جلد ہی ختم ہونا شروع ہو گئے اور

- رفتہ رفتہ ایسا ماحول ضرور پیدا ہو گیا جس میں مخالف رائے اور نقطۂ نظر پر بھی سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔
- قیام پاکستان کے بعد بیس سال سے لے کر تیس سال تک کے عرصے میں تقریباً وہ نسل ختم ہو گئی جس نے تحریک پاکستان میں پرجوش اور سرگرم حصہ لیا تھا۔
- بنگلہ دیش کے قیام نے نعروں سے پیدا کی ہوئی فضا کی گرد اور غبار کو تہ نشیں کرنے میں خاص حصّہ لیا۔
- ان اسباب پر حالات کی سنگینی اور مسائل کے ہجوم نے تو جذبات کو نہ صرف ٹھنڈا کیا بلکہ پژمردگی کی حد تک پہنچا دیا۔

اب نوجوان طبقہ خواہ وہ کسی نسل و برادری اور کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہو، گزشتہ تاریخِ اسلامیانِ ہند اور تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں، دوروں، مسئلوں، مسلکوں کے پس منظروں اور اختلافات کے محرکوں کو جاننا چاہتا ہے۔ اور ٹھنڈے دل سے ان پر غور کرتا اور سوچتا ہے کہ کیا واقعی مسئلہ ہندو مسلم تھا، کیا متحدہ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ واقعی کفر و اسلام کی جنگ تھی، کیا اس کی تہ میں مختلف طبقاتی مسائل اور مفادات کارفرما نہ تھے، کیا مسلم لیگ کی سیاست واقعی اسلامی دعوت کا ظہور تھا جس کے اقرار پر ایمان اور اسلام کی بقا کا دارومدار تھا اور اس سے اختلاف کفر کے مترادف تھا۔ اگر ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ملک میں بستے چلے آنے کے باوجود دو الگ الگ قومیں نہیں تو پاکستان کے ہندو، عیسائی، پارسی اور مسلمان ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں[1] اور اگر پاکستان میں آباد تمام مذاہب و مسالک کے لوگ ایک متحدہ قوم "پاکستانی" ہو سکتے ہیں تو ہندوستان میں بسنے والے مختلف مذاہب کے لوگ ایک متحدہ قومیت

---

[1] یہ اشارہ تحریکِ پاکستان کے عظیم رہنما محمد علی جناح مرحوم کے افکار کی جانب ہے۔

"ہندوستانی" کے سانچے میں کیوں نہیں ڈھل سکتے؟ اگر پاکستان مسلمانوں کا ملک تھا اور ہندوستان کو ہندوؤں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، اگر کانگریس ہندو جماعت تھی اور کوئی مسلمان بہ قائمی حواس و بہ سلامتیٔ ایمان اس میں شامل نہیں ہو سکتا تھا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو حکومت کا وفادار رہنے کا مشورہ کیا معنی رکھتا تھا[1]؟ اگر یہ مشورہ درست تھا تو مسلمان دوسرے برادرانِ وطن کے حلیف بن کر برٹش استعمار سے جنگ کیوں نہیں کر سکتے تھے اور ایک جمہوری نظام کے تحت باہم متحد ہو کر ملک اور قوم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ کیوں نہیں لے سکتے تھے اور ان کے ساتھ ایک سماجی زندگی کیوں نہیں گزار سکتے تھے، جیسا کہ صدیوں سے وہ اسی سرزمین میں گزارتے آئے تھے؟

آج کا پاکستانی نوجوان اس امر پر حیرت زدہ ہے:

- جس زبان کے تحفظ کا نعرہ تحریک پاکستان کا محرک بنا تھا اور جسے پاکستان کی قومی زبان بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا، وہ بیالیس سال کے بعد بھی حکومت کے کاروبار میں اپنے عمل و نفاذ اور کارفرمائی سے دور ہے[2]۔
- جس اسلامی تہذیب کے تحفظ اور فروغ و بقا کے تصور نے ذہنوں پر ایک عالم دیوانگی طاری کر دیا تھا، ابھی تک اس تہذیب کی تعریف پر بھی اتفاق نہیں ہو سکا اور
- جس حکومت الٰہیہ کے قیام کے مسلمانوں نے خواب دیکھے تھے یا انھیں سبز باغ دکھائے گئے تھے، کیا وجوہ ہیں کہ وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے یا وہ باغ جن کی سرسبزی و شادابی ذوق و نظر کو طراوت اور تازگی بخشتی تھی، ابھی تک پھولوں اور پھلوں سے محروم کیوں ہیں؟

---

[1] ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت کا وفادار رہنے کا یہ مشورہ مسلم لیگ کے صدر اور تحریک پاکستان کے رہنما محمد علی جناح مرحوم نے دیا تھا۔

[2] یہ بات صرف ہندوستانی سوچتا ہے۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد کا نوجوان حیرت سے اس بات کو سنتا ہے کہ پاکستان کے محرکات میں اردو زبان کا اسلامی اور مشرقی زبان ہونا اور اس کی بقا اور فروغ کا مسئلہ اور اسے قومی زبان بنانے کا وعدہ بھی تھا۔

- ہندو مسلم مسئلے کے حل میں رکاوٹوں کے لیے کس کو الزام دیا جائے جب کہ پاکستان میں مقامی اور غیر مقامی، صوبے اور غیر صوبے والوں کے مسائل ہمارے سامنے سر اٹھائے کھڑے ہیں اور آج تک انھیں جتنا سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے وہ اتنے ہی الجھتے گئے ہیں۔
- اگر ہندو مسلمانوں کے دشمن تھے اور وہ انھیں سرزمین ہند سے نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے تو آج پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ قتل و غارت گری کن اسلامی اصولوں کے مطابق اور کن مقاصدِ حقّہ کے تحت ہو رہی ہے؟
- اگر ہندو اور مسلمان، ہندوستان میں مل جل کر زندگی نہیں گزار سکتے تھے تو پاکستان میں مسلمانوں نے مسلمانوں پر زندگی کیوں حرام کر رکھی ہے؟

صورت حال یہ ہے کہ اگر ہندوؤں سے مسلمانوں کی تمام شکایات کو جمع کر لیا جائے تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتیں جتنی اہل سندھ کو اہل پنجاب سے ہیں۔ بعض مہاجر لیڈروں نے اب ایک مستقل قومیت کا نعرہ بلند کیا ہے۔ انھیں اپنے تئیں "سندھی" کہلانا تو دور کی بات ہے صرف پاکستانی کہلانا بھی گوارا نہیں۔ وہ قائد اعظم کی ہدایت کے برعکس، فرار کی زندگی کے لیے ہجرت کی مقدس اصطلاح استعمال کرنے پر مصر اور پاکستانی کہلانے کے بجائے مہاجر کہلانے پر مصر ہیں اور اسی سے اپنا تشخص اور تعرف چاہتے ہیں، ان کے شکوؤں کی فہرست یوپی، سی پی اور بہار میں ہندوؤں سے مسلمانوں کی شکایات کی فہرست سے زیادہ طویل ہے۔ ان کی زبان سے سندھ اور مرکز میں ایک جماعت کی حکومت کی مہاجر دشمنی اور تعصب کی داستان سنیے تو کئی "پیر پور رپورٹ" اُس کے سامنے ہیچ نظر آئیں گی۔ اسلام کی بے کسی، غربت، اس پر مظالم اور اس کے لیے خطرات کا تذکرہ کسی اسلامی جماعت کے اخبار میں پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں اسلام کے لیے جو خطرات تھے اسلام کی موجودہ بے کسی اور خطرات کے سامنے ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں، بلکہ اگر ہندوستان میں اسلام کسی درجے میں محفوظ تھا تو اب بالکل نہیں رہا۔ پہلے پاکستان کی شمع میں روشنی

کی ایک کرن تھی، اب اس کا مستقبل تاریک ہے اور بنگلہ دیش کے قیام نے یا تو اسلام، قومیت، تہذیب اور اُردو کے اسلامی یا شرعی زبان ہونے کے پچھلے تمام دعوؤں کو جھٹلا رہا ہے یا خطرات میں مزید اضافہ اور اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو برصغیر میں تاریک تر بنا دیا ہے۔

نوجوان سوچتے ہیں کہ کسی لیگی رہنما کے اس بیان میں کتنی صداقت تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان کی اکثریت پر قربان کر دیا گیا[1]۔ اگر اکثریت پر اقلیت کے قربان کر دیے جانے کا اصول درست تھا تو اب یہ اصول غلط تو نہیں ہو سکتا! پھر کیا ہندوستان کی مسلمان اکثریت (۱۶ تا ۲۰ کروڑ) کے مفاد پر پاکستان کی مسلمان اقلیت (۹، ۱۰ کروڑ) کو قربان کر دینا چاہیے؟

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ڈاکٹر سید محمود یا کسی بھی نیشنلسٹ، کانگریسی یا جمعیت علمائی، مسلمان کے خلاف کوئی عام فضا نہیں، اگر مخالفت ہے تو اتنی ہی، جتنی پاکستانی یا غیر پاکستانی کسی شخص کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے۔

اگر حضرت شیخ الاسلام یا امام الہند کے خلاف کوئی چیز کسی اخبار، رسالے یا کتاب میں آجاتی ہے تو اس پر تعجب کیوں ہو! اسی پاکستان میں مسلم لیگ، مسلم لیگ کے رہنماؤں اور مسلم لیگ کی حکومتوں کے رویوں، اخلاق اور کارگزاریوں یا بدخدمتی کے بارے میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا اور چھپا ہوا موجود نہیں، حتیٰ کہ خود بانیِ پاکستان کے خلاف کسی نہ کسی اسلوب میں مختلف سوانحوں، تذکروں، تاریخوں، رپورٹوں، جائزوں وغیرہ میں اتنا کچھ موجود ہے کہ اگر اسے مرتب کر دیا جائے تو ایک نہیں کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں۔ اگر اُن کا احترام کیا جاتا ہے تو بحیثیت "قومی شخصیت"،

---

[1] مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح مرحوم کے بیان کی طرف اشارہ ہے۔

کی حیثیت سے اور کم تر ۱۹۴۷ء سے قبل کے لیگ کے رہنما اور قائداعظم کی حیثیت سے۔

یہ داستان سرائی صرف اس لیے کرنی پڑی کہ بعض حضرات کی یہ غلط فہمی دُور ہو جائے کہ پاکستان میں خدانخواستہ کوئی ایسی عام فضا موجود ہے جس میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نور اللہ مرقدہٗ کا اس وجہ سے نام لینا پسند نہیں کیا جاتا کہ وہ تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ مرحوم چودھری خلیق الزماں کے بہ قول:

> مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کو ہم نے کون سی گالی تھی جو نہیں دی تھی اور ہم نے ان کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا تھا لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے جن لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا تھا اور جن کے بل بوتے پر پاکستان بنایا تھا ہم انھیں اسی ہندو حکومت سے وفاداری نبھانے کا مشورہ دے کر اور بے یارومددگار چھوڑ کر پاکستان بھاگ آئے اور ان مسلمانوں کے زخموں کے لیے مرہم فراہم کیا تو اُسی ابوالکلام اور حسین احمد نے۔

کیا کسی مسلمان کی غیرت گوارا کر سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ایسے ہی خواہوں اور محسنوں کا تذکرہ صرف اس وجہ سے چھوڑ دے کہ اسے سُن کر کسی خاص شخص کی پیشانی پر شکن آ جاتی ہے؟

مولانا سید حسین احمد مدنی ایک مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے شیخ طریقت تھے اور اس حوالے سے لاکھوں مسلمان ان سے عقیدت و ارادت کا رشتہ اور نسبت بیعت رکھتے ہیں اور وہ حضرتؒ کے حالات معلوم کرنے اور پڑھنے کے خواہاں رہتے ہیں، وہ اپنے عہد کے ایک عظیم محدث اور صاحبِ درس و تدریس تھے۔ دنیا بھر میں ہزاروں علمائے دین ان سے براہ راست

استفادہ کرنے والے موجود ہیں، اور ان حضرات کے واسطے سے تو لاکھوں طالبانِ حدیث اور اہل علم ان سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں، وہ حضرتؒ کے حالات زندگی کو جاننے کے شائق پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک قرن سے زیادہ عرصے تک ہندوستان میں ایشیا کی ایک بہت بڑی انقلابی، سیاسی، مذہبی جماعت ــــ جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے قومی اور ملی سیاسیات میں سرگرم حصہ لیا اور تقریباً سترہ برس (۱۹۴۰ء تا وفات دسمبر ۱۹۵۷ء) تک اس کی مسند صدارت پر فائز رہے اور جماعتی، قومی اور ملکی سیاست تا بین الاقوامی سیاست میں حصہ لیتے رہے تھے اور جن کے وجودِ گرامی سے برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی میں ایک نئے عنوان کا اضافہ ہوا تھا اس لیے تاریخ ہند اور ملکی اور عالمی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کے سیاسی کارناموں اور انقلابی سرگرمیوں کو جاننا چاہتے ہیں۔ مطالعے کے ان تمام پہلوؤں کی دلکشی پر مستزاد حضرت کی ذاتی زندگی اور سیرت کے خصائص ہیں جن کا حسن اور دل آویزی شائقینِ مطالعہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام سے عقیدت و ارادت رکھنے والوں کا کسی ایک مذہب اور مکتبہ فکر سے تعلق نہیں بلکہ مسلمانوں سے لے کر غیر مسلموں تک یہ سلسلہ دراز ہے۔ مذہبی جماعتوں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تمام لوگ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے متعلق لٹریچر کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

موجودہ زمانے کی مصروف زندگی میں مطالعے کی سہولت کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی مختلف الجہات اور جامع حیثیات شخصیت پر بہت ضخیم تالیفات کے بجائے ان کی ایک ایک جہت اور الگ الگ حیثیت پر ایسے رسالے اور کتابیں مرتب کی جائیں جنھیں شائقین اپنے ذوق کے مطابق اپنی مصروف زندگی میں تھوڑا وقت نکال کر ہفتے عشرے میں پڑھ ڈالیں۔ جو اپنی ضخامت میں اوسط حد سے نہ بڑھیں اور جن کی

قیمت میں اس مہنگائی کے زمانے میں جیب کی گران باری کا خیال رکھا جائے۔ اور اگر کسی شخصیت کی سیرت اور اس کے کارناموں میں دعوت و ارشاد اور تعلیم و تبلیغ کا پہلو ہو، جس کی زندگی کے مطالعے سے اصلاحِ احوال، تعمیرِ حیات اور تشکیلِ سیرت کا کام لیا جا سکتا ہو، جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کی زندگی اور سیرت میں بہ خوبی بہ درجۂ اتم موجود ہے تو ضروری ہے کہ جو کتابیں مرتب اور تالیف کی جائیں ان کی اشاعت کا خاص اہتمام اور توسیع مطالعہ کی ایک عام تحریک پیدا کر دی جائے تاکہ سوانح، سیرت اور افکارِ حقہ کا فیضان عام ہو سکے۔

حضرت شیخ الاسلام کی زندگی کے سیاسی پہلو پر اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہی ہے۔ اس کی تالیف میں یہ بات پیش نظر رہی ہے:

۱۔ حضرت شیخ الاسلام کے سیاسی افکار اور کردار کے بارے میں جو بعض غلط فہمیاں کسی وجہ سے پھیل گئی ہیں، وہ رفع ہوں۔

۲۔ حضرت شیخ الاسلام کے سیاسی افکار اور ملک کی آزادی کی تحریک میں آپ کے ایثار و خدمات کے نقوش کو واضح کیا جائے۔

۳۔ حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کے آئینے میں ملک کی آزادی کی اہمیت کو واضح کیا جائے اور آزادی کے فوائد کے حصول میں رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔

۴۔ حضرت شیخ الاسلام، حضرت کی جماعت اور تمام مجاہدینِ آزادی کے کارناموں، ایثار اور قربانیوں کو ایسے محکم دلائل اور ناقابلِ تردید شواہد کے ساتھ تواتر سے پیش کیا جاتا رہے کہ اگر ملک اور بیرونِ ملک کے مورخین اور اسکالرز کی کوئی جماعت کسی وجہ سے ملک کی آزادی کی تحریک میں ان کے حصے اور ان کے ایثار اور قربانیوں سے صرفِ نظر کرنا چاہے تو وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکے۔

۵۔ نوجوان سیاسی کارکنوں کے ذہن اور قلب پر یہ چیز نقش کر دی جائے کہ سیاسی جدوجہد میں محمد علی جناح بن کر ہی نہیں حسین احمد مدنی بن کر بھی حصہ لیا جا سکتا ہے۔

۶۔ یہ بات ہر کہہ ومہ پر واضح کر دی جائے کہ ملک کی سیاسی، معاشی، اقتصادی ترقی و استحکام میں مذہب مانع نہیں، اور مذہب کو حکومت کا آلۂ کار بنائے بغیر مذہب کی اشاعت و تبلیغ کی آزادی کا حق محفوظ کر لینے کے بعد ایک عام جمہوری اور سیکولر نظام حکومت میں شریک ہو کر عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لیا جا سکتا ہے[1]

۷۔ حضرت شیخ الاسلام سے نسبت رکھنے والے جمعیت علمائے ہند اور جمعیت علمائے اسلام کے سیاسی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی ضروری تھا کہ ایک مناسب ضخامت کی کتاب مرتب کر دی جائے، جسے وہ بہ آسانی حاصل کر سکیں اور اس کے مطالعے سے یہ معلوم کر سکیں کہ برصغیر کی آزادی اور آزادی کی جس تحریک کے نتیجے میں پاکستان کا نقش ظہور پذیر ہوا ہے اس کے عمل میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے ان کے ایک بزرگ نے کتنی عظیم الشان قربانیاں دی ہیں اور اس پوری تحریک آزادی میں ان کے ایثار کا پیمانہ کس درجے بلند اور اس کا دامن سیرت کیسا بے داغ رہا ہے۔

۸۔ ضرورت تھی کہ ہم اپنے ان بزرگ کی سیرت اور حقیقت پسندی کے اس پہلو کو اجاگر کریں کہ جب تک ملک کی آزادی کی کسی خاص شکل کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اور قوم کسی فیصلے تک نہیں پہنچی تھی تو انھوں نے اپنی بصیرت کی روشنی، تاریخی مطالعے اور تجربے کی رہنمائی میں پوری شدت کے ساتھ اپنی اس رائے کا اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کا حل ملک کی تقسیم میں

---

[1] واضح رہے کہ ہندوستان کے دستور میں سیکولرازم کا تصور بالکل مختلف معنی میں نمایاں ہوا ہے۔ اس میں مذہب کی نفی نہیں اثبات کیا گیا ہے۔ اس میں تمام مذاہب کو ان کے اعمال و روایات کے ساتھ تحفظ دیا گیا ہے۔ اور اصلاح و ارشاد اور تبلیغ کے تمام کاموں کی آزادی دی گئی ہے۔ جب کہ روس وغیرہ میں سیکولرازم کی بنیاد مذہب کی نفی پر ہے۔

نہیں، اتحاد، جمہوریت اور غیر فرقہ وارانہ نظام حکومت کے قیام میں ہے جیسا کہ بعد کی تاریخ نے ان کی رائے کی اصابت کو ثابت کر دیا، لیکن ۳ جون ۱۹۴۷ء کے تصفیہ و اعلان کے بعد انھوں نے تاریخ کے اس فیصلے کو قبول کر لیا کہ اب ملک کی قسمت میں تقسیم کا عمل لکھ دیا گیا ہے اور اب ہمیں اس فیصلے کو تسلیم کر کے مستقبل کی فکر میں لگ جانا چاہیے۔

۹۔ بعض حضرات یہ توقع رکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام اور ان کی جمعیت علمائے ہند کو مسلم لیگ اور اس کی لیڈر شپ کا ساتھ دینا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت اس کے ساتھ تھی، ضروری تھا کہ انھیں بتایا جائے کہ اگر سیاسی معاملات میں فیصلے کا یہ کوئی معقول طریقہ ہے تو یہی توقع ان سے کی جا سکتی تھی کہ مسلم لیگ اور اس کی لیڈر شپ کو حضرت شیخ الاسلام اور ان کی جمعیت کی رہنمائی پر اعتماد کر لینا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ علم و بصیرت کی روشنی ان کے ساتھ تھی۔

۱۰۔ سیاست ایک نہایت سنجیدہ غور و فکر اور تدبر و بصیرت پر مبنی خاص گرد و پیش میں زندگی کے عمل اور ترقی کو آگے بڑھانے کے فیصلوں کا نام ہے۔ کسی قومی اور انقلابی سیاسی جماعت کے فیصلوں پہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی جماعت کے گروہی اور طبقاتی مفادات کے تحفظ اور ردعمل کے اظہار اور اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے حفظ و بقا کے راگ الاپنے کا نام نہیں۔ ضرورت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام جیسی سیرتوں کے مطالعے سے سیاسی اور غیر سیاسی طرز فکر و عمل کے فرق کو نوجوانوں، خصوصاً سیاسی کارکنوں اور قومی خدمت گذاروں کے ذہن پر اس درجے ممیز کر دیا جائے کہ وہ کبھی کسی کانگریس، لیگ یا جماعت کے سطحی اور جذباتی نعروں، پُر پیچ خیالات اور منطق و فلسفہ کے سحر سے متاثر نہ ہوں اور سیاسی اغراض و جماعتی مفادات اور حزبی مقاصد کے لیے کسی مذہب یا کسی کتاب کے مقدس نام کے استعمال کے فریب کا شکار نہ ہوں۔ وہ اپنے کیریکٹر اور سیرت میں حضرت شیخ الاسلام

کے صحیح جانشیں بن سکیں، اور سیاست کو سیاست کے لیے مخصوص رکھیں۔ نہ مذہب کے نام کو گروہی اور جماعتی مفاد کے تحفظ کے لیے استعمال ہونے دیں اور نہ کسی سیاسی فیصلے سے مذہب کے مقدس نام پر حرف آنے دیں۔

اس ایڈیشن میں آپ کو نہ صرف بعض مضامین کی ترتیب بدلی ہوئی اور تبویب کا اہتمام نظر آئے گا بلکہ آپ دیکھیں گے کہ اس میں پروفیسر خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر سید عبدالباری اور وشوا ناتھ طاؤس کے معلومات افزا اور فکر انگیز مضامین کا اضافہ بھی ہے۔

آخر میں "نوادر علمیہ و سیاسیہ" کے عنوان سے ایک مستقل باب کا اضافہ کیا گیا۔ اس میں حضرت شیخ الاسلام کے بے شمار نوادر علمیہ و سیاسیہ سے صرف تین خطوط لیے گئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے حضرت کے حقیقت پسندانہ رویے، صحیح انداز فکر تاریخ سیاست ملی میں رسوخ اور سیاسی بصیرت اور فراست کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کا یہ ایڈیشن تاریخی و سیاسی مطالعے، تعلیم و تشکیل سیرت، تہذیب ذوق و فکر، سیاسی تربیت اور مذہبی زندگی میں رسوخ و اعتماد کے ان مقاصد کا بہ ہمہ وجوہ پورا کرے گا۔

ابو سلمان شاہجہان پوری
۷ر جنوری ۱۹۹۰ء

باب اوّل

شخصیّت و سیرت

ہندوستان کی غلامی اور مسلمانوں کا فرض

حضرت کے نزدیک جہاد آزادی ہند وہ معرکہ تھا جس کی راہ میں سر دینے والا شہید اور سر لینے والا غازی کے مناصب عالیہ کا مستحق تھا۔ اس کے لیے حضرت یہ دلیل دیتے تھے:

" (ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اگر مسلمان) کی جان بھی کام آجائے تو وہ سراسر سعادت اور نص حدیث کے بموجب شہادت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون اهله فهو شهيد او كما قال (ترمذی)

یعنی جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے خون کی یا دین کی یا اہل وعیال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔ (ترمذی)

سارے ہی ہندو مسلمان لیڈران اور عوام ہندوستان کی آزادی کے لیے کمربستہ وسربکف تھے۔ حضرت بھی اس رزم گاہ میں مردانہ وار صف آرا تھے۔ مگر آپ کی نیت بھی الگ تھی اور منزل بھی دوسروں سے جدا تھی۔ یہ بالکل الگ بات تھی کہ دونوں کی راہیں ایک تھیں۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے حضرت کے ان الفاظ پر غور کریں:

" چونکہ برٹش گورنمنٹ کے جملہ لاف وگزاف نخوت وسطوت، تعاظم وتکبر، قوت ودبدبہ وغیرہ کا بڑا مدار ہندوستان کا غلام ہونا ہے۔ اس لیے اس باعث نخوت وتکبر کو توڑ دینا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہوگا اور یہی اعلیٰ درجہ کی جنگ اس گورنمنٹ کے ساتھ ہوگی۔ یہی بات اس کے گھٹنے لگا دے گی ہندوستان کی مکمل آزادی اور اس کا سوراج انگلستان کی موت کا مرادف ہے۔

(خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء کوکناڈا)

شیخ العرب والعجم:
خصائص سیرت پر ایک نظر،

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

علم وعمل کی دنیا میں عظیم الشان شخصیات کے ناموں کے ساتھ مختلف خصائص وکمالات، کی تصویریں ذہن کے پردے پر نمایاں ہوتی ہیں، لیکن شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کا نام زبان پر آتا ہے تو ایک کامل درجے کی اسلامی زندگی اپنے ذہن وفکر، علم وعمل اور اخلاق وسیرت کے تمام خصائص وکمالات اور محاسن ومحامد کے ساتھ تصوریں ابھرتی اور ذہن کے پردوں پر نقش ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اسلامی زندگی کیا ہوتی ہے؟ تو میں پورے یقین اور قلب کے کامل اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسین احمد مدنی رح کی زندگی کو دیکھ لیجیے۔ اگرچہ یہ ایک قطعی اور آخری جواب ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس جواب کو علمی جواب، تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اُن حضرات کا قلب اس جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتا، جنھوں نے اپنی دور افتادگی وعدم مطالعہ کی وجہ سے یا قریب ہو کر بھی اپنی غفلت کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ کسی خاص ذوق ومسلک کے شغف وانہماک، یا بعض تعصبات نے ان کی نظروں کے آگے پردے ڈال دیے تھے اور وہ حسین احمد کے فکر کی رفعتوں، سیرت کی دل ربائیوں اور علم وعمل کی جامعیتِ کبریٰ کو محسوس نہ کر سکے تھے اور ان کے مقام کی بلندیوں کا اندازہ نہ لگا سکے تھے۔ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے فکر اور سیرت کے بعض خصائص کی طرف قارئینِ کرام کو توجہ دلاؤں۔

جامعیتِ علوم وفنون:

حضرت شیخ الاسلام ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ اپنے دور کے بے مثال محدث تھے۔ درس وتدریس اور تحقیقِ حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ تدریسِ حدیث میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا جس نے انھیں اقران وامثال میں امتیاز بخشا تھا۔ وہ بہت بڑے فقیہ تھے اور انھیں نہ صرف فقہ کے مسائل ازبر تھے بلکہ فقہ وحدیث میں ان کا درجہ ایک محقق اور مجتہد کا تھا۔ وہ مفسر بھی تھے اور نہ صرف حروف وسواد کی رہنمائی میں بلکہ معانی کی گہرائی میں اتر کر قرآن کے بصائر وحکم اور مسائل واحکام کی تشریح وتفسیر فرماتے تھے۔ وہ ایک زاہد شب زندہ دار بزرگ اور اپنے وقت کے ایک عظیم الشان شیخ طریقت تھے۔ انھیں انسان کے امراضِ نفس وقلب کا پتا چلانے میں حذاقت کا کمال حاصل تھا۔ معالجۂ نفس وطبائع اور اصلاح وتزکیہ میں انھیں یدِطولیٰ ملا تھا۔ تاریخ عالم میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تاریخِ معاشیاتِ ہند کے وہ ایک عظیم اسکالر تھے۔ بحر سیاسیاتِ ہند و انقلاباتِ عالم اسلامی کے وہ بے مثل شناور تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے اور افکار کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دینے اور اندازِ فکر بدل دینے والے اپنے عہد کے بے مثال خطیب بھی تھے۔ جنگ آزادی میں انھوں نے اپنے جسم وجان اور وقت ومال کی بے مثال قربانیاں دی ہیں۔ وہ ایک صاحبِ عزیمت شخص تھے۔ ان کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آئے تھے، جب وہ رخصت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ان کی بلند ہمتی نے رخصت کی پناہ گاہوں کی پستیوں اور ذلتوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ عزائم وقت میں ان کے ذوقِ فکر وعمل کا پایہ ہمیشہ بلند رہا۔ ذوقِ میزبانی سے انھیں حصۂ وافر ملا تھا۔ وہ اپنے دور کے علما وامرا اور صوفیہ ومشائخ میں سب سے بڑے مہمان نواز تھے۔ عرب کے حسنِ طبیعت اور عجم کے سوز دروں سے ان کی طبیعت کا خمیر اٹھا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ تمام وہ کمالات ہیں جو حضرت کی صحبت وقربت رکھنے والا ہر شخص محسوس ومعلوم کر لیتا تھا۔ اور آج بھی حضرت کی زندگی کے مطالعے سے بہ آسانی ان

خصائص وکمالات کا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے، لیکن میں حضرت کے بعض ان کمالات کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا جن کے وزن وقدر کے اندازے کے لیے علم وسائنس کی اس ترقی یافتہ دنیا میں ابھی تک کوئی میزان اور پیمانہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔

اخلاص :

حضرت شیخ الاسلام کے ان کمالات میں سے جو دیکھے اور دکھائے نہیں جا سکتے۔ البتہ کوئی شخص بے میل ذوق، متوازن ذہن اور قلب سلیم کی نعمتوں سے نوازا گیا ہو تو وہ حضرت کے ان خصائص وکمالات کو محسوس کر سکتا ہے۔

حضرت کی سیرت کا پہلا عنصر "حسن اخلاص" ہے۔ لیکن اخلاص کیا ہے؟ اخلاص ایک "جوہر سیرت ہے"۔ اس کا بیج قلب کی سرزمین میں پھوٹتا ہے، برگ وبار پیدا کرتا ہے اور اس کی سرمدی مہک سے مشامِ روح معطر ہو جاتا ہے۔ اس جوہر سیرت کو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے لیکن ذوقِ بے میل اور قلب سلیم ہو تو اسے خوشبو کی طرح محسوس ضرور کر لیا جا سکتا ہے۔

جوہرِ اخلاص داد وتحسین سے بے نیاز اور ستایش کی تمنا سے بے پروا ہوتا ہے۔ اخلاص چاہتا ہے کہ صلہ وثواب کی آرزو سے قلب کو پاک کر لیا جائے۔ حسنِ اخلاص عشق کے مدعی سے مطالبہ کرتا ہے کہ میری محبت کا دم بھرتے ہو اور میرے قرب وصال کے طالب ہو تو پہلے اپنی ذات کے تمام اغراض سے دست بردار ہو جاؤ اور دنیاوی عیش وراحت کی ہر خواہش کو اپنے دل سے نکال پھینکو۔ غیرتِ اخلاص انسانی سیرت کی کسی کوتاہی کو برداشت کرے خواہ نہ کرے، لیکن اس کی پاکیزہ سرشت ذوقِ ما ومن کو ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کر سکتی۔ اخلاص اور لوث وغرض کبھی ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔ صاحبِ غرض کبھی صاحبِ اخلاص نہیں ہو سکتا، جو بے غرض ہوتا ہے وہی صاحبِ اخلاص ہوتا ہے اور جو بے غرض ہوتا ہے وہ بے پناہ ہوتا ہے اور اُسے بہ قول ایک عارف کے "تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔"

حضرت شیخ الاسلام بے غرض تھے۔ قوم و ملت کی خدمت کو شعار بنایا اور تحریک آزادی کی راہ میں قدم رکھا تو پہلے اپنے قلب کو غرض سے پاک کر لیا تاکہ کوئی تلوار انھیں کاٹ نہ سکے۔ حیدر آباد (دکن) کے وظیفے کی رشوت ہو یا کسی سرکاری مدرسے (مثلاً مدرسہ عالیہ کلکتہ) کی پرنسپل شپ کی پیش کش ہو یا جامعہ ازہر (مصر) کے منصب بلند کا لالچ ہو۔ حالات کی سنگینی کا خوف ہو یا خاندان کے مستقبل کا اندیشہ، انھوں نے ہر خوف و حزن سے اپنے قلب کو پاک کر لیا تھا۔ اگر انھوں نے دارالعلوم میں کوئی مقام حاصل کیا تھا یا جمعیت علمائے ہند کی صدارت کو قبول کر لیا تھا تو صرف کسی کو آگے بڑھتے اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے نہ دیکھ کر، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا میدان خالی پاکر اور غلام ملک میں استعمار و استبداد کے عذاب سے سسکتی انسانیت کو نجات دلانے کے لیے صرف اپنے اسلامی اور انسانی فرض کی ادائیگی کے لیے قدم آگے بڑھایا تھا۔ اگرچہ حضرت کا "اخلاص" تیس سال سے زیادہ عرصے تک آزمایش کی کسوٹی پر بار بار پرکھا جاتا رہا تھا، اور آپ کے اخلاص کا سونا ہر دفعہ زرِ خالص ثابت ہو چکا تھا، لیکن ابھی آزمایش کا ایک مرحلہ باقی تھا۔ یہ مرحلہ ملک کی آزادی کے بعد اس وقت پیش آیا، جب حضرت کی خدمت میں ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز "پدم بھوشن" پیش کیا گیا۔ اگر ہندوستان میں چند حضرات اس کے مستحق تھے تو حضرت اس اعزاز کا سب سے زیادہ استحقاق رکھتے تھے۔ یہ حضرت کی عظیم الشان قومی خدمات کا صلہ نہیں، اعتراف تھا۔ یہ اعزاز حکومت یا انتظامیہ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ قوم کی جانب سے ملک کو آزادی اور قوم کو غلامی و استبداد کے عذاب سے نجات دلانے میں ان کی خدمات کے لیے اظہار تشکر تھا۔ اس کو قبول کر لینے کے جواز میں، ایک سو ایک دلیلیں پیش کی جا سکتی تھیں اور آج بھی کہ ملک کی آزادی کو ایک دہائی کے بعد نصف صدی پوری ہو جائے گی اور ایک قرن آپ کی وفاتِ حسرت آیات پر بھی گزر چکا ہے، اس اعزاز کے لیے آپ کے استحقاق اور جواز کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قوم کی اس پیش کشِ اعزاز کا کیا جواب دیا تھا؟ کیا یہی جواب نہ تھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اسلام کے لیے ایک شرعی

حکم اور ملکی فرض کی ادائیگی کے لیے تھا۔ صلہ و ستایش کی آرزو، اعترافِ خدمات کے جذبے اور کسی اعزاز و منزلت کے لیے نہ تھا۔

استقامت:

حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کی ایک خوبی وہ ہے جسے ہم استقامت سے موسوم کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک شخص اپنے معتقدات و افکار میں نہایت مخلص ہو سکتا ہے لیکن اخلاص کے لیے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اس میں استقامت بھی ہو، یہ بات بالکل اسی طرح ہوتی ہے کہ جس طرح ایک صاحبِ استقامت کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ راہِ حق و صواب پر بھی ہو، اور اپنے اعتقاد میں مخلص اور صاحبِ استقامت بھی ہو۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے فکر میں مخلص ہوتا ہے لیکن وہ راہِ حق و حریت کے شدائد و مصائب کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر آپ چاہیں تو رہروانِ جادۂ حق و حریت کو ان کے ذوقِ فکر و عمل کے لحاظ سے اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ وہ حضرات جو فکر صحیح رکھتے ہیں یعنی حق پسند ہوتے ہیں لیکن راہِ عمل وسعی کے شدائد اور اعلانِ حق کے نتائج سے اس درجہ خوف زدہ ہوتے ہیں کہ لساناً حق کا اعتراف و اعلان نہیں کر سکتے۔

۲۔ وہ حضرات جو فکر صحیح بھی رکھتے ہیں اور لساناً حق کا اعتراف و اعلان بھی کر دیتے ہیں لیکن آزمایش کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور

۳۔ وہ حضرات جو حق شناس بھی ہوتے ہیں، اعلان و اظہارِ حق سے بھی ان کی زبانیں بند نہیں رہتیں اور جب اس راہ کی مشکلات پیش آتی ہیں، انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے پھانسی کے تختے لگا دیے جاتے ہیں، آزمایش کی صلیبیں کھڑی کر دی جاتی ہیں اور تعذیر و تعذیب کے لیے زندانوں اور کالی کوٹھریوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ پھر انھیں متاثر کرنے کے لیے ان کے سامنے سے انعام یافتہ انسان نما حیوانوں کی قطاریں گزاری جاتی ہیں۔ پھر ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ بتاؤ حالات و وقت میں سچائی کا راستہ کون سا ہے؟ لیکن وہ نہ تو کسی چیز سے متاثر

ہوتے ہیں، نہ کسی بات سے خوف زدہ ہوتے ہیں، اور نہ کسی عمل سحر سے دھوکا کھاتے ہیں۔ ان کا جواب ایک ہی ہوتا ہے کہ تو اپنی طاقت وقوت سے دھوکا نہ کھا، اقتدار کا گھمنڈ نہ کر، انسانوں پر ظلم سے باز اور باطل اور غلامی کے مقابلے میں حق و آزادی کے انتخاب کا حق ان سے نہ چھین

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ رہروانِ جادہ حق و حریت کی اس آخری جماعت کے رہنما تھے۔

آپ جانتے ہیں کہ کسی طاقت کی طرف سے کسی عہدہ و منصب کی پیش کش سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کا نام ہے۔ اقتدار کے راستے سے کسی کو ہٹانے کی کوشش کا یہ پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انھیں ٹیڑھا کر لیا جائے اور اگر پہلے مرحلے میں کامیابی نہ ہو تو قید و بند اور تعزیر و تعذیب کے دوسرے مرحلے کا آغاز کر دیا جائے۔ حضرت شیخ الاسلام کی پوری زندگی تاریخ کی روشنی میں دنیا کے سامنے ہے۔ جسے دیکھنے کے لیے کسی باطنی بصیرت کی ضرورت نہیں، ظاہری آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے کہ قید و بند اور تعزیر و تعذیب کے ہر مرحلے میں آپ کی استقامت غیر متزلزل رہی۔ جس طرح حکومت کی کوئی پر فریب پیش کش آپ کے اخلاص کو متزلزل نہ کر سکی تھی، اسی طرح تعزیر و تعذیب کا خوف آپ کے پائے ثبات کو اس کی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

آپ میں سے بعض حضرات شاید اس بات میں شک کریں کہ ایک دور میں ایک جماعت کی طرف سے حضرت کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا گیا تھا، اسے ملک کے خان بہادروں، نوابوں، جاگیرداروں کی سرپرستی اور حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ لیکن اس بات کو تو بہرحال آپ تسلیم فرمائیں گے کہ کسی صاحب اخلاص و دیانت کا دنیا بھر کو راضی رکھنا اور خوش کرنا ممکن نہیں۔ یہ ممکن ہے ایک بڑی جماعت کو وہ اپنے اخلاص و دیانت کا گرویدہ بنالے لیکن افراد کی ایک چھوٹی سی چھوٹی جماعت اس کی مخالف ضرور رہ جائے گی، ہم تسلیم کرتے

ہیں کہ افراد کی اس چھوٹی سی جمعیت کا تعلق اس "خاص جماعت" کے نظام فکر سے نہ تھا جس کے وہ واقعی رکن یا کارکن تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اختلاف و ناراضگی کی صورت میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے تھا، آپ اس سوال کا جواب دینے کی زحمت نہ اٹھائیے، لیکن یہ ضرور سوچیے کہ مخالفت اور توہین و تضحیک کے اس طوفانِ بے تمیزی میں حضرت شیخ الاسلام کی استقامت کا کیا عالم رہا؟

خواہ آپ زبان سے اس کا اقرار نہ کریں لیکن آپ کا دل گواہی دے گا کہ آزمائش کے اس مرحلے میں بھی جو حکومت کی طرف سے قید و بند اور تعزیر و تعذیب کی صورت میں پیش آیا ہو، خواہ کسی جماعت کے کارکنوں کی طرف سے غیر شریفانہ مخالفت اور تضحیک و توہین کی صورت میں نمایاں ہوا ہو، حضرت شیخ الاسلام کا اخلاص بے عیب اور استقامت بے داغ ثابت ہوتی ہے۔

جامع مذہب و سیاست:

حضرت شیخ الاسلام کی ایک خوبی علم و عمل، دین و سیاست، تصور و حقیقت، روز و شب کے معمولات اور ملی قومی تقاضوں، واجباتِ دنیا و فکرِ آخرت کا حسن امتزاج و توازن اور کمال جامعیت ہے۔

ہماری تاریخ بڑے بڑے اصحاب علم سے، عظیم مدبروں اور مفکروں سے، نہایت ذہین افراد سے، ملک و قوم کے بڑے بڑے خدمت گزاروں، نہایت دین داروں، شریف دنیا پرستوں سے، عدیم المثال شاعروں سے، سراپا عمل مجاہدوں سے، شب زندہ دار زاہدوں اور عابدوں سے اور اپنے علم و عمل سے یا اپنے ذہن کی فکر پیمائیوں اور تخیل آفرینیوں سے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہی لیکن حضرت شیخ الاسلام کے توازن و جامعیت کی شخصیت کی دید کے لیے چشم نرگس کو صدیوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام علم و عمل کی جامعیت کی مثال تھے۔ وہ عالم تھے مگر فکر و فلسفہ کی گتھیاں

ہی نہ سلجھاتے رہے، عملی زندگی کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ زندگی کے میدان میں ان کی شخصیت سراپا عمل نظر آتی ہے۔ لیکن علم و فکر کی دنیا سے ان کا رشتہ اس وقت بھی قائم ہوتا تھا۔ دین کے واجبات اور سیاست کے فرائض میں ایک ایسا حسین توازن پیدا کیا تھا کہ خالص سیاسی ہنگاموں اور ہجوم افکار و اعمال میں بھی فرائض و سنن تو کیا مستحبات بھی نہ چھوٹتے تھے۔ آپ کی ذات گرامی تصور و حقیقت کا مجمع البحرین تھی۔ روز و شب کے معمولات میں "فی اللیل رھبان وفی النہار فرسان" کی مثال تھے۔ حضرت دین و سیاست کی تفریق کے قائل نہ تھے لیکن آپ کے متوازن فکر اور جامع سیرت کا کمال یہ تھا کہ قوم اور ملت کا ہر تقاضا اور ہر کام اپنے وقت پر اور اپنے دائرے میں صحیح طور پر انجام پاتا

وہ انسان جو اپنا جی جان اور خاندان کنبہ رکھتا ہے، ان کے واجبات اور ذمہ داریوں سے کیوں کر چھٹکارا پا سکتا ہے بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی زندگی کی ضروریات و احتیاجات بعض اوقات انسان کو فکر آخرت سے غافل بھی کر دیتی ہیں لیکن ٹھیک اسی طرح آخرت کی فکر اور عبادت و ریاضت کا ذوق و انہماک بھی دنیادی واجبات و فرائض میں غفلت اور کوتاہی کا موجب ہوتا ہے۔ جام شریعت اور سندان عشق سے کھیلنا اور دونوں کے حدود برقرار رکھنا، ہر مدعیِ اتباعِ شریعت اور حقوق عباد و دنیا کے فہم و ادراک کا ذوق رکھنے والے کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام کے لیے جام و سندان کا یہ ملاپ محض ایک کھیل تھا۔ حضرت کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک کامل درجے کی دینی و اسلامی زندگی اور اس کے تمام ظاہری و باطنی لوازم کے ساتھ سیاست کے بحر متواج میں تختہ بندی کا عزم لے کر اترے تھے اور اس کے پانی کی ایک چھینٹ سے اسلامی شرعی زندگی کو آلودہ اور دامن تر کیے بغیر وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔

فیضانِ سیرت کا ایک خاص پہلو :

اب میں حضرت شیخ الاسلام کے فیضانِ سیرت کے ایک خاص پہلو کی طرف آپ کی

توجہ دلانا چاہتا ہوں:

آپ جانتے ہیں کہ کسی خاص کمیونٹی کے مفادات کی بات کرنا، اس میں مذہبی عصبیت پیدا کرنا، اس کے افراد کو منظم کرنا، انھیں خاص انداز سے تعلیم دینا، ان کی تربیت کرنا اور اس کمیونٹی کے سامنے ایک نصب العین رکھنا اور اگر پہلے سے کوئی نصب العین ہو جو فراموش کر دیا گیا ہو تو اسے یاد دلانا اور اس کے لیے جان و مال کی قربانی اور وقت کے ایثار کی دعوت دینا اور اسی ذریعے کو اس کی ہر طرح کی کامیابی کا ضامن قرار دینا عام طور پر "فرقہ داریت" کہلاتا ہے اور کسی سوسائٹی میں فرقہ داریت کی زہرناکی اور سمیت اس کی زندگی، اس کی جمعیت اور امن و سکون کے لیے تباہی اور ہلاکت کا جو سر و سامان اپنے اندر رکھتی ہے، اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کی زندگی آپ کے سامنے ہے، اس کا یہ پہلو چھپا ہوا نہیں کہ حضرت نے مسلمانوں کے ملی اور فرقہ وارانہ مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ مسلمانوں میں مذہبی عصبیت پیدا کی۔ ان میں اسلامی زندگی پیدا کرنے کی تلقین کی۔ رضائے الٰہی اور اتباع سنت کو زندگی کا نصب العین بنانے اور اسلامی فکر و بصیرت کو اپنانے کی دعوت دی اور اسلام اور صرف اسلام کے لیے جان و مال اور وقت کے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کے زندگی بھر داعی رہے۔ جمعیت کے نظام کو مستحکم کرنے یعنی مسلمانوں کی بہترین خدمات انجام دینے کے لیے رضاکاروں کے ایک مستحکم نظام کی ضرورت کو محسوس کیا اور ملت کے جاں نثاروں کا ایک نظم قائم بھی کر دیا اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت خود بھی ایک کامل درجے کی دینی اور شرعی زندگی رکھتے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے ذبیحۂ گاؤ کے لیے ہمیشہ اصرار کیا، نہرو رپورٹ کی مخالفت کی، بندے ماترم کے خلاف احتجاج کیا۔ واردھا تعلیمی اسکیم کو رد کرتے ہوئے ایک متبادل تعلیمی اسکیم پیش کی۔ سی پی گورنمنٹ کی ودیا مندر اسکیم کو جوں کا توں قبول کرنے سے صاف انکار کیا۔ کشمیر اور دوسری ریاستوں میں مسلم حقوق کی پامالی کے خلاف نہ صرف جمعیت کے پلیٹ فارم سے احتجاج کیا، اخبارات میں مضامین لکھوائے اور عملی میدان میں حصہ لیا۔ گاندھی جی کے پرارتھنا کے گیت کو مسلمانوں کے عقیدے کے بالکل خلاف، مسلمانوں کے

بے قطعاً ناقابل قبول بتایا اور اسے صرف گاندھی جی کا فعل قرار دیا۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران میں کانگریسی حکومتوں کے کردار اور فیصلوں کے خلاف سب سے زیادہ لیکن سنجیدہ، مدلل اور مثبت تنقید کے محاذ کے رہنما حضرت شیخ الاسلام تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت اور حضرت کی سیرت کا یہ فیضان بھی ملک کے سامنے ہے کہ اس سے فرقہ واریت پیدا نہیں ہوئی جو انسانی سوسائٹی کے لیے تباہی اور ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ایک مذہبی شخصیت ہونے کے باوجود ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح کے قومی رہنما تھے حالانکہ تاریخ میں ایسے قومی رہنماؤں اور سیرتوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جو اگرچہ قطعاً مذہبی نہ تھیں اور بہ قول مولانا غلام رسول مہرؔ مسلمان بھی تھے لیکن سورۃ اخلاص بھی صحت کے ساتھ نہ پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ان کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل نے انسانی سوسائٹی اور ملک کی معاشرتی زندگی میں مذہبی تعصب اور منافرت کا جو زہر گھولا تھا، وہ چالیس سال سے زیادہ عرصے میں بھی دور نہ ہو سکا۔ اور فرقہ واریت کا جو سبق ایک خاص قومی سطح پر حالات سے نمٹنے کے لیے پڑھایا گیا تھا، اس کے اثرات نے معاشرتی زندگی کو تہ و بالا اور باہمی اعتماد و محبت کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔

جو بات کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ ایک شخص نے پڑوسی کو ڈرانے کے لیے (تعصب کا) ایک کتا پالا تھا۔ بھونکنا اور کاٹنا کتے کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد مالک نے ضرورت نہ سمجھتے ہوئے کتے کو آزاد کر دیا۔ اب وہ کتا دوسروں ہی کو نہیں اپنے سابق مالک کے خاندان کو بھی بھنبھوڑ رہا ہے۔ پورا خاندان خوف زدہ ہے۔ خاندان کا اطمینان وسکون تباہ ہو گیا ہے۔ اب مالک دوبارہ اس کے گلے میں پٹا ڈالنا اور اسے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک عذاب الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس کے ظلموں اور ظلموں سے باز آجانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت دیتا ہے، اور سنت الٰہی انتظار کرتی ہے کہ نزول عذاب سے پہلے وہ قوم اپنی بداعمالیوں سے باز آجائے، لیکن جب اس کی مہلت ختم ہو جاتی ہے اور عذاب کا نزول شروع ہو جاتا ہے تو پھر سنت

الٰہی پوری ہو کر رہتی ہے اور قوم کو اس کی بداعمالیوں کی پوری پوری سزا ملتی ہے۔

اور یہ حضرت شیخ الاسلام کی سیرت ہی کا فیضان ہے کہ حضرت کے وابستگانِ دامن، وہ ہندوستان میں ہوں، خواہ پاکستان میں یا دنیا کے کسی اور ملک میں ہوں، فرقہ واریت کے جذبات سے پاک، تعصب و منافرت سے دور و نفور، خدا کی مخلوق سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والے اور دنیا کے سب سے زیادہ فراخ قلب انسان ہیں، صاحبِ عزم و ہمت ہیں، اپنے مذہب پر مستقیم، اپنے اعتقاد میں راسخ اور اپنے دلوں میں سارے جہاں کا درد اور احترامِ آدمیت لیے ہوئے بلاتفریق مذہب و ملّت دنیا کے تمام انسانوں کی خدمت کے لیے ہمہ وقت آمادہ و مستعد نظر آتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کے اس پہلو کے مطالعے، اس کے فیضان کے مشاہدے اور حالات کے تجربے سے ہم یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ فرقہ واریت یا تعصب کا تعلق مذہبی خیالات و افکار یا تعلیمات سے ہے۔

سیاسی رہنمائی:

حضرت شیخ الاسلام جنگ آزادی میں صفِ اول کے رہنما تھے۔ ریشمی رومال تحریک کی وہ اہم شخصیت تھے (۱۹۱۷ء)۔ قیدِ مالٹا سے رہائی اور ہندوستان واپسی (۱۹۲۰ء) کے بعد حضرت نے ایک بھرپور سیاسی زندگی گزاری۔ اس دوران میں سب سے پہلی تحریک خلافت کی تھی۔ اس کے لیے ترکِ موالات کا جو پروگرام وضع کیا گیا تھا اسے کامیاب بنانے اور تحریک خلافت کے مقاصد کے حصول کے لیے آپ نے سرگرم حصہ لیا (۲۱-۱۹۲۰ء) سائمن کمیشن کو بے ضرورت سمجھا۔ اور اس کی مخالفت کی۔ (۱۹۲۷ء) کمیونل ایوارڈ کو قومی مقاصد کے لیے نہ صرف ناکافی سمجھا بلکہ نقصان دہ تصور کیا اور اس کی مخالفت کی (۱۹۳۲ء) واردھا تعلیمی سکیم پر تنقید کی اور اُسے قابلِ قبول بنانے کے لیے مناسب و مثبت تجاویز پیش کیں (۱۹۳۸ء) شاردا ایکٹ کے خلاف تحریک کے رہنماؤں میں آپ ایک بلند شخصیت تھے (۱۹۲۹ء)۔ سول میرج کے قانون

کے خلاف تحریک پیدا کی (۱۹۲۲ء) ۔ اسلامی اوقاف کی حفاظت اور انھیں ان کے مصارف میں خرچ کرنے اور حکومت کے دست تصرف سے انھیں بچانے کی کوششوں کی رہنمائی کا شرف جمعیت علماے ہند اور اس کے صدر نشین حضرت شیخ الاسلام کو حاصل تھا (۱۹۲۷ء)۔ ودیا مندر اسکیم کو اس کی طے شدہ صورت میں قبول کرنے سے انکار کیا (۱۹۳۸ء) اردو کے بارے میں یوپی کانگریس کمیٹی اور کانگریس حکومت کے رویے کو انصاف اور کانگریس کی متفقہ پالیسی کے خلاف پایا تو انھیں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے باز رکھنے کی کوشش کی (۱۹۳۸ء)۔ شریعت بل کے نفاذ کی کوششوں میں سب سے زیادہ منظم حصہ حضرت کی جماعت نے لیا تھا (۱۹۳۷ء) نظم جماعت کی تحریک کی رہنمائی (۱۹۲۰ء سے) اور امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک کا سہرا جمعیت علماے ہند اور اس کے زعما کے سر ہے۔ اس کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے تقریباً ۲۵ سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ انفساخِ نکاح کے قانون، خلع بل، قاضی بل، طلاق کا ترمیمی بل وغیرہ کے لیے کوششیں (۱۹۴۱-۱۹۲۹ء) حضرت شیخ الاسلام اور جمعیت علماے ہند جس کے آپ صدر تھے، کی ملی خدمات میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ تمام کارنامے ملی مفاد اور اسلامی شرعی زندگی کے قیام و تحفظ کے نقطۂ نظر سے تھے۔ آپ نے ان تمام تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن کا فائدہ کسی ایک قوم یا ملت کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ ان کے فوائد نہ صرف پورے ملک کے لیے عام تھے، بیرون ملک کے مسلمان ممالک اور تمام برطانوی مقبوضات اور دنیا کی تمام محکوم اقوام قوموں کو پہنچنے والے تھے۔ ان تحریکوں میں سب سے بڑی تحریک ملک کی آزادی اور استقلالِ قومی کی تحریک تھی، اس کے بعد ریشمی رومال اور خلافت کی تحریکات اور ترکِ موالات کا پروگرام تھا، پھر سول نافرمانی کی تحریک (۱۹۳۰ء و ۱۹۴۰ء) نمک ستیہ گرہ، کھدر کے استعمال اور سودیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریکات پیدا ہوئیں اور آخری اہم تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک (۱۹۴۲ء) تھی۔ حضرت شیخ الاسلام نے ان تمام تحریکوں میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں آپ کو قید و بند کی صعوبتوں اور ایثارِ وقت و مال کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

۱۹۴۰ء کے بعد آپ کو سخت آزمایشوں اور بڑی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا۔ خاص طور پر ملک کی آزادی سے قبل کے ڈھائی تین برس آپ کے لیے سخت مشکلات کے تھے۔ اس دوران میں لوگ آپ کی جان کے لاگو اور عزت کے دشمن ہو گئے تھے۔ آپ کو نہ صرف تحریکِ پاکستان کا مخالف بلکہ مسلمانوں کا دشمن کہا گیا۔ حالانکہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے میں آپ اپنا ایک نظریہ اور مسئلے کے حل کے لیے ایک فارمولا رکھتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا نظریہ رکھنے والا جمعیت علماء کے زعماء سے یہ توقع رکھتا کہ وہ اُس کے حق میں اپنے نظریے اور اس کے لیے اپنے بہترین دلائل سے دست بردار ہو جائیں تو یہ حق حضرت شیخ الاسلام جمعیت علماء ہند، دوسری قوم پرور مسلمان جماعتوں اور ان کے زعماء کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا کہ وہ اِن کے حق میں اپنے نظریے اور اپنے دلائل سے دست بردار ہو جائیں۔ جمعیت علما نے جو فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا تھا اور جسے "مدنی فارمولا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُسے مجلس احرار اسلام، مومن کانفرنس، جمعیت القریش، شیعہ پولٹیکل کانفرنس، مسلم مجلس کے علاوہ سندھ، بلوچستان، سرحد، بنگال وغیرہ کی متعدد جماعتوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ لیکن کسی جماعت نے دوسری جماعت سے بے سوچے سمجھے اس منصوبے کو مان لینے کی توقع کے بجائے اصل مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور متفقہ طور پر کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی آرزو کی تھی۔

مدنی فارمولا :

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ملک کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے میں اپنی ایک مستقل رائے رکھتے تھے۔ حضرت کے نزدیک اس مسئلے کا صحیح ترین حل وہ فارمولا تھا جسے جمعیت علماء ہند نے اپنے پلیٹ فارم سے ۱۹۲۱ء میں پیش کیا تھا اور بعد میں بعض وضاحتوں اور تشریحوں کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں قوم کے سامنے رکھا تھا۔ اور یہی فارمولا ملک کی قوم پرور جماعتوں کی تائید کے ساتھ کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کیا تھا۔ جس کے بارے میں مشن کی رائے تھی کہ یہ ایک سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، اس کے پیچھے

سیاسی بصیرت کارفرما ہے اور قابل عمل۔ اس فارمولے میں برصغیر ہندوستان کے ہر صوبے کو مستقل اکائی کی حیثیت حاصل تھی۔ چند مفوضہ امور کے علاوہ تمام معاملات میں صوبے آزاد و خود مختار تھے۔ مفوضہ امور کی ذمّے داری مرکز کی تھی۔ مرکز کی ہیئت ترکیبی میں ۴۵ ہندوؤں کے بالمقابل ۴۵ سیٹیں مسلمانوں کی تھیں جب کہ ۱۰ سیٹیں اقلیتوں کے لیے مخصوص تھیں۔ کوئی ایسا سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی مسئلہ جس کا تعلق مسلمانوں سے ہو، اُن کی دو تہائی اکثریت کے اتفاق رائے کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ وہی منصوبہ تھا جس کے صوبوں کو مختلف گروپوں کی شکل میں مرکز کی اسی ہیئت ترکیبی کے ساتھ وہی حقوق و اختیارات تفویض کیے گئے تھے اور کانگریس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا تھا اور کیبنٹ مشن نے بعض جزوی ترامیم کے بعد اپنا لیا تھا اور ملک کی دیگر جماعتوں کے بشمول مسلم لیگ کے زعما کی اس یقین دہانی پر کہ اس کے ذریعے پاکستان کی بنیاد فراہم کر دی گئی ہے، مسلم لیگ کونسل نے بھی اسے منظور کر لیا تھا، لیکن کانگریس کے صدر کی جانب سے اس منصوبے کی ایک شق کی غلط تشریح سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ اس منصوبے کے بارے میں اپنی منظوری سے دست بردار ہو گئی اور اپنے سابق موقف پر لوٹ گئی۔ جس پر اس کے ثبات نے تقسیم ملک کے نتیجے اور قیام پاکستان کے آغاز پر پہنچا دیا۔

اب جس طرح اس عہد کی خوبیاں بانیانِ پاکستان کے نصیب کی تاریخ ہیں، اسی طرح اگر اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے میں پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں یا پاکستان میں مختلف قومیتوں اور مقامی اور غیر مقامی کے مسئلے نے سر اٹھایا ہے، اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل چالیس سال کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی قریب نظر نہیں آتی، اسلام کے نظام سیاسی یا طرزِ حکمرانی کا مسئلہ ہنوز تصفیہ طلب ہے۔ اسلامی تہذیب کی تعریف پر بھی اگر اتفاق نہیں ہو سکا۔ اردو ہندی مسئلے کے بجائے اردو بنگالی مسئلہ پیدا ہو کر ملک دولخت ہو چکا ہے۔ اردو اور مقامی زبانوں کا مسئلہ موجود ہے اور اردو کے نفاذ کی راہ ابھی ہموار نہیں اور سب سے بڑھ کر شریعت کا مسئلہ ہی مابہ النزاع ہے تو اس کے لیے اسی تحریک کے رہنماؤں کی بصیرت، ان کے اخلاص اور

ان کے افکار و سیرت کو ذمے دار قرار دینا چاہیے۔ اور یہ حقیقت تسلیم کی جانی چاہیے کہ زندگی کے واقعی مسائل کے تصفیے کے لیے حقیقی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی کے مسائل خوبصورت نعروں اور گلے کی قوت سے طے نہیں کیے جا سکتے اور نہ مفروضوں پر ان کے تصفیے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن

"جب سے اسلام نے ظہور کیا ہے انگریز نے برابر اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ کسی قوم نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا یہ دو سو برس سے زیادہ عرصہ سے اسلام کو فنا کر رہا ہے۔ اس نے ہندوستان کی اسلامی طاقت کو فنا کیا"۔

اس کے بعد حضرت نے ہندوستان میں برطانیہ کے معاشی، اقتصادی اور اخلاقی مظالم اور ۱۸۵۷ء کی انسانیت سوز حرکتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"مگر اسی کے ساتھ عراق، شام، مصر، فلسطین، عرب، صومالی لینڈ، مشرقی افریقہ، سوڈان، برما وغیرہ کے اسلامی عروج کو پامال کیا۔ خلافت عظمیٰ کو زیر و زبر کیا۔ حجاز، جدہ، مکہ اور مدینہ پر چڑھائی کی۔ چناق، قلعہ سمرنا، استنبول وغیرہ میں کیا کیا نہیں کیا۔ اور ان مقامات پر کیسی کیسی خون کی ندیاں بہائیں۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ یورپین طاقتوں میں اسلامی ممالک کو تقسیم کیا۔ طرابلس، صحرائے لیبیا، ادرنہ، سورکن وغیرہ اٹلی کو، ریف اسپین کو، الجیریا، تیونس، فاس، مراکش وغیرہ فرانس کو، وسط ایشیا اور شمالی ایشیا کے ممالک بخارا، سمرقند، گرجستان، ازبکستان، داغستان، قرخستان، روس وغیرہ کو برابر معاہدوں وغیرہ کے ذریعہ تقسیم کرتے رہے۔ ٹرکی سے بلگیریا، یونان، مقدونیہ، رومانیہ، ہرسکٹ، البانیہ، سردیہ، مانٹیگرو، کویت، بلقان وغیرہ کو مجبور کر کے آزاد کراتے رہے اور اسلامی طاقت کو فنا کراتے رہے۔"

(مکتوبات: ج ۲، ص ۱۳۰)

ناقابل فراموش شخصیت،

مولانا ابوالکلام آزاد

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے ملک کی جو خدمتیں کی ہیں ان کی بڑی قدر و قیمت ہے اور وہ اس قدر شاندار ہیں کہ ہم انھیں فراموش نہیں کر سکتے۔ ابھی ان کی عمر چھوٹی تھی کہ ان کے والد فیض آباد سے حجاز چلے گئے تاکہ زندگی کے آخری دن مدینہ منورہ میں بسر کر سکیں۔ یہ بھی ان کے ہمراہ چلے گئے جو لوگ حجاز چلے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے گزارے کے لیے اوقاف پر اعتماد کرتے ہیں لیکن ان کے خاندان نے ایسا نہیں کیا بلکہ انھوں نے بساطی کی دکان کی اس سے خاندان کا خرچ چلایا اور اسی حالت میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ہندوستان آئے مگر پھر مدینہ منورہ چلے گئے اور پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہے۔ اس وقت ان کا سیاست سے تعلق نہ تھا۔

۱۹۱۶ء میں شیخ الہند محمود حسنؒ حجاز گئے یہ وہ زمانہ تھا جب شریف مکہ برطانیہ سے مل کر بغاوت کا انتظام کر رہا تھا۔ ان کی موجودگی میں بغاوت کا نعرہ بلند ہوا۔ اسے مولانا محمود حسن برداشت نہ کر سکتے تھے۔

کسی طرح یہ خبر سنی گئی کہ وہ (حضرت شیخ الہندؒ) بغاوت کے خلاف ہیں۔ شریف حسین نے انھیں جدہ لا کر برطانیہ کے حوالے کر دیا۔ ان کی گرفتاری ہوئی تو مولانا حسین احمد مدنی نے اکیلے رہنا پسند نہ کیا اور انھوں نے بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ چنانچہ مالٹا میں دونوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ جنگ ختم ہوئی اور مولانا محمود حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی رہائی عمل میں آئی۔ وہاں سے وہ ہندوستان آئے۔ کچھ دن بعد کلکتہ کی جامع مسجد میں میں نے مدرسہ کھولا تاکہ عدم تعاون کے سلسلے میں جن طلبہ کو کالج چھوڑنا پڑا تھا ان کی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔ اس مدرسہ میں مولانا حسین احمد مدنی مدرس اول رہے، اور وہاں

کام کرتے رہے لیکن وہ سیاسی جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور سرگرم پارٹ ادا کرتے تھے۔
۱۹۲۰ء میں انھوں نے اپنے تئیں آزادی کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کانگریس تحریک میں انھوں نے مردانہ وار حصہ لیا اور قید و بند کی مصیبتیں سہیں اس سے بھی زیادہ وہ مصیبتیں تھیں جو اپنے ہی ہم مذہبوں کے ہاتھوں انھیں پیش آئیں۔

۱۹۴۶ء میں جب الیکشن ہوا تو انھوں نے کانگریس کی طرف سے دورہ کیا اور اپیل کی کہ مسلمان کانگریس کو ووٹ دیں۔ ان کی انتہائی غیر شریفانہ طریقہ سے مخالفت کی گئی۔ ضلع ہبلی کے مقام پر تو ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ریلوے پولیس نے مداخلت نہ کی ہوتی تو جان کا خطرہ تھا۔ لیگیوں نے عوام کو دھوکا دے کر مذہبی پاگل پن کو اجاگر کیا اور جب عوام میں پاگل پن ہو جائے تو اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ لیکن مولانا مدنی پہاڑ کی طرح جمے رہے اور ان کی استقامت میں تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے یو۔پی کا دورہ کیا وہاں بھی بعض مقامات پر پتھر پھینکے گئے لیکن وہ اپنے اصول پر قائم رہے۔ انھوں نے یو۔پی کا دورہ کیا وہاں بھی بعض مقامات پر پتھر پھینکے گئے لیکن وہ اپنے اصول پر قائم رہے۔ انھوں نے جو روش اختیار کر لی تھی اور جسے ایمان سمجھتے تھے اس پر قائم رہے۔

مسلمانوں کے فرائض ثلاثہ اور ان کا سرمایہ حیات

دین و ملت کی حفاظت اور تبلیغ و ترقی کے لیے پورے اخلاص، استقلال اور صبر و شکر کے ساتھ مکمل کوششیں صرف ہونی چاہئیں۔ وطن عزیز کی حفاظت، ترقی اور سربلندی کے لیے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ اتفاق، اتحاد، یکجہتی اور رواداری کو ہر حالت میں پیش نظر رکھنا چاہیے۔

میں آپ کو کسی خاص جماعت میں شرکت کا حکم نہیں دیتا مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ ملک اور اہل ملک کی ترقی اور بہبود کے لیے آپ اسی جماعت میں شریک ہوں جس کو ان مقاصد اور اصولوں کی روشنی میں بہتر سمجھیں۔ آپ کا نصب العین ملک کی خدمت اور آپ کی زندگی کا سرمایہ بلند حوصلگی، اولوالعزمی اور انتھک جدوجہد ہونا چاہیے۔

حضرت مدنی اور کانگریس کی شرکت

"میں ۲۵ برس سے کانگریس کا ممبر ہوں۔ جلسوں میں شریک ہوتا ہوں، تقریریں کرتا ہوں، فیس ممبری ادا کرتا ہوں، عہدوں کو قبول کرتا ہوں، جیل جاتا ہوں اور اسی طرح اسی وقت سے جمعیتہ علماء کا بھی ممبر ہوں۔ہاں کسی مذہبی و فرقہ واری غیر مسلم (ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، دہلوی) جماعت کا نہ ممبر ہوں نہ ان کے جلسوں وغیرہ میں شریک ہوتا ہوں۔"

(نقش حیات: ج ۲، ص ۱۵۳)

ایک اہم نکتہ اس جگہ قابل غور ہے۔ کانگریس میں یہ شرکت حضرت کے لیے فقط سیاسی یا عوامی سرگرمی نہیں تھی، بلکہ وہ اس کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی اور حکومت برطانیہ کے استیصال کو آپ اسلام کی ترقی اور عالم اسلام کی گلو خلاصی کی طرف پہلا اور ضروری قدم خیال فرماتے تھے۔ حضرت کا ذوق اور طبیعت ثانیہ یہ تھی کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر اقدام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا جوئی کے لیے وقف تھا اور اپنے اسی مزاج کی روشنی میں وہ کانگریس کو ملک و قوم، مسلمانوں اور عالم اسلام کے لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد جماعت قرار دیتے تھے۔ اور اس میں شرکت کو دینی ضرورت فرماتے تھے۔ اپنے اس مسلک کی وضاحت فرماتے ہوئے (مکتوبات شیخ الاسلام: ج ۴، ص ۳۲۷ میں) لکھتے ہیں:

"بے شک میں کانگریس کا ممبر ہوں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ یہ ملک کی ایک مشترکہ جماعت ہے۔ اس میں ملک کا ہر باشندہ ممبر ہے اور ہو سکتا ہے۔ یہ ۱۸۸۵ء سے قائم ہے۔ اس کے آٹھ یا نو صدر مسلمان رہ چکے ہیں۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیتہ علماء ۱۹۲۰ء سے برابر اس میں شریک ہو کر کام کرنے کی ہدایت کرتی رہی ہیں۔ یہ خالص ہندوؤں کی جماعت نہیں۔ ہندوؤں کی خالص ہندو مہا سبھا ہے۔ وہ صرف ہندوؤں کے فریقانہ حقوق کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ جس طرح مسلم لیگ خالص مسلمانوں کے حقوق کی ذمے دار ہے۔ جس طرح میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلیوں میں مسلمان ملی حقوق کی حفاظت وغیرہ کے لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کانگریس میں جانا اور تمام ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانا اور اس کے لیے جنگ بقدر طاقت کرنا ضروری ہے اور میں اس کو اس وقت جہاد اور افضل الجہاد سمجھتا ہوں۔"

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی از فرید الوحیدی، ص ۸۱-۳۸)

باب دوم

مشاہدات و تأثرات

ہندوستان میں مسلمانوں کی عددی حیثیت

"ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گزشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان کے متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ برطانوی سیاست داں اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرنے اور ان کے معاملات کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی بناء پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں۔ یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے، وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے ہیں جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان عددی اقلیت میں ہیں۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم خصوصیات کے مالک ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے انھیں استحکام حاصل ہے۔"

(خطبہ صدارت، لاہور۔ ۱۹۴۲ء)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجھے اپنی اس زندگی میں جس چیز کا بار بار تجربہ اور مشاہدہ ہوا ہے یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نایاب اور مشکل کام انسان کا بروقت پہچاننا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے تخیل اور تجربہ کے مطابق اپنے زمانہ کسے مشاہیر کا ایک نقشہ اور ایک خیالی تصویر تیار کر لیتا ہے اور اس کو مقام دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک عارف کو کہنا پڑا ہے سہ

ہر کسے از ظن خود شد یار من　　　　وز درون من نہ جست اسرار من

لیکن بعض صورتوں میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب اس پر کچھ اس طرح کے حجابات پڑ جاتے ہیں جو عام لوگوں میں معروف ہوں اور جو رواجی ہوں، جن کا اپنا ایک خاص ڈھانچہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص اہل دنیا کے لباس میں رہتا ہے تو اندر سے وہ خواہ کچھ بھی ہو لوگ اس کی اصل حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے، ہماری نگاہیں حجابات سے پار نہیں ہونے پاتیں۔

مولانا مدنی جن کے سمجھنے میں ایک اور آہنی حجاب حائل ہو گیا ہے یہ ان کی سیاسی حیثیت تھی، جیسا کہ کہا جاتا ہے اور آیندہ بھی کہا، لکھا اور شایع کیا جاتا رہے گا، مولانا جنگ آزادی کے بہت بڑے قائد اور رہنما تھے۔ لوگوں کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہو گی اور شاید مولانا کی انتہائی تعریف اور مدح سمجھی جائے گی، لیکن ایسا نہیں ہے، مولانا کی

ؒ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنو کے تعزیتی جلسے میں تقریر۔

اصل صورت و حیثیت اس کے پیچھے مستور رہی ہے اور اس حجاب نے بڑے بڑے لوگوں کی نگاہوں سے ان کو اوجھل رکھا ہے۔

اصل تو یہی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ جانتا ہے کہ کون کیا ہے اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو دوسری حیثیتوں کے جاننے کا تھوڑا بہت موقع ملتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان حجابات کو اٹھائیں اور اس شخص کی اصل صورت اور حیثیت کو سامنے لائیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی اس کا تھوڑا بہت موقع ملا ہے اور میں اپنے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کے کچھ پوشیدہ گوشے جن کو مجھے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا ہے ان لوگوں تک پہنچاؤں جو مولانا کو اب تک کچھ اور سمجھتے رہے ہیں۔

مولانا اس وقت وہاں ہیں جہاں ہماری مدح وستایش کی ان کو ضرورت نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں انسان مدح و ذم سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کا تذکرہ میں اس وقت اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کی خود ہمیں ضرورت ہے ہمیں ان کی زندگی پر نظر ڈالنی چاہیے اور اس کے مفید پہلوؤں کو اپنانا اور ان سے سبق لینا چاہیے، دوسری بات یہ ہے کہ جو باتیں میں عرض کروں گا یہ وہ ہیں جو میرے ذاتی مشاہدہ میں آئیں، ان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، کوئی رنگ آمیزی نہیں ہے، اس لیے کہ ان واقعات کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاص:

ان کی زندگی کا سب سے پہلا، ممتاز اور اعلیٰ وصف اخلاص اور للّٰہیت ہے، افسوس یہ ہے کہ الفاظ کثرت استعمال سے اپنی قیمت اور وزن کھو دیتے ہیں، اخلاص بھی انہیں لفظوں میں سے ہے، ہر معمولی دیندار اور ذرا پابند صوم وصلوٰۃ آدمی کو ہم مخلص کہہ دیتے ہیں، ہمارے نزدیک آدمی کی سب سے پہلی تعریف مخلص ہوتی ہے، حالانکہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مخلص ہونا انسان کی آخری اور انتہائی تعریف ہے، اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ

وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے مقام پہ پہنچنا آسان نہیں ہے، یہ مقام نبوت کا پرتو ہے، میں نے مولانا کی زندگی میں اس جوہر کو بہت نمایاں دیکھا ایسا کام جو اخلاص ہی پہ مبنی ہو اور جو عام طور پہ محض اللہ ہی کے لیے کیا جاتا ہو، اور جس میں کوئی دنیاوی اور مادی نفع نہ ہو مثلاً نماز پڑھنا، اس میں اخلاص کا قائم رکھنا زیادہ مشکل نہیں، اگرچہ یہ بات بھی پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے کاموں میں بھی محض خال خال اور چند ہی ایک صحیح معنی میں مخلص کہے جانے کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن جو کام اکثر و بیشتر بلکہ تمام تر دنیاوی نفع اور فائدہ کے لیے کیے جاتے ہوں، جہاں غیر مخلصین کا مجمع ہو وہاں اخلاص کا قائم رکھنا بڑا مشکل ہے، نماز اخلاص کے ساتھ پڑھنا آسان ہے، لیکن تجارت، مزدوری، کتابوں کا لکھنا اور شائع کرنا اخلاص کے ساتھ بہت مشکل کام ہے، اور اسی لیے اللہ نے ایسے لوگوں کا خاص طور پہ ذکر فرمایا ہے جو ایسے اعمال میں اپنے اخلاص کو قائم رکھتے ہیں، رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ (الآیۃ)

مولانا کی عظمت کا راز یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی بڑے مقرر تھے، میں آپ کے سامنے صاف کہتا ہوں کہ مولانا کوئی جادو بیان اور شعلہ بار مقرر نہیں تھے، بلکہ وہ بقدر ضرورت ہی تقریر کرتے تھے، لوگ مولانا کے سامنے اس لیے نہیں جھکتے تھے کہ وہ کوئی بڑے مصنف تھے، مولانا کا شمار ملک کے نامور و ممتاز مصنفین میں نہیں، ہر شخص ان کے سامنے جھوٹا آتا تھا اس لیے نہیں کہ دنیا میں ان کا جیسا کوئی عالم نہیں، میں اس کے کہنے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا اور نہ اس میں مولانا کی کوئی تنقیص ہے، بہت بڑا عالم ہو جانا کوئی بڑا کمال نہیں، جو ذرا محنتی، ذہین اور فہیم ہو اور اس کو مطالعہ کا موقع ملے ایک بڑا عالم بن سکتا ہے، مولانا کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ وہ سر تا پا اخلاص تھے، وہ اپنے کام میں اور ہر وقت مخلص تھے، ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی اور غیر دینی سے غیر دینی کام اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا، ان کی ساری سیاسی جد و جہد محض ابتغاء رضوان اللہ تھی، وہ

صرف اس لیے اس میں منہمک رہے کہ وہ اس کو رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ اس سے قرب الٰہی چاہتے تھے۔ وہ ان کے لیے "سلوک" بن گیا تھا، یہ ان کے لیے جہاد تھا۔۔۔۔۔ ۔۔ ۔۔۔۔۔۔ اور وہ اس میں شرکت سے محض تقرب بالجہاد چاہتے تھے جس نیت سے وہ رات کو تہجد پڑھتے تھے، آپ یقین کریں کہ اسی نیت سے وہ اسٹیج پر تقریر کرتے تھے، وہ وہاں اس نیت کے ساتھ مشغول رہتے تھے جس نیت سے وہ نوافل پڑھتے تھے، جو ثواب ان کو تہجد کی آٹھ یا دس رکعتوں میں ملتا ہوگا وہ ان کو رات کے کسی جلسہ کی شرکت میں ملتا ہوگا، جس طرح مجاہد میدان جنگ میں جاتا ہوگا اسی نیت سے وہ جیل خانے جاتے رہے ہوں گے، یہ آسان کام نہیں؛ یہ مقام وہ ہے جو صرف اہل اللہ کو بھی نہیں، کاملین اولیاء اللہ ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک منٹ کے لیے اپنے کو ایسے ماحول میں اللہ کے قریب سمجھنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ وہاں انہوں نے گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں اپنے کو اللہ کے ساتھ مشغول رکھا اس کی علامت یہ ہے کہ ان کو ان کی یہ سیاسی مشغولیت ان کیفیات سے دور نہیں کرتی تھی جو اس سے علیحدہ ہوتی تھیں جس اسٹیج پر وہ ہوتے تھے وہاں اکثر وہ لوگ ہوتے تھے جنہیں نماز کا بالکل خیال بھی نہیں ہوتا تھا اور بعض اوقات اکثریت غیر مسلموں کی ہوتی تھی۔ لیکن وہ جلسہ سے اٹھ کر کسی مسجد میں تشریف لے جاتے، وہاں اگر نماز ہو چکی ہے، کسی دوسری مسجد میں تشریف لے جاتے جہاں جماعت ملتی وہاں پڑھتے، کہیں نہ ملتی تو اپنی علیحدہ جماعت کرتے، یہ ایک مثال ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جو ان کی زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے اخلاص و للّٰہیت اور اللہ کے ساتھ انتہائی تعلق اور مشغولیت کی دلیل ہیں، اور یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ آسان کام نہیں —— یہ ان کی زندگی کا پہلا جوہر ہے جس نے ان کو وہ بلندی عطا کی جو ان کے سیاسی معاصرین میں سے کسی کو نہیں ملی۔

اس اخلاص کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس سیاسی جدوجہد میں شروع سے حصہ لیا اور اس وقت تک حصہ لیتے رہے جب تک اس کی ضرورت

تھی، لیکن جب ضرورت پوری ہو گئی اور وقت اور موقع آیا اس محنت کی قیمت وصول کرنے کا، تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیے۔ ایک وقت ہوتا ہے مزدوری کا، ایک مزد کا، مزدوری پوری کی، مسلسل کی اور محنت و مشقت سے کی لیکن اجرت وہاں کے لیے اٹھا رکھی جہاں وہ اب ہیں، جب آزادی کا درخت لگایا جا رہا تھا اور اس کی آبیاری کے لیے خون پسینہ کی ضرورت تھی، وہ پیش پیش تھے، لیکن جب اس درخت کے پھل کھانے کا وقت آیا اس وقت وہ اللہ کا بندہ اتنی دور جا بیٹھا جہاں اس کی ہوا بھی نہ لگ سکے، وہ آزادی سے پہلے بھی ایک مدرس تھے اب بھی وہی مدرس رہے، پہلے بھی ایک مختصر سی تنخواہ پاتے تھے اب بھی وہی پاتے رہے، آزادی کی جدوجہد کے رفیقوں اور ہم سفروں میں وہی ایک شخص تھے جن کا دامن دنیاوی منفعت کے داغ اور آلودگی سے پاک رہا، اور بلا واسطہ اور بالواسطہ وہ کسی طرح اپنے صاحب اقتدار و با اختیار رفیقوں کے ممنون نہیں ہوئے۔

عزم و عالی ہمتی:

مولانا کی زندگی میں دوسرا نمایاں وصف ان کا عزم و عالی ہمتی تھی، مسلمانوں میں بالعموم اور طبقۂ علماء میں بالخصوص قوت ارادی کی بڑی کمی نظر آتی ہے، دماغی اور ذہنی حیثیت سے بڑے بڑے ممتاز لوگ ہوں گے اور ہیں، لیکن یہ جوہر نایاب ہے، دینی و علمی حلقہ میں مولانا جس چیز میں ممتاز تھے وہ بلند حوصلگی ہے، جس چیز کو رضائے الٰہی کے لیے ضروری سمجھا اس کو انہوں نے بڑی خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلا اور برداشت کیا بلکہ دعوت دی خواہ وہ کیسی ہی تکلیف وہ صبر آزما اور ہمت شکن ہو، انہوں نے اس وقت کئی کئی برس جیل کاٹے ہیں جب جیل جانا کام نہیں تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی بڑی چیز اور بظاہر زیادہ سخت چیز کا مقابلہ کر لیتا ہے، لیکن بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، حکومت سے ٹکر لینا اور اس کی سختیوں اور مظالم کو برداشت کرنا آسان ہے لیکن بعض گھریلو معاملات اور گھریلو تعلقات کے سامنے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔

لیکن مولانا نے ہر چیز کا مقابلہ کیا، انہوں نے کوئی کام اپنی زندگی میں اس لیے چھوڑا نہ کیا یعنی ملتوی نہیں کیا کہ وہ مشکل ہے، ہم آپ سب جانتے ہیں کہ وہ کثرت سے سفر کرتے تھے۔ سیاسی و غیر سیاسی، دینی و غیر دینی حلقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ان کے برابر سفر کیے ہوں، پھر ان سفروں میں لوگوں سے ملنا، باتیں کرنا، تقریریں کرنا، معمولات کا پورا کرنا، جو لوگ مولانا سے قریب رہے ہیں وہ ان کے اس جوہر سے کسی قدر واقف ہیں۔ لوگوں کی دلجوئی اور محبین کی خوشی کے لیے بڑے بڑے مشکل اور طویل سفر اپنے ذمہ لے لیتے، جگہ جگہ ٹھیرتے اور عزیزوں اور دوستوں کی فرمائشیں پوری کرتے، نہ بڑھاپا ان کے لیے رکاوٹ تھا، نہ بیماری، نہ مصروفیت، پھر مختلف بلکہ متضاد مشاغل اور ذمہ داریوں کا جمع کرنا بغیر اعلیٰ درجہ کے عزم اور قوت ارادی کے ممکن نہ تھا، مولانا کو وہ عزم اور طبیعت کا استقلال ملا تھا جو ملکوں اور قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دیتا ہے، مگر افسوس کہ اس سے پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔

دینی انہماک و مصروفیت:

دینی انہماک اور دینی مصروفیت، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان سے کچھ قریب رہے ہیں، ایسا مسلسل اور انتھک کام کرنے والا، اور نہ اکتانے اور نہ گھبرانے والا انسان کم نظر آیا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ جو مولانا کی مصروفیت کو دیکھتے تھے وہ گھبرا جاتے تھے اور پریشان ہو جاتے تھے کہ مولانا اتنا کام کیسے کرتے ہیں، سیکڑوں آدمیوں سے ملنا درجنوں مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، ایک ایک سے اس کے مطلب اور ضرورت کی بات کرنا، حتیٰ کہ تعویذ چاہنے والوں کو تعویذ دینا، پھر اسی میں حدیث کے درس کی تیاری کرنا اور کئی کئی وقت، صبح شام، ظہر بعد، عشاء بعد دیر رات تک درس دینا، اور درس بھی ایسا عالمانہ و فاضلانہ جو ان کے منصب کے مطابق تھا، پھر خطوط کا جواب دینا، جب تک خود لکھ سکنے کے قابل رہے خود ہی جواب لکھتے رہے، آخر میں دوسروں سے لکھواتے لگے تھے، لیکن پھر بھی بہت سے خطوط اپنے قلم سے لکھتے، میرا خیال ہے کہ دینی شخصیتوں

میں سے کسی کے پاس اتنی ڈاک نہ آتی ہوگی جتنی مولانا کے پاس آتی تھی اس لیے کہ مولانا کی حیثیت سیاسی لیڈر کی بھی تھی، شیخ طریقت کی بھی تھی اور ایک عالم دین کی بھی تھی، مہمانوں کا اکرام کرنا، ایک ایک شخص کی طرف خصوصی توجہ اس کی ضرورت پوری کرنا اور وہ بھی پوری بشاشت، انبساط و انشراح کے ساتھ کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی امور میں اتنا انہماک و سرگرمی، یا تو میں نے مولانا الیاس صاحبؒ میں دیکھی یا مولاناؒ میں، مولانا الیاسؒ ہیں اپنے رنگ میں اور مولاناؒ ہیں اپنے رنگ میں رات کو دس بجے کہیں سفر سے واپس آئے، اسی وقت طلبہ کو اطلاع ہوئی کہ درس ہوگا کیسی نیند کہاں کا تکان، پورے نشاط کے ساتھ درس دیا، اسی میں طلبہ کے سوالات کے جوابات اور وہ بھی غیر متعلق سوالات کے جوابات — آپ تعجب سے سنیں گے کہ حج کے سفر سے واپس آئے ہیں جس سفر کے بعد مہینوں لوگ تھکن اتارتے ہیں اور کس طرح آئے ہیں کہ راستہ میں ہر بڑے اسٹیشن پر متعلقین و محبین سے مصافحہ کرتے، مزاج پوچھتے، ملاقات کرتے آئے ہیں، آتے ہی حکم ہوا کہ سبق ہوگا۔ بتائیے سیاسی لیڈروں میں یہ واقعہ مل سکتا ہے کہ مشاہیر عصر میں؟ بغیر انتہائی تعلق مع اللہ کے یہ ممکن نہیں، یہ ہیں وہ کرامتیں جو بڑی بڑی حسی کرامتوں سے بدرجہا بلند ہیں۔

آدمیت اور انسانیت:

مولانا کا چوتھا بڑا وصف ان کی آدمیت اور انسانیت ہے، آدمیت ایک خاص لفظ ہے اور خاص معنی میں بولا جاتا ہے، معمولی بات نہیں۔ شعر

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ جب کسی کی بڑی تعریف کرتے تو فرماتے "وہ نسخۂ آدمیت ہے۔ ایک شخص کی وفات ہوئی تو فرمایا "مرد مرد و آدمیت تمام شد" آج مولانا کے بارے میں بھی یہی جملہ بجا طور پر دہرایا جا سکتا ہے۔ مولانا کی اس صفت و خصوصیت کا اندازہ ان کے مکارم اخلاق سے ہوتا ہے، دوسروں کو حتی کہ معاندین

ومخالفین تک کو نفع پہنچانے کی کوشش کرتے، خود تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں لیکن دوسروں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی فکر کر رہے ہیں، ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی مہمان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ پیر دبانے والے مولانا ہو سکتے ہیں اور یہی نہیں جنھوں نے ان کو تکلیفیں پہنچائیں، مولانا نے ان کے ساتھ سلوک و احسان کیا اور ہمیشہ نفع رسانی اور خدمت کی فکر میں رہتے، اور جب بھی اور جس طرح بھی موقع ملا ہے اس کو آرام و نفع پہنچایا ہے، دوسروں سے اگر اس کو کام پڑا ہے تو سفارش کی ہے، خود جا سکے تو جا کر کی ہے، پیغام کے ذریعہ سے ممکن ہوا تو پیغام بھیجا ہے، جس کے جیسے حقوق ہوتے اور جس کا جیسا مرتبہ ہوا اور جس کو جیسی ضرورت ہوئی اسی کے شایانِ شان پورا کیا ہے، براہِ راست ان مخالفین کو ضرورت پڑی تو ان کی ضرورت پوری کی اور اگر ان کے عزیزوں میں سے کسی کو ضرورت ہوئی ہے تو ان کی کاربراری کی اور ان کے واسطے سے اپنے ان معاندین کو معاف بھی کیا، ان کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔ ان کا عمل وہ تھا جو کسی عارف نے کہا ہے ؎

ہر کہ ما را یار نبود ایزد او را یار باد | ہر کہ ما را رنج دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ اندر راہِ ما خارے نہد از دشمنی | ہر گلے کز باغِ عمرش بشگفد گلزار باد

باطنی مقام اور عظمت:

ہماری کی آپ کی بدقسمتی تھی کہ ہم نے جانا نہیں کہ وہ کیسے باطنی مراتب پر فائز تھے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس کوچہ سے واقف ہوں، اور جو اس کا احساس رکھتے ہوں، وقت کے عارفین و اہلِ نظر کی زبان سے میں نے ان کے لیے بڑے بلند کلمات سنے ہیں، اور ان سب کو ان کی عظمت و بلندی کا معترف اور ان کی مدح و توصیف میں رطب اللسان پایا ہے۔ مولانا اپنے زمانہ میں ڈاکٹر اقبال کے ان اشعار کا کامل نمونہ و مصداق تھے ؎

سر دیں ما را خبر او را نظر | او درونِ خانہ ما بیرونِ در

ما کلیسا دوست ما مسجد فروش | او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش
ما ہمہ عبد فرنگ او رعبدہ | او نگنجد در جہاں رنگ و بو

ڈاکٹر صاحب نے کبھی کہا تھا ۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل | یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

مولانا کا عمل پہلے مسلک پر تھا، یہ واقعہ ہے کہ وسعت افلاک میں مولانا کی زندگی تکبیر مسلسل تھی۔

یہ میں کہوں گا کہ مولانا معصوم نہیں تھے، ایسا نہیں ہے کہ ان سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو، ضروری نہیں کہ ان کی تمام سیاسی اور اجتہادی آراء نظریات میں ان سے اتفاق کیا جائے، لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ جو کچھ انہوں نے کہا یا کیا محض رضائے الٰہی اور حمیت دینی میں، ان کے لیے کوئی دنیاوی محرک یا مصلحت نہ تھی:

اساتذہ و شیوخ سے تعلق:

مولانا کا چھٹا بڑا وصف ان کا اپنے بزرگوں، اساتذہ اور شیوخ سے عاشقانہ تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کی شخصیت کی کنجی ہے، اور ان کی ساری زندگی اور اس کے اہم اور عظیم واقعات کا راز یہ ہے، یہ چیز ایسی تھی جو ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی، ان کا یہ تعلق ان کو بعض ایسی چیزوں پر آمادہ کر دیتا تھا جو ان کے عام اخلاق و صفات کے خلاف ہوتیں، اور بعض دفعہ سمجھ میں نہ آتیں کہ یہ کیسے ہوا، یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا اپنی بڑی سے بڑی توہین اور اذیت برداشت کر سکتے تھے مگر اپنے اکابر و اسلاف اور شیوخ و اساتذہ کی تنقیص اور ان کا استخفاف برداشت نہ کر سکتے تھے، بعض مرتبہ یہ چیز ان کی شدید بیزاری و مخالفت کا سبب بن جاتی، آخر میں اپنے اسلاف کی امانت کی حفاظت اور ان کے نقش قدم پر چلنے اور ان کے مسلک پر قائم رہنے کا جذبہ بہت شدید ہو گیا تھا، اور وہ اس راستہ سے بال بھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے تھے، اسی طرح سے خلاف شریعت فعل کے دیکھنے کا تحمل نہ

ان کے عام اخلاق پر بھی غالب آگیا تھا۔

عظیم الشان خدمت:

مولانا کا ایک بہت بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے بقاو قیام کا ایک بڑا ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ جب بڑے بڑے کوہ استقامت جنبش میں آگئے، سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں، مسلمانوں کی تاریخ میں دو ہی چار ایسے دور گذرے ہیں جب مسلمانوں کے اور اسلام کے بقا کا سوال آگیا ہے ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا، اصل مسئلہ سہارن پور کے مسلمانوں کا تھا، سارا دارومدار ان پہ تھا، یہ اپنی جگہ چھوڑتے تو یو، پی کے مسلمانوں کے قدم لغزش میں آجاتے، اور سہارنپور کے مسلمانوں کا انحصار سارا کا سارا دو ہستیوں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ اور حضرت مولانا مدنیؒ پہ تھا، اس وقت مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ جمنا کے کنارے ہوتا تھا لیکن یہ دو صاحب عزم مجاہد بندے وہاں جمے رہے، اور انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے، ایک رائے پور کی نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور ایک دیوبند میں، آپ کو معلوم ہوگا یہ رائے پور دیوبند مشرقی پنجاب کے ان اضلاع سے جہاں کشت و خون کا ہنگامہ گرم تھا، متصل ہیں، لیکن یہ اللہ کے بندے پورے عزم و استقلال کے ساتھ جمے رہے اور انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اسلام کو یہاں رہنا ہے اور رہے گا، انہوں نے کہا مسلمانوں کا یہاں سے نکلنا صحیح نہیں، اگر تم مشورہ چاہتے ہو تو ہم مشورہ دیتے ہیں اور اگر فتوے کی ضرورت ہے تو ہم فتویٰ دینے کو تیار ہیں کہ یہاں سے اس وقت مسلمانوں کا نکلنا درست نہیں۔

اس وقت جو ہندوستان میں اسلام و مسلمان قائم ہیں یہ انہیں بزرگوں کا احسان ہے، ہندوستان میں اس وقت جو مسجدیں قائم ہیں اور ان میں جو نمازیں پڑھی جارہی ہیں اور

پڑھی جاتی رہیں گی یہ ان کا طفیل ہے، ہندوستان میں جتنے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں اور ان سے جو فیوض و برکات صادر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے انہیں کے رہین منت ہوں گے، اور اس سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا، اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد صاحبؒ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا، ایمان آفریں اور ولولہ انگیز تقریریں کیں، اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ، اپنی تقریروں اور خود اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے، اسے اپنا ملک سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔

دور آخر:

یہ بات میں اور واضح کر دوں کہ مولانا کے بارے میں لوگوں کو یہ بڑا مغالطہ ہے کہ وہ موجودہ حالات سے کلی طور پر مطمئن تھے، قریب کے لوگ جانتے ہیں کہ مولانا کے سینہ کے اندر کیسا درد و سوز کیسے اسلامی جذبات اور کیسی دینی حمیت موجزن تھی، اور ان کے اندرونی احساسات کیا تھے، مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کو مولانا کے ان جذبات اور اندرونی احساسات اور امت اسلامیہ اور اس کے مسائل کے ساتھ گہرے تعلق اور درد و سوز کا اندازہ نہ ہو سکا، مولانا کی زندگی کا یہ پہلو جتنا روشن اور معروف ہونا چاہیے تھا روشن اور عام طور پر معروف نہ ہو سکا، آزادی کے بعد جو خلاف توقع حالات و تغیرات اس ملک میں پیش آئے، انہوں نے مولانا کی طبیعت کو بہت افسردہ کر دیا تھا ان کی عمر کا بہترین زمانہ اور ان کی بہترین قوتیں انگریزی حکومت کا مقابلہ کرنے میں صرف ہو چکی تھیں اور اس معرکہ میں وہ کامیاب ہو چکے تھے۔ اب ان کی ضعیفی افسردگی اور بے تعلقی کا زمانہ تھا، آخر میں ان کی تقریروں کا موضوع اور دعوت صرف ذکر کی تلقین کرنا، خاتمہ کی فکر کی طرف متوجہ کرنا، تعلق مع اللہ اور ایمان باللہ کو مضبوط سے مضبوط کرنا دینی شعائر کا احیاء، اور سنت نبویہ کی کثرت سے ترویج و اشاعت رہ گئی تھی۔

انہوں نے اپنے عالی مرتبہ شیوخ و اساتذہ سے تعلق مع اللہ، استقامت علی الشریعت اور باطنی مشغولیت کی جو دولت حاصل کی تھی، تمام اسفار و مشاغل و ہجوم خلائق درس و

تدریس کی مصروفیت اور آخر میں علالت کی شدت میں بھی وہ اسی میں مشغول تھے، اور روز بروز وہ ہر چیز پر غالب آتی جا رہی تھی، زندگی کے آخری ایام تک نماز کھڑے ہو کر اور با جماعت ادا کی، یہ ناچیز آخری بار ۲۰ نومبر کو یعنی وفات سے صرف گیارہ روز پہلے حاضر ہوا، سخت تکلیف اور بے حد ضعف تھا، یہ وہی دن تھا جس ڈاکٹر صاحب نے تفصیلی معائنہ کر کے یہ کہا تھا کہ مولانا صرف اپنی قوت ارادی سے زندہ ہیں، اور ہمارا فن اس علالت کے سامنے ناکام ہے، اس روز بھی مولانا نے ظہر کی نماز کھڑے ہو کر اور باہر آ کر جماعت کے ساتھ ادا کی مولانا کی خدمت میں جب حاضری ہوئی اور پوری بشاشت اور استقلال کے ساتھ گفتگو فرمائی، ایک کتاب کے پہنچنے کا ذکر کیا، میں نے عرض کیا مجھے معلوم ہوتا کہ علالت و ضعف اس درجہ تک پہنچ گیا ہے تو کبھی اس کے پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا، فرمایا کیوں! میں نے تو کئی صفحات کا مطالعہ کیا، اور نفس کتاب ہی بڑی نعمت ہے، اسی مجلس میں ایک مخلص نے جو باہر سے ملنے آئے تھے روتے ہوئے کہا کہ دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے، فرمایا نہیں، دنیا میں بہت لوگ ہیں! انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں دوسروں سے کیا تعلق؟ فرمایا ہمیں تو امت محمدی سے تعلق ہے۔

مولانا نے امت محمدی کی خدمت میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، انھوں نے اپنے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اور اپنے اسلاف سے جو امانت، اور ذمہ داری پائی تھی اس کو پورا کر گئے ان کو نہ ستائش کی تمنا ہے، نہ صلہ کی پروا، نہ مدح و توصیف کا انتظار ہے نہ ناسپاسی اور ناشناسی کا گلہ، وہ مسلمانوں کو خطاب کر کے کہہ سکتے ہیں:-

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

(الفرقان، لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۶ء)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے میری واقفیت اور تاثرات

مولانا محمد منظور نعمانی

غالباً ۱۳۳۸ھ کی بات ہے میں اپنے وطن سنبھل کے عربی مدرسے (مدرسۃ الشرع) میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا میری عمر اس وقت ۱۴ سال کی ہوگی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا نام میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا اس لیے قلب میں ان کی خاص عظمت تھی۔ اسی زمانہ میں یہ خبریں آئیں کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر عنقریب تشریف لانے والے ہیں، اگرچہ چالیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ مدرسہ کے سن رسیدہ مہتمم جناب منشی حمید الدین صاحب مرحوم (جن کو حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ سے بیعت وارادت کا شرف حاصل تھا) ایک دن مدرسہ تشریف لائے اور حضرات اساتذہ کو اپنی ایک تازہ نظم سنائی جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کی خوشخبری پر اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی نظم میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیقوں اور خاص خادموں کی حیثیت سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عزیر گل صاحب کا نام سنا۔

حضرت مولانا سے ابتدائی تعارف:۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لے آئے۔ غالباً یہ تشریف آوری رمضان مبارک ۱۳۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ شروع شوال میں جب عربی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے میرے والد ماجد نے آئندہ تعلیم کے لیے مجھے دہلی استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے ساتھ

بھیجنے کا فیصلہ فرمایا (مولانا مرحوم ان دنوں مدرسۂ عبدالرب دہلی میں مدرس تھے) مولانا نے نظام سفر اس طرح بنایا کہ پہلے اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لیے دیوبند جائیں گے اور پھر وہاں سے دہلی۔ مجھے بھی اس کی خوشی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت نصیب ہوگی اس زمانہ میں میرے وطن سنبھل اور مراد آباد کے درمیان ٹرین نہیں چلتی تھی اس لیے سنبھل سے مراد آباد تک سفر لاری سے ہوا مراد آباد پہنچ کر دیوبند کے لیے ٹکٹ خرید لیے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد مراد آباد کے ایک بزرگ سے حضرت استاذ کو یہ معلوم ہوگیا کہ حضرت شیخ الہندؒ آج ہی دیوبند سے فتح پور ہسوہ روانہ ہونے والے ہیں اس لیے اس وقت دیو بند پہنچ کر حضرت کی زیارت نہ ہو سکے گی۔ افسوس کے ساتھ خریدے ہوئے وہ ٹکٹ واپس کر دیے گئے اور دہلی کے ٹکٹ لے کر براہ راست دہلی روانہ ہوگئے۔ صبح کو جب ہم دہلی پہنچ کر مدرسہ عبدالرب میں داخل ہوئے تو وہاں فرش و فروش کا کچھ غیر معمولی اہتمام دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ اسی وقت تشریف لا رہے ہیں شام تک یہیں مدرسہ میں قیام رہے گا اور آج ہی یہاں سے فتح پور کے لیے روانگی ہو جائے گی استاذ مرحوم اور اس ناچیز کو بھی یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی دیر کے بعد حضرت اپنے رفقاء سمیت تشریف لے آئے۔ ناچیز کو بھی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا عزیر گل صاحب خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ تھے ان کی زیارت بھی سب سے پہلے اسی وقت ہوئی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا نام نامی سن چکا تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، دریافت کرنے پر کسی سے معلوم ہوا کہ مولانا اس سفر میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ نہیں ہیں۔

حضرت کی پہلی زیارت:

چند مہینے کے بعد (صفر ۱۳۳۹ھ میں) حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہوگیا۔ مالٹا سے

حضرت کی آمد پہ خلافت کی تحریک میں ایک دم وسعت اور طاقت پیدا ہو گئی، ملک بھر میں خلافت کے نام پہ جلسے اور کانفرنسیں ہونے لگیں۔ ہمارے وطن سنبھل میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں قریب قریب وہ سب بڑے علماء تشریف لائے جو خلافت کی تحریک میں اس وقت نمایاں اور پیش پیش تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ مدنی نسبت اور اسارت مالٹا کی وجہ سے ہر شخص کو دوسرے بزرگوں سے زیادہ حضرت مولانا ہی کی زیارت کا شوق تھا۔ کم عمری کے باوجود میرا بھی یہی حال تھا۔ حضرت مولانا کی پہلی زیارت اسی موقع پہ ہوئی، خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا جدھر کو نکلتے تھے مشتاقان زیارت کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ کی اپنی تقریر میں لوگوں کے اصرار پہ ان تکلیفوں مصیبتوں اور بربادیوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی تھی جن سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اہل مدینہ کو گزرنا پڑا۔ یہ واقعات ہر مسلمان کے لیے بہت دردناک تھے۔ مجھے اب تک اس تقریر کے خاصے اجزاء یاد ہیں۔

حضرت کی گرفتاری:

اس کے کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا گرفتار کر لیے گئے اور وہ تاریخی مقدمہ چلا جو کراچی کے مقدمہ کے نام سے مشہور ہے، اس قید سے رہائی کے بعد اپنی طالب علمی کے دور میں دوسری دفعہ مولانا کی زیارت مراد آباد کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب نجدی طاقت نے مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف حسین کو وہاں سے چلا جانا پڑا تھا، خبریں آ رہی تھیں کہ شریف حسین بعض یورپین طاقتوں سے مدد حاصل کر کے نجدیوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، اور اندیشہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یہ جنگ سرزمین حرم پہ ہو گی۔ جمعیت العلماء کے اجلاس میں ایک رزولیشن پیش کیا گیا تھا جس میں شریف حسین کے اس ارادے پہ ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا اور

مکہ معظمہ کی حرمت کے نام پر اس ارادہ واقدام سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی اس رزولیشن کی تحریک یا تائید کرتے ہوئے حضرت مولانا مدنی نے ایک بڑی بسیط تقریر فرمائی تھی اور مکہ معظمہ کی حرمت اور وہاں ہر قسم کے جنگ و جدال کی دائمی ممانعت سے متعلق حدیثوں کے متن اس قدر کثرت سے پڑھ کر سنائے تھے کہ دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اُس وقت میرا یہ احساس تھا کہ شاید ان کو حدیث کے دفتر کے دفتر حفظ ہیں اور اس وصف میں کوئی دوسرا عالم غالباً ان کا ہم پلّہ نہ ہوگا۔

دیوبند کی آمدورفت:

میرے لیے مولانا مرحوم کی زیارت اور تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع تھا، اگلے سال میں پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند چلا گیا، وہاں دو سال قیام رہا، حضرت مولانا مدنی کا مستقل قیام اس زمانہ میں غالباً سلہٹ رہتا تھا۔ لیکن دیوبند بار بار تشریف لانا ہوتا تھا، چنانچہ میرے دو سالہ قیام کے زمانہ میں کئی بار تشریف آوری ہوئی اور قریباً ہر دفعہ طلبہ اور مدرسین کے اصرار سے آپ نے تقریر بھی فرمائی، آپ کی تقریریں معلومات سے معمور ہوتی تھیں خاص طور سے ہم طلباء ان سے بہت فایدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بعض خاص تقریریں قلمبند بھی کی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند کی صدارت:

جس سال میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اسی سال کے ختم پر کچھ ایسے واقعات دارالعلوم میں پیش آئے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ صاحب نے دارالعلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرما لیا، اس وقت دارالعلوم کی صدارت تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو قبول فرما لیا، چونکہ دارالعلوم میں میری طالب علمی کا دور حضرت مولانا کی تشریف آوری سے پہلے ختم ہو چکا تھا اس لیے

مجھے باضابطہ تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گذشتہ ۳۰-۳۲ سال کی مدت میں دیو بند میں بھی اور باہر سفروں میں بھی خدمت میں حاضری اور رفاقت کی سعادت سیکڑوں بار حاصل ہوئی ــــ حضرت مولانا کی زندگی کے جن پہلوؤں سے اپنی ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بناء پر میں زیادہ متاثر ہوا اس وقت بغیر کسی خاص ترتیب کے میں انہیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

نماز کا امتیاز :

خالص دینی اعمال میں نماز سب سے زیادہ عام چیز ہے، اس لیے حضرت مولاناؒ جیسی کسی عظیم دینی شخصیت کی نماز کا ذکر شاید بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہو گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اگر کسی بندے کو نصیب ہو تو اس کو بندگی کا کمال نصیب ہوا اسی لیے نماز کو معراج المومنین کہا گیا ہے اور اسی لیے سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام عمال یعنی صوبوں کے افسران اعلیٰ کے نام بھیجے جانے والے ایک مراسلہ میں سب سے پہلی بات یہ لکھی تھی کہ اِنَّ اَھَمَّ اُمُوْرِکُمْ عِنْدِیْ اَلصَّلٰوۃُ (تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم اور دوسرے سب کاموں سے زیادہ اہتمام کی مستحق میرے نزدیک نماز ہے)

حضرت مولانا مدنیؒ کے ساتھ اور قریب کھڑے ہو کر جب کبھی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے ہیں جو ہم کو نصیب نہیں خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔

ادھر کئی سال سے حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا، خاص کر سجدے میں جانا اور سجدے سے کھڑا ہونا بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کا بھی دل دکھتا تھا لیکن اس تمام عرصہ میں

فرائض ہی نہیں بلکہ اوابین اور تہجد وغیرہ نوافل بھی ہمیشہ کے معمول کے مطابق طول قرأت اور طول قیام ہی کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس حالت کو ہم سخت تکلیف و مشقت سمجھ رہے ہیں ان کے لیے اسی میں راحت و لذت ہے ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اور "یا بلال ارحنی بالصلوٰۃ" والی کیفیت سے خاص حصہ ملا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع سنت

حدیث میں حقیقت ایمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے وابستہ بتلایا گیا ہے فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور خود اپنی ذات سے بھی زیادہ رسول اللہ صلعم سے محبت نہ ہو، اس کو حقیقت ایمان نصیب نہیں ہے اور حضور کی اس محبت کا لازمی نتیجہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت و محبت اور آپ کی سنتوں اور عادات و اطوار کے اتباع کا اہتمام اور شغف ہے۔

اس عاجز نے اس باب میں بھی حضرت مولانا کو بہت ممتاز پایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت مولانا کو جو خاص قلبی تعلق تھا جس کا ظہور اپنے موقع پر ہوتا رہتا تھا اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔

اسی طرح اتباع سنت کا اہتمام اور شغف، عبادات ہی میں نہیں بلکہ امور معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے۔ تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی۔۔ سنن نبویہ کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔ مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی۔ اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پہ گول ہوتا اور جس پہ

دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بناکر بیٹھتے سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتن میں پڑتے حتیٰ کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے رواج کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرماکر وہاں بھی مسنون طریقہ پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے سونے میں حتیٰ کہ لباس اور جوتا پہننے میں بھی طریقہ سنت کی پابندی فرماتے۔ اگر آپ کے تشریف لانے پر آپ کے نیازمند اور خدام تعظیماً کھڑے ہو جاتے (جیسا کہ آج کل کا عام دستور ہے) تو ناراضگی کا اظہار فرماتے بلکہ بعض اوقات اس اظہار ناراضگی میں برافروختگی بھی ہوتی۔ اور فرماتے کہ آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی۔

یہ روزمرہ کی چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرت اور عادت میں بھی سنن نبویہ کا اتباع آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری :-

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت مولانا کا جو مقام ہوگا اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت و جاہت، بلندی و برتری حاصل ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مولانا کو حاصل تھی۔ دارالعلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درسگاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے۔ ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع و عریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور فدائی، ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم

قربانیوں کے طفیل ملک کے اہل حکومت وسیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام۔ ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عاجز اس موقع پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لیے مضر ہو۔

کئی سال پہلے کی بات ہے حضرت کے ضعف پیری اور بعض دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر حضرت کے چند نیاز مندوں نے (جن میں یہ عاجز بھی شامل تھا) باہم مشورہ کر کے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اب صرف وہ سفر فرمایا کریں جس کی کوئی خاص ضرورت اور اہمیت ہو اور یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لیے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں، اور حضرت قبول فرما لیتے ہیں (اور اسی طرح ہر ہفتے میں جمعہ کے ایک دن کا سفر تو ضروری ہوتا ہے) یہ سلسلہ اب بند فرما دیا جائے، حضرت نے فرمایا میں کیا کروں لوگ آجاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں، عرض کیا گیا کہ اگر حضرت طے فرمالیں کہ اس سلسلہ کو بند کرنا ہے تو تھوڑے عرصہ تک تو ایسا ہوگا کہ لوگ آئیں گے اور حضرت کے انکار فرما دینے پر مایوس واپس چلے جائیں گے۔ اس کے بعد عام طور سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت نے اب یہ فیصلہ فرما لیا ہے تو پھر اس غرض سے لوگ آیا بھی نہیں کریں گے۔ فرمایا مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لیے اصرار کریں اور میں انکار پر جما رہوں، عرض کیا گیا کہ حضرت کی صحت اور حضرت کا وقت بہت قیمتی ہے اس کو صرف ضرورت اور موقعے ہی پر صرف ہونا چاہیے، حضرت نے خاکساری اور تواضع میں ڈوبے ہوئے لہجے میں فرمایا آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے یہ مٹی کا جسم ہے جب تک چل رہا ہے اس سے کام

سے لینا چاہیے۔

عزیمت یا شدت فی امر اللہ:

حضرت مولانا میں جہاں تواضع اور خاکساری اس درجہ کی تھی جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا وہیں بظاہر اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے پھر کسی کا کہنا سننا، کسی کا ساتھ دینا یا ساتھ نہ دینا، کسی کی رضامندی یا ناراضنگی کسی کی تحسین یا ملامت، حتیٰ کہ کوئی زلزلہ اور بھونچال بھی ان کو اس راستہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا ــــــ اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سلسلہ کی ان کی سرگرمیاں ہیں۔

ہندوستانی سیاسیات کے بارہ میں ایک رویہ کو صحیح سمجھ کر انہوں نے اپنا لیا تھا، جو لوگ دس بارہ سال پہلے کے واقعات بھولے نہیں ہیں انہیں یاد ہوگا کہ مولانا کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور عزت وآبرو تک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی حضرت مولانا کو اس زمانہ میں اتنا ہی زیادہ مضبوط، غیر متزلزل اور پر جوش پایا گیا۔

اس سیاسی میدان میں حضرت مولانا کے ساتھ علماء اور غیر علماء میں اور بھی بہت سے تھے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کی شان اس معاملہ میں بالکل نرالی تھی وہ جب کسی نجی مجلس میں بھی اس موضوع پر بات کرتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اپنے راستے کا ایسا یقین ہے اور وہ اتنے یکسو ہیں کہ دوسرے پہلو کو سننے اور سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور یہ کہ اس مسئلہ کا تعلق ان کے دماغ سے کہیں زیادہ ان کے قلب اور ان کی روح سے ہے۔ یہ میں نے ایک ایسے مسئلہ کی مثال دی ہے جس میں حضرت مولانا کی عزیمت اور شدت کا تجربہ قریب قریب

پورے اسلامی ہند نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی بہت سی ایسی مثالیں یاد ہیں کہ حضرت مولانا نے جس چیز کو حق اور جس رویہ کو اپنے لیے صحیح سمجھ لیا پھر ان کے خاص معتمد اور نیازمند بھی ان کو رویہ بدلوانے اور رُخ موڑنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے، الآیہ کہ رائے ہی میں کوئی تبدیلی ہو جائے۔ یہاں صفائی سے یہ بھی عرض کر دینے کا جی چاہتا ہے کہ ایسی ناکامیابی کا تجربہ ایک سے زیادہ دفعہ خود راقم سطور کو بھی ہوا ہے۔

ایثار و فیاضی اور مہمان نوازی:

ناظرین نے ایثار و فیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں لیکن حضرت مولانا کی ذات میں اس کا جو نمونہ دیکھا اس کی مثالیں تو پچھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی کم مل سکیں گی۔

مولانا کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافر خانہ یا مہمان خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی مولانا کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتے ــــ بیسوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پہ میرا محتاط اندازہ ہے کہ برس ہا برس سے مولانا کے یہاں مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ رہتا تھا۔ اگر کبھی صرف بیس پچیس ہوتے تو اسی طرح کبھی ساٹھ ستر تک بھی ہو جاتے تھے۔

حضرت مولانا دونوں وقت مہمانوں کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور سب مہمان وہی کھاتے تھے جو خود حضرت کھاتے تھے۔

اگر کسی مخصوص مہمان کے اکرام میں کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا مثلاً پلاؤ [illegible] یا قورمہ تیار کیا جاتا، یا دیوبند کی مشہور فیرینی آتی تو بلا استثناء سارے مہمان اس [illegible] ہی کھانا کھاتے اور میرا خیال ہے کہ ہفتے میں ایک دو دفعہ ایسا ضرور ہوتا تھا۔

جو لوگ حضرت کے حالات سے کچھ باخبر ہیں اور جنہوں نے حضرت کی عجیب و غریب اور بے مثال مہمان نوازی کا تجربہ کیا ہے ان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ روزمرہ کی اس مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری للّٰہی مدوں میں حضرت کے ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا، خود اپنی ذات پر اور اہل و عیال پر اس کا چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوتا ہوگا۔

کسی بندے کے ظاہری احوال و اعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قائم کرنے کا حق ہے اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شحّ اور حبِّ مال سے حضرت کے قلب و روح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ شاید اس کے غبار کا کوئی ذرّہ بھی وہاں نہیں رہا تھا اور انشاء اللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے۔

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (تغابن)	اور اللہ نے اپنے جن بندوں کو شح اور حبِ مال کی بُری خصلت سے بچا یا وہ یقیناً فلاح پانے والے ہیں۔

ایک واقعہ اس جگہ اور بھی سن لیجیے جس سے حضرت مولانا کی اس خصوصیت (یعنی ایثار و فیاضی اور دوسروں کی راحت رسانی کا فکر و اہتمام) کے علاوہ ایسی ہی بعض اور خصوصیات بھی آپ کو معلوم ہوں گی۔

غالباً ۴۳ھ (یا ۴۴ھ) کی بات ہے، سوامی شردھانند کی اٹھائی ہوئی شدھی سنگھٹن کی تحریک کے مقابلہ میں "جمعیۃ العلماء ہند" کا شعبۂ تبلیغ میدان میں اترا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے تبلیغی وفود کے ذریعہ وقتی و دفاعی کوششوں کے علاوہ اُن علاقوں میں جو شدھی تحریک کا خاص میدان بنے ہوئے تھے، مذہبی مکاتب قائم کرنے کا ایک ٹھوس مستقل اور وسیع کام بھی، جس کے لیے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ جمعیۃ العلماء ہند اور اکابر دیوبند سے تعلق رکھنے والے رنگوں کے صاحبِ خیر تاجروں نے اس

سلسلہ میں مالی امداد کا ایک منصوبہ تیار کیا اور جمعیت العلماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی، اس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا ــــ یہ وفد رنگون پہنچا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اس وقت جمعیۃ کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے ــــ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہل رنگون ہی کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ (شدھی سنگھٹن کے مقابلہ میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے بھی مستقل کام ہو رہا تھا)

بہرحال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے ــــ صوبہ برما کے اس وقت کے انگریز گورنر نے یا اس کی ہدایت پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں ان میں ایک آدمی مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں اس لیے ان کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے اس لیے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے۔ لیکن اس نے کہا، نہیں ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں اس لیے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بالآخر ان سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں بھی خاص وقار رکھتے تھے) اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی، تب اس نے اجازت دی۔

ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرت کے سامنے بھی ذکر کر دی، حضرت نے فرمایا آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کیے بغیر وعدہ کر آئے۔ یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ

کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا، لیکن اب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تقریر کروں اور گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں، لہذا آپ حضرات کے لیے اب یہی بہتر ہے کہ میں تقریر نہ کروں، اور واپس چلا جاؤں لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، آخر میں انھوں نے عرض کیا کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہو گی اور جو حضرت کا جی چاہے وہی فرمائیں پھر جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا ــــ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے کہ کہیں یہ بیچارے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے، آخر میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی ان کی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرت اس بات پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرما دیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس کے بعد میں کوئی تقریر نہیں کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤنگا حضرت مولانا نے (انہیں کی خیر خواہی کے لیے) اس شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادل ناخواستہ ماننا پڑا ــــ وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا حضرت مولانا نے خطبہ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی، کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرہ کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا چاہا تھا اور وہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا، مجھے ان کے اس وعدے کا افسوس ہے لیکن بہر حال اب مجھے ان کے وعدے کی لاج رکھنی ہے، اگر وہ یہ وعدہ نہ کر آتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں خطرناک سمجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے، میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے ــــ بیان کرنے والے کا بیان ہے۔ کہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر ہمارے میزبان وعدہ نہ کر آتے تو میں یہ بتاتا اور یہ بتاتا ــــ آخر میں فرمایا کہ چونکہ ہمارے

محترم میزبانوں نے گورنر صاحب سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا اس لیے میں مجبور ہو گیا ہوں اور میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہتا۔ پھر چند کلمات وفد کے مقصد کے متعلق بھی کہہ کر تقریر ختم فرمائی۔

عنداللہ مقبولیت کی ایک خاص نشانی:

بعض حدیثوں میں اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اس یاد کے لیے جس ایمانی مناسبت اور جس توفیق کی ضرورت ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں ان کا تو ذکر نہیں لیکن جن کو اللہ نے اس خیر سے محروم نہیں کیا ہے اُن میں سے جس کو بھی حضرت سے قریب ہونے اور خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہو گا۔ یقین ہے کہ اس کو اس کا تجربہ ضرور ہوا ہو گا کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کو دیکھ کر دل میں خدا کی یاد اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی۔ خود اپنے بارے میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ بہت سے امور میں میری رائے حضرت سے متفق نہیں ہوتی تھی اور رائے ہی خاصا بعد ہوتا لیکن جب خدمت میں حاضری ہوتی تو یہ یقین تازہ ہو جاتا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں میں سے ہیں اور مجھ جیسوں کے لیے ان کی جوتیاں صاف کرنا اور قدموں کا غبار جھاڑنا بھی سعادت ہے۔

اللہ تعالیٰ اُن کی روح پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کے ان ایمانی اوصاف کے ورثہ سے ہم کو محروم نہ رکھے۔ (الفرقان، لکھنو۔ جنوری ۱۹۵۸ء)

مولانا سید حسین احمد مدنی،

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

کل شیئ ھالک الا وجھہ

آہ! کیوں کر کہیے کہ فلک علم و فضل کا آفتاب درخشندہ غروب ہو گیا۔ بزم انس و قدس کی شمع فروزاں گل ہو گئی۔ درج تقویٰ و طہارت کا لعل شب چراغ گم ہو گیا۔ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کا محرم جاتا رہا۔ اخلاق و مکارم اسلامی کے ایوان میں خاک اڑنے لگی۔ جو کل تک لاکھوں انسانوں کے لیے طبیب عیسیٰ نفس تھا خود وہ موت کی آغوش میں جا سویا ملت بیضا کا سہارا، فرزندانِ توحید کی امیدوں کا مرجع، پیروانِ دین محمدی کی تمناؤں کا مرکز، الٰہی ملک عدم ہو گیا۔ یعنی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے ۵/ دسمبر کو بمقام دیوبند سہ پہر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حضرت مولانا کی وفات ایک فرد، ایک شخص اور ایک انسان کی موت نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص دور ایک عہد اور حیات ملی کے صحیفہ کے ایک باب کا اختتام ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت شیخ الہند نے اپنے مقدس ہاتھوں سے جو چمن لگایا تھا مولانا اس چمن کی آخری بہار تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ اور مولانا نانوتوی نے شریعت و طریقت، علم و عمل اور تقدس و طہارت کی جو بزم سجائی تھی اجل کی بادصرصر اس کے چراغ بجھاتی رہی مگر ساتھ ہی چراغ سے چراغ بھی روشن ہوتے رہے اور بزم کبھی تاریک نہیں ہوئی۔ لیکن اب اس بزم کا آخری چراغ بجھ گیا۔ روشنی کی جگہ ظلمت نے لے لی۔ تاریکی چھا گئی اور بزم کی بساط الٹ گئی۔

اسلام میں اعلیٰ اور مکمل زندگی کا تصور یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ساتھ فکر و نظر کی بلندی اور جہد و عمل میں پختگی اور ہمہ گیری ہو اور یہ سب کچھ تعلق باللہ کے واسطہ سے ہو۔

مولانا اس دور میں اس معیار پر جس طرح پورے اترتے تھے ہندو پاک تو کیا پورے عالم اسلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ علم و فضل کا یہ عالم کہ اسرار و غوامض شریعت اور طریقت ہر وقت ذہن میں مستحضر کسی سائل نے کوئی مسئلہ پوچھا نہیں کہ معلومات کا سمندر ابلنے لگا۔ چناں چہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی طرح حضرت مولانا کے مکتوبات بھی جو کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور جو سب کے سب بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ علم و فضل اور حکمت ربانی کا گنجینہ ہیں۔ علوم شریعت و تصوف کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور سیاسیات کا خاص ذوق اور ان کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ بین الاقوامی سیاسیات حاضرہ اور علی الخصوص مشرق وسطیٰ اور ممالک عربیہ کی سیاسیات پر بڑی گہری اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے اور اس پر برابر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ گذشتہ سال کلکتہ میں ناگا قبائل کا تذکرہ آگیا تو مولانا نے ان قبائل کی تاریخ اور ان کی جغرافیائی پوزیشن پر اس قدر عالمانہ اور مبصرانہ تقریر کی کہ سننے والے حیران رہ گئے۔

عربی زبان خالص عربی لب و لہجہ میں بولتے اور گھنٹوں اس میں برجستہ تقریر کر سکتے تھے ترکی زبان سے واقف اور مگدھی زبان سے آشنا تھے۔ اس زبان کے بعض گیت اور اشعار یاد تھے۔ سلوک و معرفت میں یہ حال تھا کہ لاکھوں مسلمانوں نے تجلیہ باطن کا فیض حاصل کیا۔ اور روحانی مقامات طے کیے۔ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی نے ایک مرتبہ عالم جذب میں مولوی ظہیر الحسن ایم۔ اے کاندھلوی مرحوم سے خود ان کے مکان پر فرمایا کہ میاں ظہیر! لوگوں نے مولانا حسین احمد کو پہچانا نہیں۔ خدا کی قسم ان کی روحانی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس طاقت سے کام لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ عالم اسباب ہے اس لیے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس غرض کے لیے ان کو وہی طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں۔

جہد و عمل کے میدان میں مولانا کی زندگی سر تا پا ارباب عزیمت کی زندگی تھی۔ مالٹا کی اسارت سے لے کر ملک کی آزادی کے حصول تک یہ زندگی جو ورع و تقدس کی مکمل آئینہ دار تھی ہمیشہ

دار و رسن کے خطرات سے کھیلتی رہی، مصائب و آلام، اور شدائد و محن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اُن کا مذاق اڑاتی رہی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتبِ خیال کے ایک فرد فرید ہونے کی حیثیت سے اپنے مرشد حضرت شیخ الہند کے ساتھ مولانا نے حریت و استخلاص وطن کی راہ میں دار و رسن کو اُس وقت لبیک کہا جب کہ ابھی کانگریس کی زبان کامل آزادی کے لفظ سے آشنا بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس راہ میں طوفان آئے، زلزلے آئے، بجلیاں کوندیں، بگولے اٹھے، کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے لیکن یہ مرد حق آگاہ و حق پرست اپنے مقام پر کھڑا رہا اور اس کے پائے ثبات و استقلال میں ذرا جنبش نہ ہوئی۔ سیاسیات میں اس درجہ عملی انہماک و توغل کے باوصف جس کا مقصد وحید بھی دین قیم کا احیا اور اعلاءِ کلمۃ اللہ تھا، ظواہر شریعت میں تقشف اور سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ اُس مجلس نکاح میں شرکت نہیں فرماتے تھے جس میں عام رسم و رواج کے مطابق دھوم دھڑ کا، شاندار دعوت، مسرفانہ رسوم اور حضرت فاطمہؓ سے زیادہ مہر باندھا جاتا ہو۔ اگر حسن ظن کی بنا پر کسی ایسی مجلس میں شریک ہو بھی گئے تو جونہی کوئی ایسی بات علم میں آئی فوراً سخت غیظ و غضب کے ساتھ مجلس سے اٹھ کر چلے آئے۔ نشست و برخاست، کھانا پینا، وضع قطع ہر چیز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن عادیہ تک کا اتباع کرتے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے تھے۔ دینی اور ملی معاملات کے علاوہ نجی زندگی میں حد درجہ خوش مزاج، خندہ جبیں اور شگفتہ طبع تھے۔ جہان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ دونوں وقت کھانے پر اور ناشتہ پر لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ اُن کو کھلا کر قلبی راحت اور سکون محسوس کرتے تھے۔ متواضع اور منکسر المزاج اس درجہ کہ بس عجز و تواضع اور انکسار کا اس سے بڑھ کر تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں مولانا کے بعض واقعات ایسے ہیں کہ قلم کو ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔

مولانا جامعیت کمالات و اوصاف کے اعتبار سے بے شبہ شیخ العرب و العجم تھے۔ وہ خود تو ۸۰ برس کی عمر میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے جس کے لیے کم و بیش پانچ ماہ سے ان کی روح ہر وقت بے چین اور مضطرب تھی لیکن عالم اسلام یتیم ہو گیا۔ مولانا کی وفات ملت بیضا کے لیے ایک سخت اور عظیم حادثہ ہے جس کی تلافی کی بظاہر مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں۔ نوّر اللہ مرقدہ و برّد مضجعہ۔

حضرت مولانا حسین احمد مرحوم سے میری ملاقات،

ڈاکٹر محمد اشرف

کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک راسخ العقیدہ کمیونسٹ ایک حنفی المذہب عالم دین کے بارے میں لکھے اور پھر عالم دین بھی حضرت مولانا حسین احمد جیسے مرتبہ کا جو بیک وقت دارالعلوم دیوبند جیسی بلند پایہ درسگاہ کا شیخ الحدیث اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا ممتاز رہنما رہا ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ کمیونسٹ بھی اسی مخصوص دور کی پیداوار ہیں جس میں علمائے دین محراب و منبر چھوڑ کر دار و رسن کا سبق دہراتے ہیں اور اس اعتبار سے بقول غالب ع

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اتفاق یہ کہ میری دیوبند اور حضرت مولانا حسین احمد سے یہ نسبت دور کی نہیں بلکہ قریب کی ہے مگر اس کی تشریح کے لیے مجھے خود اپنے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہنا پڑے گا۔ میری عمر غالباً ۱۲ برس کے قریب ہو گی کہ مراد آباد مسلم اسکول کے ایک استاد مسمی اصطفا کریم نے مجھے کلام پاک کا درس دینا شروع کیا۔ ابتدا پارہ عم یا سورۂ بقرہ سے نہیں بلکہ سورۂ صف اور سورۂ جمعہ سے ہوئی اور درس کا منشا محض اس قدر تھا کہ میں جہاد کی تعلیم اور جدوجہد آزادی کے سلسلے میں اپنے فرائض سے باخبر ہو جاؤں۔ اسی مقصد کے لیے تھوڑے دن بعد ایک خفیہ جماعت "حزب اللہ" کے نام سے بنی اور میں نے اس میں شریک ہو کر جہاد کا حلف لے لیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اصطفا کریم صاحب نے علی گڈھ سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد نظارۃ المعارف القرآنیہ، دہلی میں مولانا عبیداللہ صاحب سے تفسیر قرآن کا درس لیا تھا اور یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی سیاسی تحریک سے وابستہ ہیں۔ یوں سمجھیے کہ حضرت مولانا حسین احمد سے بھی میرا بالواسطہ غائبانہ تعارف ہو گیا۔ بالآخر جنگ عظیم کے بعد حضرت مولانا محمود حسن مالٹا سے ہندوستان واپس آئے اور جب تحریک

ترک موالات کی ابتدا میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالنے کے لیے علی گڑھ کالج وارد ہوئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس کے بعد جامعہ کی زندگی میں مجھے خواجہ عبدالحی کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جو اصطفا کریم صاحب کی طرح مولانا عبیداللہ کے شاگرد رہے تھے۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ خواجہ صاحب کی تفسیر قرآن کی ترتیب و اشاعت بھی میرے ذمہ تھی۔ ۱۹۲۸ء میں وکالت کے خیال سے جب میں اپنے راجپوت عزیزوں کے پاس ضلع مظفرنگر پہنچا تو مجھے حضرت مولانا حسین احمد کے بعض عقیدت مندوں سے مولانا کی زندگی کے حالات معلوم ہوئے۔ شاید کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ مرحوم نے بچپن سے ہی جہاد کی تیاری سے شروع کر دی تھی اور نوجوانی میں ان کا معمول تھا کہ مئی جون کی تپتی دھوپ میں گھنٹوں ریت یا پتھر کے فرش پہ چلا کرتے تھے اور جاڑوں کی کڑاکے کی سردی میں نیم برہنہ بیٹھے رہتے۔ بعض دوستوں نے جب اس لاابالی پن کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آئندہ جیلوں میں اس سے زیادہ سختیاں بھگتنی پڑیں گی غرضیکہ مجھے مولانا مرحوم کے فضائل کا علم ہو گیا مگر ابھی تک ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔

۱۹۴۶ء میں جب میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر اور صوبہ متحدہ کانگریس کی مجلس عاملہ کا رکن منتخب ہوا تو مولانا حسین احمد کو ایک رفیق کار اور ساتھی کی حیثیت سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلمانان ہند کی زندگی میں اس سے زیادہ صبر آزما دن کم آئے ہوں گے جب عملاً بے دین اور اعلانیہ بدعقیدہ علماء دین کے احتساب کے لیے متعین ہو گئے تھے اور مسلم لیگ کے دفتر سے اسلام کی سند تقسیم ہوا کرتی تھی چنانچہ وہ بزرگ جو برطانوی اقتدار مٹانے کے لیے کانگرس میں شریک ہوئے تھے اب مسلم لیگی رہنماؤں کی نگاہ میں غدار اور مجرم قرار پائے ہم جیسے نام نہاد مسلمانوں کو اس قسم کے طعن و تشنیع سے واسطہ ذرا کم تھا کہ گو کانگریس کے رابطہ عوام کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے ادبہ بھی فرد جرم لیگ کی سرکار سے قائم ہو چکی تھی) مگر حسین احمد کا جگر دیکھیے کہ آئے دن ان ابوجہلوں کے ہاتھوں اذیتیں اٹھاتے تھے، مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس آزمودہ کار مجاہد کے پائے ثبات میں لغزش آئے مجھے حضرت مولانا کے ساتھ صوبوں کے ضمنی انتخابوں میں کام کرنے کا موقع ملا جب مسلم لیگی حضرات

کی نگاہ میں ایمان سے زیادہ ووٹ کی قیمت تھی اور ہمارے باہمی اختلافات مباحثہ، مناظرہ یا مجادلہ سے بڑھ کر کبھی کبھی مقاتلہ کی منزل تک پہنچ جاتے تھے چنانچہ لبسا اوقات مسلم لیگی "مجاہدوں کے حلقوں میں حضرت مولانا کے قتل کے منصوبے بھی بنائے گئے اور حافظ ابراہیم کے انتخاب میں کئی عزیز مسلم لیگ کے ہاتھوں زخمی ہو گئے مگر حسین احمد کی زبان سے کبھی اُف نہ نکلی اور اس نے ان حضرات کے حق میں صرف ہدایت کے لیے خدا سے دعائیں مانگیں سبھے آزمائش کی ان گھڑیوں میں حضرت مولانا حسین احمد کا عزم و استقلال ان کا سکون و صبر، ان کا بے مثال تحمل ہمیشہ یاد رہے گا میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک ہم نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا حال صرف کتابوں میں پڑھا تھا اب بلال و عمار کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق البتہ مجھے اب تک نصیب نہ ہوا تھا۔

۱۹۴۶ء میں یہ خوش نصیبی بھی میسر ہوئی ہوا یہ کہ جب مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ لگایا اور مسلمان عوام کا عام رجحان مسلم لیگ کی طرف ہو گیا تو کمیونسٹ پارٹی کو اس مسئلے کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر سوچنا پڑا اور مجھے اس کام پر مقرر کیا گیا کہ اس کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کروں میں اس مواد کی فراہمی کے سلسلے میں دیوبند بھی حاضر ہوا بلکہ حضرت مولانا کی دعوت پر خود ان کے مہمان خانہ میں فروکش ہو گیا۔ محراب و ممبر کے جلوے تو میں نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے "خلوت" کے مطالعہ کا موقع اب ملا۔

جنگ عظیم کے بعد اشیاء کی گرانی مولانا کی قلیل آمدنی، بلیک مارکیٹ کا زور مگر اس سے حضرت مولانا کی مہمان نوازی میں کیا فرق آسکتا تھا اور جب مجھ جیسے نسبتاً انجان اور بے دین کو مولانا نے باصرار اپنے مکان میں ٹھہرایا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سیاست، رشتہ داری، دوستی اور درس و تدریس کے واسطے سے مہمانوں کا کیا ہجوم رہتا ہوگا جب میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو ۱۸ مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا چنانچہ میں نے بھی مہمانوں کے بڑے کمرہ میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا دینداروں کے معمولات سے میں یوں بھی

گھبراتا ہوں مگر پہلے دو دن میرے اوپر واقعی بڑے سخت گذرے نماز پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا مگر مولانا کے یہاں تقریباً سب "قائم اللیل" تھے کیفیت یہ کہ عشاء کی نماز کے بعد میں بہ مشکل گھنٹے بھر سویا ہوں گا کہ کسی کونہ سے تکبیر بالجہر بلند ہوئی میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی ذکر خفی میں منہمک ہے تو کوئی تسبیح و وظیفہ میں تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لیے اُٹھ بیٹھے، پھر فجر سے پہلے اور بعد قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی نذر ہوئی تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو یا نہ ہو مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو چلا ہے۔ حضرت نے تبسم فرمایا اور تیسرے دن سے مجھے ایک علیحدہ اور آرام دہ کمرہ مل گیا یعنی اب میں اسی آزادی سے اپنے کمرہ میں رہتا تھا جو مجھے اپنے گھر حاصل تھی چنانچہ میں نے مواد کی فراہمی کا وہ کام جس کے لیے میں حاضر ہوا تھا شروع کر دیا اور اس سلسلے میں مجھے دیو بند کی مجاہدانہ تاریخ کے بہت سے نئے واقعات کا علم ہوا۔

دیو بند کے قیام کی غالباً چوتھی شام تھی کہ میں اپنے بستر پہ دراز تھا رات کے دس بج چکے تھے گھومنے پھرنے کی وجہ سے کچھ تھکن زیادہ تھی چنانچہ لیمپ گل کیا اور سونے لگا۔ دروازہ کھلا رہتا تھا مجھے کچھ غنودگی سی تھی کہ میں نے ایک ہاتھ اپنے ٹخنہ پہ محسوس کیا پھر دونوں ہاتھوں سے کسی نے میرے پاؤں دبانا شروع کر دیے میں چوکنا ہو گیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا بہ نفسِ نفیس اس گنہگار کے پاؤں دبانے میں مصروف ہیں، میری بدحواسی، حیرانی اور شرمندگی کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں میں نے پاؤں جلد جلد سکوڑے اور بڑے ادب اور لجاجت سے حضرت کو روکا مولانا نے اس پہ حسرت سے فرمایا کہ "آپ مجھے اس ثواب سے کیوں محروم کرتے ہیں، کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ آپ جیسے مہمان کی خدمت کر سکوں"، مجھ پہ اس ارشاد کے بعد جو گزری میرے لیے اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ میں بارہ برس بعد آج پہلی بار اس واقعہ کا انکشاف کر رہا ہوں اور اگر حضرت زندہ ہوتے تو اس راز کو

فاش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی ان کی فراخ دلی اور ان کے اخلاق کا یہ ادنیٰ نمونہ تھا۔

دوسرے دن حضرت نے دن کا اکثر حصہ میرے ساتھ بسر کیا اور سہ پہر کو حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی قبر پہ فاتحہ کے لیے لے گئے قبر کے ارد گرد اس وقت ایک دو بکہ یاں چہ رہی تھیں کسی قسم کا کوئی امتیازی نشان یا پختہ تعمیر قبر پہ یہ بتایا جاتا کہ صاحب قبر کون ہے مجھے اس کا گمان بھی نہ ہوتا کہ بانیٔ دارالعلوم یہاں دفن ہیں۔ میں بڑی دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا اور جب تسکین نہ ہوئی تو دوسرے دن اکیلا پھر حاضر ہوا۔

حضرت شیخ سے میری ملاقات

وفات سے چند ماہ قبل میں سوویٹ روس کے چند عالموں کے ساتھ دیوبند مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا یہ آزادی کا زمانہ تھا مگر اس آزادی کے ساتھ تقسیم وطن کی لعنت بھی آئی تھی۔ صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع میں (یعنی جہاں دیوبند واقع ہوا ہے) تقسیم وطن کے معنی مسلمانوں کی تباہی و بربادی، بلکہ کہیں کہیں قتل و غارت کے تھے اور ہر نوع جو طبقہ دیوبند کی پشت پناہ تھا وہ اقتصادی اعتبار سے مفلوج ہو گیا۔

حضرت مولانا یوں بھی خاموش طبیعت تھے مگر اس زمانہ میں میں نے انہیں کسی قدر مغموم پایا وہ میری نجی پریشانیوں، انگلستان کے میرے قیام اور میری علالت سے باخبر تھے چنانچہ دیر تک میری صحت اور خانگی حالات کے بارے میں دریافت فرماتے رہے میں نے ازراہ مزاج پوچھا کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے صرف حکومت برطانیہ کی امداد لینے سے دارالعلوم کو منع کیا تھا، آپ نے اپنی آزاد حکومت ہند کے اعزاز کو قبول کرنے سے کیوں انکار فرمایا، تبسم فرماکر خاموش ہو گئے میں البتہ اس تبسم کی تلخیاں محسوس کر رہا تھا۔

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست
او ہمی کار رنگ و بو داند!!

دیوبند جانے کا مقصد دراصل روس کے مشہور مستشرق سٹرڈیاکوف کو

حضرت مولانا سے ملا تھا، ویا کوف پہلی بار ہندوستان آئے تھے مگر اردو فصیح بولتے تھے چنانچہ انہوں نے اردو میں دیوبند میں تقریر بھی کی ہم جب شام کو لوٹنے لگے تو حضرت نے "نقش حیات" کا ایک نسخہ مجھے عطا فرمایا اور سینہ سے لگا کر رخصت کیا۔ میں نقش حیات کو اب جب کبھی تبرکاً پڑھتا ہوں تو ہندوستان کی پرانی اور حالیہ تاریخ کا ایک پورا مرقع میری آنکھوں کے سامنے سے پھر جاتا ہے اور جنگ آزادی کی صف میں حضرت مولانا کو میں حضرت اسمٰعیل شہید، مولوی احمد اللہ، مہاتما گاندھی، مولانا محمود حسن، عبیداللہ سندھی، حسرت موہانی، سردار بھگت سنگھ جیسے انقلابی مجاہدوں کے ساتھ پاتا ہوں ہم کمیونسٹ بھی ان ہی روایتوں کے وارث ہیں اور ان کی جانب سے میں بھی اس موقع پر عقیدت کی ادنیٰ نذر پیش کرنا چاہتا ہوں یہ چند سطریں اسی لیے ارسال خدمت ہیں ؎

مسافرانِ طریقت ز من جدا مشہور
کہ دور بیتم و چشمم بہ منزل افتادہ است

مولانا مدنی اور ان کا اخلاق:
جیل کی زندگی کی چند جھلکیاں،

سیتارام جی سوکل

شیخ الہند جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی مرحوم کے قدموں پہ بیٹھ کر کام کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے نہ صرف قدموں پہ بیٹھنے کا بلکہ جیل میں بھی ساتھ رکھ کر کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس تجربہ کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مدنی کی وفات سے نہ صرف ہندوستان اور ایشیا کا بلکہ دنیا کا بہت بڑا آدمی کھو گیا۔

آپ ان محب وطن افراد میں سے ایک ہیں کہ جنہوں نے ملک کی آزادی کے لیے ۱۹۰۷ء کے پہلے سے ہی ہندوستان کے آزاد کرانے کی کوشش کی ۱۹۱۴ء میں جب دنیا کی پہلی جنگ ہوئی تو آپ مالٹا میں نظر بند کر دیے گئے تھے۔

جیل میں مجھے بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ لیکن ان میں سے جنہوں نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ان میں مولانا مدنی اور گنیش شنکر ودیارتھی تھے ۱۹۴۳ء کی بات ہے نینی جیل میں جب یہ خبر آئی کہ تحریک فیل ہونے کے باوجود مہاتما گاندھی نے اپنے ۹/ اگست والے رزولیوشن کو واپس نہیں لیا۔ تو بڑے بڑے دیش بھگتوں کا چہرہ اداس ہو گیا۔ لیکن مولانا مدنی صاحب مسکرائے۔ اور کہا مہاتما جی نے ٹھیک کیا کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ کسی جیل میں میری قبر بن جائے گی انہیں دنوں ہم لوگ نینی جیل میں سرکل نمبرہ میں رہتے تھے۔ چونکہ سیاسی قیدی بہت سے چھوٹ چکے تھے۔ ان سب کی رائے ہوئی کہ ہم سب نمبرا کے سرکل میں چلے جائیں تو سیاسی قیدیوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور دن اچھی طرح سے کٹیں گے تو مولانا صاحب نے فرمایا ٹھیک تو ہے مگر جیل والوں سے میں استدعا نہ کروں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ پر ساتھیوں میں اختلاف رائے ہوا اور سب لوگ سرکل نمبرا میں چلے گئے۔ اور اکیلے مولانا کے رہنے کی نوبت آئی اس وقت

میں نے کہا کہ میں مولانا کو اکیلا چھوڑ کر بہشت میں بھی جانا پسند نہ کروں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سیاسی قیدیوں کے لیے جیل والوں کو سرکل نمبرہ میں دو سپاہی اور دو نمبردار رکھنا پڑتے تھے۔ اس لیے ان جیل والوں نے مولاناؒ سے استدعا کی کہ آپ لوگ سرکل نمبرا میں چلے جائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ تب ہم دونوں آدمی خوشی خوشی سرکل نمبرا میں چلے گئے۔

"بھائی بھائی برابر ہیں یہ کہتے ہوئے بہتوں سے سنا ہے لیکن برابری کا برتاؤ صرف مولانا کو کرتے دیکھا ہے کھانا پکاتے وقت باورچی باورچی رہتا تھا۔ اور آپ مالک رہتے تھے لیکن کھاتے وقت باورچی اور مالک ایک ہوتے تھے یہی نہیں صرف ایک پاؤ گوشت مولانا کو ملتا تھا۔ لیکن کھانے کے وقت جو بھی آکر بیٹھ جائے۔ اس کو کھانے میں حصہ مل جاتا تھا۔ جیل کی میعاد نہیں تھی۔ یہ پتہ نہیں تھا کہ جیل میں کب تک رہنا پڑیگا لیکن اگر کوئی معمولی قیدی کھانے کے وقت آگیا تو اس کا کھانا اور اپنا کھانا ملا کر اس کو اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ تندرستی گرنے لگی تو میں نے جیل کے ڈاکٹر سے کہا کہ مولانا اپنا کھانا تقسیم کر دیتے ہیں اس لیے تندرستی گرتی جا رہی ہے تو انہوں نے پہلے تو یہ کہا کہ میں کیا کروں قاعدہ یہی ہے۔ ان کو صرف پاؤ بھر گوشت مل سکتا ہے۔ لیکن دوسرے دن آکر وزن کیا اور تندرستی گرتے ہوئے دیکھ کر پاؤ بھر گوشت اور بڑھا دیا۔ اس کے مطابق مولانا کا خرچ اور بڑھ گیا اور لوگ بھی کھانے میں شریک ہونے لگے۔

ایک روز ایک قیدی نے آکر فریاد کی کہ نماز پڑھتے وقت میرے پاس فلاں قیدی بھی تھا اس نے میری اٹھنی چرالی کیونکہ اس وقت جیل کی اٹھنی روپے کے برابر تھی۔ مولانا نے کہا میں کیا کروں میں بھی تو تمہاری طرح قیدی ہوں۔ لیکن جب اسے زیادہ رنجیدہ دیکھا تو اپنے پاس سے اٹھنی دے کر رخصت کیا۔ اسے دیکھ کر میں نے مولانا سے برجستہ عرض کیا کہ اب میں آپ کے ساتھ اس بیرک میں نہ رہوں گا کیونکہ آپ کا اخلاق اتنا وسیع ہے اگر میں تھوڑے دن اور رہا تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ تم تو بہت دن سے مسلمان ہو تم کیا مسلمان ہو گے۔

جیل میں سیاسی قیدی گرمی کے مہینے میں جان بوجھ کر دیر میں بند ہوتے تھے۔ جس سے

جیل والوں کو تھوڑی سی پریشانی ہوتی تھی، لہذا ان لوگوں نے سیاسی قیدیوں کے بیرک کو دیر میں کھولنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ گرمی کے مہینے میں پاخانہ خالی نہ رہنے کی وجہ سے ۸ بجے صبح تک بھنگی نہیں جانے پاتا تھا جس سے سیاسی قیدیوں کو پریشانی اٹھانا پڑتی تھی۔ اس پریشانی کو دیکھ کر میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آج میں اس بیرک میں بند ہوں گا اور سیاسی قیدیوں کا پاخانہ خود صاف کروں گا۔ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ میں بھی چلوں گا تم اکیلے کیوں جاؤ۔ میں نے کہا کہ میرے ہی جانے سے جیل والوں کی عقل ٹھیک ہو جائے گی آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یوں تو دنیا ہے جو آتا ہے ضرور جاتا ہے لیکن بڑے آدمی کے جانے سے ہر ایک کو تکلیف ہوتی ہے لہذا اس کی دوا یہ ہے کہ ایسے بڑے آدمی کی یادگار بڑی سے بڑی قائم کی جائے۔ ان کا فوٹو تو ملے گا نہیں لیکن اگر کہیں مل جائے تو، دہلی، لکھنؤ، ٹانڈہ میں ان کا اسٹیچو لگایا جائے۔ ان کی لائف اور سوانح عمری لکھوا کر ہندوستان کی ہر زبان میں بٹوائی جائے اور اگر ممکن ہو تو بچوں کے کورس میں شامل کیا جائے۔ دیوبند مدرسہ کی مناسب مالی امداد کی جائے تاکہ ان کا لگایا ہوا درخت ہمیشہ نہ صرف ہرا بھرا رہے بلکہ پھولتا پھلتا بھی رہے جس کی خوشبو سے ساری دنیا کو فائدہ پہنچتا رہے۔ ان کو یاد کر کے آنسو آتے ہیں۔ اس لیے اب اس سے آگے قلم نہیں چلتا۔

لہ سوکل جی نے حضرت کی یادگار کے سلسلے میں اسٹیچو نصب کرنے کی جو رائے دی ہے تو وہ رسم دنیا کے مطابق درست سہی لیکن حضرت علیہ الرحمۃ کے ذوق و اخلاص سے اس کا کیا تعلق! پھر اسٹیچو کے قیام و نصب کے جواز کا مسئلہ بھی تھا۔ اس لیے اس رائے کی تائید نہ کی جا سکتی تھی۔ حضرت کے اخلاص نے تو پدم بھوشن کے خطاب کو بھی گوارا نہ فرمایا کہ اس میں صلے، ستائش اور دنیاوی اغراض و اعتراف خدمت کا جذبہ شامل ہوتا ہے اور حضرت نے جو ملک و قوم کی خدمت انجام دی تھی وہ صرف انسانی فرض سمجھ کر انجام دی تھی اور اس کا اجر ان کے خدا کے پاس تھا اور دنیا کے اعزاز و اکرام سے بہت زیادہ۔ حضرت نے اور حضرت کے جانشینوں نے تو دارالعلوم کے لیے حکومت کی کسی قسم کی امداد کی پیش کش کو قبول نہ کیا۔ ان کے نزدیک جس طرح حضرت قاسم العلوم کے زمانے سے امراء، جاگیرداروں اور حکومت کی امداد لینا قیام دارالعلوم کے مقاصد عالیہ کے حصول میں مانع تھا، موجودہ دور میں ملک کی حکومت سے امداد لینا بھی اسے اپنے معاملات میں مداخلت کا حق دینا تھا خواہ یہ حق اس وقت استعمال نہ کیا جاتا لیکن بعد میں کوئی دور ایسا آسکتا تھا کہ مداخلت کی جائے۔ البتہ سوکل جی نے حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کی اشاعت کے سلسلے میں جو بات کہی ہے اس کے نصابی کے بجائے عمومی پہلو پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

شیخ الاسلام کی سیرت کے چند پہلو

خورشید مصطفیٰ رضوی

حضرت شیخؒ کی ذاتِ اقدس یا ان کی سیرت پہ قلم اٹھاتے ہوئے مجھے اپنی علمی کم مائیگی بلکہ بے مائیگی کا شدید احساس ہوتا ہے کیونکہ میری حیثیت ان کے عقیدت مندوں کی صف میں اس بڑھیا کی سی ہے جو مصر کے بازار میں حضرت یوسفؑ کی خریداری کے لیے کچے سوت کی اٹیا لے کر گئی تھی۔

ذہن میں پرانی یادوں کے کچھ ورق پلٹنے پہ خیال آتا ہے کہ میں نے سب سے پہلے حضرت کو ۱۹۴۶ء میں دیکھا تھا۔ شملہ کانفرنس ناکام ہو چکی تھی۔ ملک میں سیاسی اختلافات اور افتراق نقطۂ عروج پہ تھی کہ مجلس آئین ساز کے انتخابات کا اعلان ہوا۔ سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے مخصوص پرجوش نعروں اور احساس قومی کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ میدان میں آ گئیں مگر اصل مقابلہ تھا مسلم لیگ اور کانگریس میں۔ ایک طرف ملک کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مسلم لیگ اور پاکستان کے نظریات سے متاثر ہو چکا تھا اور دوسری طرف نیشنلسٹ مسلم جماعتیں جن کی رہنمائی جمعیۃ العلماء ہند کر رہی تھی، کانگریس کے دوش بدوش تھیں۔ راقم الحروف اس زمانے میں بچہ ہی تھا۔ تیرہ چودہ سال کی عمر۔ لڑکپن کا زمانہ۔ مگر دل کی گہرائیوں میں قومی ہمدردی کے جذبات پوری طرح موجزن تھے اور اپنی جذباتی طبیعت کی بنا پر مسلم لیگی نعروں سے متاثر ہونے کے باوجود آزادئ وطن کی اتنی ہی بے پایاں آرزو رکھتا تھا جتنی کہ کسی کٹر سے کٹر کانگریسی کے دل میں ہوگی۔

یہ غالباً ۱۹۴۵ء کا آخر یا ۱۹۴۶ء کا شروع زمانہ تھا کہ مراد آباد میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے ورودِ مسعود کا اعلان کیا گیا۔ چند بے تکلف احباب کے ہمراہ مجھے بھی یہ جلوس دیکھنے کا

اتفاق ہوا۔ امروہہ گیٹ کے بازار میں جب یہ شاندار جلوس آیا تو ہندو مسلمانوں کے مکانات اور دوکانوں سے زیادہ تر ہندوؤں کی آبادی ہے مسلسل پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ نیز جلوس کے ہمراہ ہزارہا آدمی "نعرۂ تکبیر" "انگریزو نکل جاؤ" اور "انقلاب زندہ باد" کے پرجوش نعروں سے بام و در لرز رہے تھے۔ میں اس نظارے سے بڑا متاثر ہوا اگرچہ نظریات میں کوئی تبدیلی فوری طور پر نہ ہو سکی۔ اگلے دن اپنے اسکول کے ساتھیوں نے یہ خبر سنی کہ مولانا نے ایک جنازے کی نماز کے وقت سخت ناراضگی کا اظہار کیا کیونکہ کفن کھدر کا نہیں تھا۔ دیگر ساتھیوں کی طرح میں نے بھی اسے بے حد مضحکہ خیز سمجھا مگر اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں حب الوطنی کے کس قدر غیر فانی جذبات موجزن تھے اور وہ مسلمانان ہند کو صبر و برداشت سادگی و ایثار اور شجاعت و قربانی کے کس بلند مقام پہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔

اس کے بعد کئی مرتبہ رام پور اور امروہہ میں آپ کے مواعظ حسنہ سننے کا اتفاق ہوا مگر ۱۹۳۷ء کے بعد سے چونکہ سیاسی ہنگامہ آرائی سے کنارہ کش ہو گئے تھے اس لیے اپنی تقریروں میں مسلمانان ہند کو سرکار دو عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پہ چلنے کی تلقین فرماتے تھے۔ ایک بار حضرت مولاناؒ امروہہ تشریف فرما ہوئے۔ جامع مسجد میں نماز جمعہ کی امامت فرمائی۔ راقم کو بھی اس میں شرکت کا فخر حاصل ہے۔ نماز کے بعد تقریر کا بھی پروگرام تھا چنانچہ ایک اونچے تخت پہ کرسی رکھ کر اس پہ نہایت قیمتی مخملی قالین پہ (پوشش) ڈال دیا گیا تھا۔ مگر تقریر کا وقت آیا تو فقیری میں شاہی کرنے والے آقا کے اس پیروکار نشیں اور عہد و پیشہ غلام نے نفیس مخملی قالین پہ بیٹھنا گوارا نہ کیا اور اسے کرسی سے ہٹا کر نیچے ڈال دیا۔ بظاہر نہایت معمولی بات ہے مگر دراصل مجاہدانہ کردار کی کتنی بڑی مظہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ کے قلب و دماغ میں اسلامی غیرت اور انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ قومی جذبات اور حریت پسندانہ خیالات رگ رگ میں رچے ہوئے تھے۔ ضعیفی اور معذوری کے باوجود ان کی ہمت مردانہ اور قومی احساس نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ محبت وطن اور اشاعت دین کا جذبہ انہیں سیماب وار لیے پھرتا رہا۔ اور

اس راہ کی تمام مشکلیں ان کے لیے سہل تھیں، آزادیٔ وطن کی جدوجہد کے لیے نہ انہیں عزت کا خیال تھا نہ راحت کا، نہ عزیزوں کی پروا تھی نہ مال و دولت پیارا تھا۔ انھوں نے اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی ان دشوار گزار اور پرخطر راہوں میں طعن و تشنیع کے تیر بھی کھائے، سب و شتم کی بوچھار بھی برداشت کی، گالیوں اور لغو بیانیوں کے طوفان بھی سہے بلکہ اس سے بھی زیادہ سنا اور دیکھا مگر ان کی زبان اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہ رہی۔ وہ ببانگ دہل اپنے نظریات کا اعلان کرتے رہے انھوں نے اس دور ابتلاء اور قحط الرجال میں زمانہ ماسبق کے مجاہد صفت علماء اور صوفیائے کرام کی یاد تازہ کر دی۔

گذشتہ سال حکومت ہند نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر "پدم بھوشن" کے معزز خطاب سے نوازا مگر خم کدۂ حجاز کے متوالوں کو دنیاوی نام و نمود اور اعزاز و اکرام کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ حضرتؒ نے صدر جمہوریہ کو شکریہ کے ساتھ خطاب واپس کرتے ہوئے لکھا کہ خطاب عوام سے رابطہ اور تعلقات کے درمیان حائل ہوتا ہے نیز یہ میرے پیش رو اسلاف کرام کے مسلک اور روایات کے خلاف ہے۔

حضرت شیخ کی سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ کا ایک اور کمال بھی میں نے دیکھا۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا کہ محترم حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب نے مجھے "مکتوبات شیخ الاسلام" کی ایک جلد میں ایک مکتوب دکھا کر فرمایا کہ "نہ جانے حضرت کو الہام ہو گیا تھا یا یہ ان کی سیاسی بصیرت کا کمال ہے"۔ مکتوب تقسیم وطن سے کہیں پہلے کا لکھا ہوا تھا، میں نے پڑھا، حضرت والاؒ نے قیام پاکستان کے عواقب پر روشنی ڈالی تھی اور آیندہ کے بعض خطرات اور حالات کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت کے سامنے مستقبل کی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جو پڑھ کر سنا رہے تھے۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ حضرت کے اندیشے اور اندیشے بالکل درست تھے۔

افسوس آج فرزندان توحید کو درس عمل دینے والا رہنما ہمارے درمیان میں نہیں ہے۔ ہماری جنگ آزادی کا مجاہد اعظم نظروں سے اوجھل ہے مگر "نقش حیات" (خود نوشت سوانح) کی صورت میں اس کا نقش پا ہمارے لیے مشعل راہ ہے، اس کی روح مقدس پکار پکار کر آج بھی ہمیں درس حیات دے رہی ہے اور ہمیں جادۂ عمل پہ گامزن دیکھنے کی متمنی ہے۔

بھولی بسری یادیں:
شیخ الاسلام مولانا مدنی سے متعلق،

ابو سلمان الہندی

مرتب کا یہ مضمون اس کی ادبی زندگی کے آغاز کا ایک نقش ہے اور اگرچہ اس یادگار معیاری مجموعے میں جگہ پانے کے لائق نہیں، لیکن اس کی آرزو ہے کہ یہ نقش اس مجموعے میں جگہ پائے؛

گر قبول افتد زہے عزو شرف

۱۸ دسمبر ۱۹۵۷ء کو اخبارات میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کے انتقال کی خبر پڑھی تو کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ دماغ چکرا گیا۔ اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ خبر صحیح بھی ہو سکتی ہے لیکن خبر کو جھٹلانا گویا خود کو فریب دینا تھا۔ علالت کی خبر پہلے ہی کانوں میں پڑ چکی تھی۔ دل نے یقین کیا۔ یک بیک حضرت مولانا کا حلیہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔

سانولا رنگ اور میانہ قد، دوہرا بدن، بارعب کتابی چہرہ بھری ہوئی سیاہ داڑھی (حضرت خضاب استعمال کیا کرتے تھے) کشادہ اور نورانی پیشانی، روشن آنکھیں۔ گفتگو کا انداز سلجھا ہوا۔ بڑا اعتماد لب و لہجہ کہ مخالف بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اٹھے تو احساس مرعوبیت لے کر۔ نپے تلے الفاظ۔ جملے ایسے کہ جیسے سانچے میں ڈھلے ہوں۔ چال میں شیروں کی سی بے باکی لیکن دل میں راہبوں سے زیادہ انکسار۔ ایسا مجاہدانہ انداز جسے دیکھ کر جوان بھی شرمائیں۔

ذیل میں چند ایسے واقعات تحریر کرتا ہوں جن سے حضرت کی زندگی کے کئی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مدنی صاحب شاہجہان پور تشریف لا رہے تھے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ گاڑی تقریباً دو بجے رات کو اسٹیشن پر پہنچتی تھی۔ ایسے وقت ممکن نہ تھا کہ

اسٹیشن پر خیر مقدم کرنے والوں کی بھیڑ ہو۔ لیکن چند عقیدت مند (بلکہ جان نثار کہوں تو زیادہ بہتر ہے) اس وقت بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔

حضرت تشریف لائے۔ جمعیت العلماء کے دفتر واقع منڈی میں قیام کا اہتمام کیا گیا۔ چند منٹ کی رسمی گفتگو کے بعد حاضرین اس وجہ سے علیحدہ ہو گئے کہ آپ تھوڑی دیر آرام فرمالیں۔ لیکن یہاں آرام کہاں؟ حضرت کی مجاہدانہ زندگی تو اصغر گونڈوی کے اس شعر کی بولتی ہوئی تصویر تھی ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اس کے باوجود کہ ابھی ابھی ایک لمبے سفر سے تشریف لا رہے ہیں۔ نصف شب سے زائد حصہ پریشانی سفر اور صعوبت میں گزر چکا ہے۔ پھر سفر بھی فرسٹ کلاس کا نہیں تھرڈ کلاس کا۔ عمر ستر برس سے اوپر ہے۔ لیکن خدا کی بندگی کا یہ ذوق و شوق، اس کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے دل کی یہ تڑپ کہ رات کا جو باقی حصہ تھا اس کو نذرِ ذکر و صلوٰۃ کر دیا اب ممکن نہیں کہ دن میں کوئی آرام کا وقت نکالا جا سکے۔ امید نہیں کہ دوسری شب بھی آرام نصیب ہو۔ کیونکہ پھر سفر در پیش ہے۔ لیکن اللہ کے ولی کو اس کی کوئی فکر نہیں۔

چند لمحے باقی بچے، تکیہ سے سر لگایا ہی تھا۔ ابھی آنکھ بھی نہ جھپکی تھی کہ مؤذن نے اللہ کی کبریائی کا اعلان کیا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور۔ الصلوٰۃ خیر من النوم: نماز سونے سے بہتر ہے۔ کی آواز فضا میں گونجی اور اللہ کا یہ ولی مسنون دعا پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کی۔ اور اس کے بعد پھر دن بھر کے مقررہ پروگرام پر عمل شروع ہو گیا۔ جس کی رات کا پیشتر حصہ سفر میں گزرا اور جو باقی بچا تھا وہ اللہ کی عبادت میں صرف ہوا۔ اس کا دن ملکی و قومی مسائل کے سلجھانے اور سیاسی تگ و دو میں صرف ہو رہا تھا۔ یہی وہ پاک وجود ہیں جن کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہ نے خبر دی تھی کہ:

"وہ دن کو گھوڑوں کی پیٹھ پر ہوتے ہیں اور اُن کی رات مصلّے پر گزرتی ہے۔"

اللہ اللہ ایک طرف سیاست میں یہ انہماک، دوسری طرف شب بیداری کا یہ عالم کہ کوئی ہے جس کی نظریں عقیدت و محبت سے نہ جھک جاتی ہوں۔

ایک بار حضرت مدنی صاحبؒ تلہر (شاہجہان پور کا ایک قصبہ) تشریف لے گئے۔ شاہجہان پور سے بھی سیکڑوں عقیدت مند کھنچ کر پہنچ گئے۔ جس جگہ قیام تھا وہاں بے شمار لوگ جمع تھے۔ اتنے میں ایک صاحب تشریف لائے وہ پنڈت پنت کے نام جو ان دنوں یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے ایک سفارش نامہ چاہتے تھے۔ کسی صاحب نے ان کو بتا دیا تھا کہ اگر مولانا پنڈت پنت کو اشارہ بھی کر دیں تو تمہارا کام ہو سکتا ہے۔ پنڈت پنت مولانا کی بات نہیں ٹال سکتے۔ ان صاحب سے یہ بات جن صاحب نے بھی کہی غلط کہی۔ وہ مولانا کی طبیعت سے قطعاً واقف نہ تھے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حضرت مدنی کی اصل حقیقت ہی سے ناواقف ہوں، اس لیے مولانا کے پاس جانے کا مشورہ دے دیا۔ وہ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت مولانا نے سفارش کرنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ میں اس معاملہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ معاملہ حقیقتاً یہ تھا کہ ان صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا اور قتل کے الزام میں گرفتار ہو چکا تھا۔ خود ان صاحب کو تسلیم تھا کہ یہ جرم غلط نہیں ہے لیکن رو رو کر کہتے تھے کہ ایک ہی بیٹا ہے بڑھاپے کا سہارا آنکھوں کا نور ہے۔ جرم ثابت ہو جانے پر یقینی ہے کہ پھانسی پر چڑھ جائے گا۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ انہوں نے ہر چند مولانا کو مجبور کرنا چاہا لیکن مولانا نے بات صاف صاف کہہ دیا:

"مجھ سے ایسی غلط سفارش کی امید نہ رکھیے۔ البتہ آپ کا اگر کوئی صحیح مطالبہ ہوتا تو میں ضرور آپ کی سفارش کر دیتا۔"

ایک واقعہ مجھے حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ کے چھوٹے صاحبزادے برادرم اسمٰعیل نے سنایا کہ مراد آباد میں حضرت شروع ہی سے جب بھی تشریف لاتے ... صاحب کے یہاں جن کو حضرت مولانا مدنی صاحبؒ سے بڑی گہری عقیدت تھی ... کبھی اس معمول میں فرق نہ آیا تھا۔ جب ان صاحب کا انتقال ہو گیا تو حضرت ... کہ مرحوم کی بیوہ کو میری وجہ سے زحمت نہ ہو دوسری جگہ ٹھہر گئے۔ مرحوم کی بیوہ کو خبر ہوئی تو بیچ

کے ذریعے مولانا کو کہلا بھیجا:

"مرحوم کے انتقال کے بعد آپ نے بھی ہمیں اپنی خدمت کی سعادت سے محروم کر دیا"۔

مولانا یہ سن کر تڑپ گئے۔ فوراً ان کے گھر گئے۔ ان سے معذرت چاہی اور اس کے بعد جب بھی مراد آباد تشریف لے جاتے تو پہلے موصوف کے مکان پر حاضر ہوتے۔ سامان رکھتے، اس کے بعد کسی دوسری جگہ تشریف لے جاتے۔

مگر آہ! کہ اب یہ تمام واقعات ماضی کی داستان بن چکے ہیں۔ ؎

کب ایسے لوگ ہوتے ہیں پیدا جہان میں
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ایک مرتبہ حضرت مولانا کلکتہ سے تشریف لا رہے تھے شاہجہان پور میں چند محبین نے یہ پروگرام بنایا کہ حضرت کو یہاں اتار لیا جائے اور ایک تقریر ہو جائے غرض حضرت کو شاہجہان پور اتار لیا۔ جلسہ کیا تقریر ہوئی۔ اور دل کے ارمان نکل گئے روانگی کے وقت ایک صاحب نے ایک بند لفافہ جس میں کچھ رقم تھی شیروانی کی جیب میں رکھنا چاہا۔ حضرت نے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ صاحب بولے۔ حضرت کچھ کرایہ! آپ نے فرمایا میرے پاس دیوبند کا ٹکٹ ہے مجھے ضرورت نہیں اور اگر پیسے زیادہ ہیں تو جمعیت کو دیجیے لیکن اس طرح برباد نہ کیجیے۔

(ہفت روزہ چٹان، لاہور ۲۴/ دسمبر ۱۹۵۵ء)

نیشنلسٹ مسلم کانفرنس

جمعیتِ علماء نے بہت دن پہلے اپنے چوتھے اجلاس بمقام لاہور ۱۹۲۵ء میں یہ تجویز پاس کی کہ حکومت برطانیہ کی کونسلوں کی ممبری حرام ہے ۔ اور ۱۹۲۶ء میں اپنے اجلاس بمقام کلکتہ میں مکمل آزادی کا یہ ریزولیوشن پاس کیا:

"چونکہ برادرانِ وطن کے مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے ۔ اس لیے مسلمان اپنی تنظیم کرکے اپنے بل بوتے پر ملک کو آزاد کرائیں ۔ البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں، ان کے ساتھ اتحادِ عمل کیا جائے ۔

اس کے بعد ملک کی مختلف مسلم سیاسی جماعتوں نے جمعیتِ علماء کے اس مسلک سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی ایک متحدہ تنظیم "نیشنلسٹ مسلم کانفرنس" کے نام سے قائم کی ۔ لیکن اس کی سربراہی اور رہنمائی جمعیتِ علماء ہی کے ہاتھ میں رہی ۔ کانگریس بڑی تیزی کے ساتھ مکمل آزادی کی طرف آرہی تھی اس لیے جمعیتِ علماء اور نیشنلسٹ مسلمانوں میں بڑی حد تک فکر اور سیاسی ہم آہنگی مضبوط ہوتی گئی ۔

"۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تیس دوسرے قوم پرور مسلمان لیڈروں کے ساتھ نیشنلسٹ مسلم کانفرنس قائم کی ۔ اگرچہ ان کی سرگرمیوں کا اصل مرکز بدستور کانگریس کا کام رہا ۔ نیشنلسٹ مسلم کانفرنس اپنی کوئی مستقل جداگانہ تنظیم قائم نہیں کر سکی ۔ لیکن قوم پرور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں جمعیتِ علماء، شیعہ پولٹیکل کانفرنس، انڈی پنڈنٹ پارٹی (بہار)، مجلس احرار، خان عبدالغفار خان کی تنظیم (خدائی خدمت گار)، بلوچستان کی نیشنل پارٹی اور انجمن وطن، مسلم مجلس، مومن کانفرنس وغیرہ کے لیے مشترک پلیٹ فارم کا کام دیتی رہی ۔"

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی از فرید الوحیدی . ۳۵-۳۳۴)

باب سوم

سیاسی خدمات و افکار

مخالفین آزادی

" مولانا اشرف علی صاحب زید مجدہم کے خیال سے ان امور میں، میں ہی مخالف نہیں ہوں بلکہ حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز بھی خلاف تھے۔ خلافت کی تمام تحریک میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ شریک ہونا، جدوجہد کرنا ضروری اور واجب سمجھتے تھے اور مولانا تھانوی اس کو فتنہ و فساد سمجھتے رہے ہیں۔ میں حضرت شیخ الہند کا ادنیٰ خادم اور ان کی رائے کا متبع ہوں۔ باوجود اس اختلاف کے میں مولانا تھانوی کا دشمن نہیں ہوں۔ ان کی بے ادبی نہیں کرتا۔ ان کو بڑا اور بزرگ جانتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ مولانا اس امر میں غلطی پر ہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں "

(مکتوبات: ج ۴، ص ۲۳۷)

خیر! یہ تو وہ حضرات تھے جو سرے سے ہندوستان کی آزادی اور برطانیہ سے گلو خلاصی ہی کے خلاف تھے۔ مگر وہ لوگ جو آزادی کے بڑے علم بردار اور قومی تحریکوں کے سردار تھے، ان کی لڑائی بھی صرف آزادی کے سوال اور مسئلہ پر تھی۔ جہاں بھی اور جب بھی برطانیہ کی حکومت ان کو نرم و ملائم نظر آتی تھی ان کے اختلاف کی درازیں اور سوراخ بند ہونے لگتے تھے۔ یہ صرف ۱۸۵۷ء کے مجاہدین اور خاص طور پر اکابر امت کی جماعت تھی جو برطانیہ سے کسی مرحلہ پر رشتہ مصالحت کے لیے تیار نہیں تھے ......۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اسی جماعت کے سالار کارواں تھے۔

وہ دنیائے اسلام اور مسلمانان عالم کی زبوں حالی اور زیاں کاری کا ذمہ دار برطانوی سامراج ہی کو قرار دیتے تھے۔

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی از فرید الوحیدی، ص ۳۶۴)

خدمات:

مولانا سید حسین احمد مدنی؛
سیاسی افکار و خدمات اور محرکات کے آئینے میں،

پروفیسر خلیق احمد نظامی

پروفیسر نظامی کا یہ مضمون حضرت شیخ الاسلام کی حیات مقدسہ کی تین پہلوؤں اور ان میں خدمات کے تذکرے میں تھا۔ درس وتدریس حدیث اور بہ حیثیت شیخ طریقت ارشاد و ہدایت کے میدان میں حضرت علیہ الرحمہ کی عظیم الشان خدمات اس کتاب کے دائرے سے باہر ہیں۔ یہاں صرف سیاسی میدان میں حضرت کے افکار کا مطالعہ اور خدمات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے (مرتب)

محدث، مجاہد، پیر طریقت ـــــ جو انسانی پیکر، ان تین عظیم الشان حیثیتوں کا جامع ہو، اس کی شخصیت کی عظمت و دل آویزی الفاظ کے سہارے بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس کے نام کے ساتھ کتنی ہی مختلف النوع تصویریں ہیں جو یکے بعد دیگرے پردۂ ذہن پر ابھر آتی ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درس وتدریس، دعوت و عزیمت، سلوک وارشاد کی ایک دنیا نظروں کے سامنے پھیل گئی ہے اور جس منظر کو دیکھیے جی چاہتا ہے کہ دیکھتے ہی رہیے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

کبھی اُن کے درس حدیث سے دار العلوم کے بام و در گونجتے سنائی دیتے ہیں، کبھی وطن سے ہزاروں میل دور مصر اور مالٹا کے قید خانوں میں وہ اپنے جذبات حریت اور احساسات دینی کی ایک دنیا اپنے خونِ دل سے سجاتا نظر آتا ہے، اور فضائیں تک پکار اٹھتی ہیں ؎

بنا لینا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

کبھی عزم و عزیمت کی راہ پر گامزن کراچی کی برطانوی عدالت میں دار و رسن کو اس طرح دعوت دیتا ہے گویا اس کے انتظار میں برسوں سے بے چین گھڑیاں گزار رہا تھا، کبھی رات کی تنہائیوں میں اپنے رب کے حضور میں سر بسجود زار و قطار روتا اور یہ شعر پڑھتا سنائی دیتا ہے

چہ بودے کہ دوزخ زمن پُر شدے
مگر دیگراں را رہائی شدے

زمانہ جس طرح مادی سرگرمیوں میں ڈوبتا جاتا ہے، اس کی آنکھوں کی نمی بڑھتی جاتی ہے وہ انسان کو مقصدِ حیات سے آشنا کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے، جب انسانیت دم توڑتی نظر آتی ہے تو وہ اپنے دِنوں کی تپش اور راتوں کا گداز اس کی بقا کے لیے جد و جہد میں صرف کرتا ہوا جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے:

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ان کے کام کی وسعت ایک ادارہ کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے تھی، ان کے افکار کی گیرائی ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی، ایسی تحریک جس نے ایک طوفانی دور میں مسلمانوں کی عظیم الشان علمی، تہذیبی اور روحانی قدروں کی پاسداری کی تھی، ان کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا:

ترا چہ آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید
چہ گنج ہائے سعادت زیان جاں آمد

اگر تاریخ کے واضح اشاروں سے چشم پوشی نہ کی جائے تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ مولانا مدنیؒ ہماری اس بزمِ رفتہ کے آخری رکنِ رکین تھے، جس کی صدر نشینی کبھی شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ نے کی تھی۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں تھی کہ وہ جب درسِ بخاری شروع کرتے تو پہلے شاہ ولی اللہؒ تک اپنی سندِ حدیث بیان کرتے تھے۔ ان کی زندگی

اس چراغ کی آخری لو تھی، مدرسہ رحیمیہ نے جب دم توڑا تو فیروز شاہ کوٹلہ کی مسندِ علم و درس دیوبند کو منتقل ہوگئی اور ایک ایسے دور میں جب ذہن پژمُردہ، مذہبی فکر ماؤف اور دینی بصیرت عنقا تھی انھوں نے اسلاف کا چراغ علم و عرفان تیز اور تند ہواؤں کے درمیان روشن رکھا، بڑے بڑے طوفان گھر گھر کر آئے لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کر سکے، وہ عزم و عزیمت کی چٹان بنے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہے، ان کی ذات میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے سوز، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی استقامت، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کی سرشاری اور مولانا محمود حسنؒ کی بصیرت کا پرتو نظر آتا تھا، وہ خود کو "ننگِ اسلاف" کہتے تھے، لیکن حقیقت میں ان کی ذات "فخرِ اسلاف" بن گئی تھی، وقت کا قافلہ جتنی تیزی سے آگے بڑھتا جارہا ہے، ان کے نقشِ پا اور روشن ہوتے جاتے ہیں اور ان کی ذات علم و عمل اور سلوک کا ایک روشن مینار بن کر دعوتِ فکر و عمل دیتی نظر آتی ہے:

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود

زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ ام

کسی شخص کی عظمت و بزرگی کو جانچنے کا پہلا پیمانہ یہ ہے کہ وہ کیسا انسان ہے؟ جس دنیا میں انسان بڑھتے اور انسانیت گھٹتی جاتی ہو، وہاں اس سے زیادہ اہم پیمانہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے! پھر اگر کسی کے دینی مرتبہ کا اندازہ لگانا ہو تو گفتار و کردار میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جتنا زیادہ گہرا اثر ہوگا، اتنا ہی اس کا مرتبہ بلند اور انسانیت دل نواز ہوگی۔

سنت نبوی کے اتباع میں مولانا مدنیؒ کی استقامت اور بہ حیثیت انسان، دردمندی خلق اور تواضع ان کی سیرت کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جن کو زمانہ آسانی سے بھلا نہ سکے گا۔

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

تاریخ میں وہ ایک اور حیثیت سے بھی اپنا بلند مقام رکھتے ہیں، ان کی ذات میں وہ خصوصیات جمع ہوگئی تھیں جو قدرت شاذو نادر ہی کسی وجود میں جمع کرتی ہے ایک ایسے زمانے میں جب علم، عمل سے بیگانہ ہوتا جاتا تھا، خانقاہیں رات کے آغوش میں تسبیح و مناجات میں مصروف تھیں، لیکن زمانہ پکار رہا تھا:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے وقت کی آواز کو سنا، سمجھا اور اس پر لبیک کہا۔ مدرسہ کو خانقاہ سے اور خانقاہ کو مدرسہ سے قریب لائے، ایک ہاتھ میں جامِ شریعت لیا دوسرے میں سندانِ عشق، چشتیہ سلسلے کے سوز وگداز اور نقشبندیہ سلسلے کی تہذیب و احتیاط دونوں کو اپنا رہبر بنایا، دیوبند کا علمی رشتہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے اور روحانی رشتہ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے اس طرح استوار کیا کہ دینی زندگی میں نئی توانائی پیدا ہوگئی پھر جب آزادیٔ وطن کے لیے قربانی دینے اور قید و بند کے معائب برداشت کرنے کا وقت آیا تو ایسے سرفروشانہ انداز میں سرگرمِ عمل ہوئے کہ شاملی کے جہاد کی صدائے بازگشت دیوبند سے مالٹا تک گونج اُٹھی۔ وہ ایک کڑی ہیں اس عظیم الشان تحریک کی جو بالاکوٹ سے سید احمد شہیدؒ کی قیادت میں اٹھی اور شاملی میں نیا پیکر اختیار کر کے یاغستان کے پہاڑوں اور مالٹا کے بیابانوں تک پہنچی:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ ایک شخص بیک وقت روحانی زندگی اور سیاسی زندگی کے تقاضوں کو اس طرح پورا کر سکا ہو کہ جیسے مولانا مدنیؒ۔ اس کا راز صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ان کی ذات میں یہ دونوں زندگیاں ایک ہی مقصد کے تابع تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ربِ کائنات سے جس نے اپنا رشتہ نہیں جوڑا وہ مقصدِ حیات سے بیگانہ رہا، جس نے غلامی کی زنجیروں کو نہیں توڑا اُس نے اپنے احساس اور خودداری کی دنیا کو ویران کر دیا۔ عبادت انسان کی تخلیق کا مقصد ہے، اور آزاد زندگی اس کا پیدائشی حق، یہ دونوں ایک ہی نوع کی جہد و سعی کے دو رُخ ہیں، ان میں تضاد نہیں بلکہ مقصد کا اتحاد ہے، یہ دونوں انسان کو انسان بناتے ہیں اور اس کے پیکرِ خاکی میں وہ قوت بیدار کرتے ہیں جس کے بغیر وہ صحیح معنی میں خلیفۃ اللہ فی الارض کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

تلاش و جستجو کی نظر جب مولانا مدنیؒ کی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے تو انسانیت، دل نوازی خُلق، اور آفاقی فکر کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے، جس کا آب و رنگ چشتی خانقاہوں کا فیضان ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے پوچھا گیا کہ بہترین طاعت کیا ہے؟ فرمایا:

"درماندگان را فریاد رسیدن و حاجت بیچارگان روا کردن و گرسنگان

راہبر گردانیدن" (سیر الاولیاء ص ۴۶)

پھر فرمایا: "خدا ے تعالیٰ اس کو عزیز رکھتا ہے جس میں دریا کی سی سخاوت آفتاب کی سی شفقت اور زمین کی سی تواضع ہوتی ہے (سیر الاولیاء۔ ص ۴۶)

یہ شانِ ربوبیت ہے کہ جب سورج افق پر نمودار ہوتا ہے تو محلوں اور جھونپڑوں دونوں کو یکساں سورج کی گرمی اور روشنی پہنچاتا ہے۔ دریا کی فیض بخشیاں اپنے، پرائے کا امتیاز نہیں کرتیں، وہ امیر و غریب، عاصی و عابد، سب ہی کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے بے چین رہتی ہیں، زمین کا دامن ہر ذی روح کو پناہ دینے کے لیے کھلا رہتا ہے، جب تک انسان عملاً "الخلق عیال اللہ" کا قائل نہ ہو جائے وہ اس زمین پر اپنی خلافت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ یہ رہنا چاہیے کہ ؎

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ اپنی مجلسوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ بغیر کسی کو کھانے میں شریک کیے کبھی کھانا نہ کھاتے تھے، بعض اوقات مہمان کی تلاش میں میلوں نکل جاتے، ایک دن ایک مشرک مہمان تھا اس کو شریک طعام کرنے میں ان کو کچھ تامل ہوا۔ وحی نازل ہوئی "ابراہیم! ہم اس شخص کو جان دے سکتے ہیں اور تو کھانا نہیں دے سکتا"۔

چشتیہ سلسلے کی یہ تعلیم مولانا مدنیؒ کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی انھوں نے اسی کی روشنی میں اپنی فکر و نظر کی دنیا بسائی تھی، ایک مرتبہ مولانا محمد الیاسؒ نے ان سے کہا کہ مولانا مسلمانوں کے لیے دعا فرمایئے، فوراً فرمایا: کیا غیر مسلم مخلوق خدا نہیں؟ ـــ یہ مرکزی نقطہ تھا اس فکر کا جو چشتیہ سلسلے سے ان کو ملی تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ خالق کائنات کی ربوبیت، انسان کو اعلیٰ انسانی مقاصد کی چاکری میں مصروف دیکھنا چاہتی ہے کیوں کہ آفاقی نقطۂ نظر کے بغیر زندگی کی اعلیٰ قدریں بے جان رہتی ہیں، ان کے سماجی روابط کی بنیادیں ان کی اجتماعی سیاسی جدوجہد کا پس منظر یہی تصور تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح انسان کو زمین پانی اور سورج سے محروم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس سے آزادی نہیں چھینی جا سکتی، وہ سیاست میں اقتدار کی تنا میں داخل نہیں ہوئے تھے، بلکہ ایک انسانی فریضہ کی بجا آوری

کا جذبہ اس میدان میں لے آیا تھا۔ ہندوستان میں صرف دو شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے آزادی کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کے باوجود اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جب آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو گاندھی جی فرقہ واریت کی آگ کو بجھانے میں لگ گئے مولانا مدنی نے روحانی اور اخلاقی قدروں کو بیدار کرنے میں اپنی بقیہ زندگی صرف کر دی۔۔۔۔۔

مولانا مدنی کے سیاسی افکار اور ان کی سیاسی جدوجہد کے بنیادی خطوط کا مطالعہ ان کے دو بیانات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے، پہلا ۱۹۲۱ء کا وہ بیان ہے، جو کراچی کی عدالت میں انھوں نے دیا تھا، دوسرا وہ بیان ہے، جو اکیس سال بعد ۱۹۴۲ء میں مرادآباد کی عدالت میں ہوا تھا۔

۱۹۲۱ء میں کراچی کے مقدمے میں انھوں نے مذہبی حیثیت سے اپنی جدوجہد کا جواز پیش کیا تھا اور جب ان کے جوشِ قربانی نے دار و رسن کو اس طرح دعوت دی تھی کہ

"اگر لارڈ ریڈنگ ہندوستان اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلا دیں، حدیث شریف کو مٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر جان قربان کرنے والا میں ہوں۔"

تو مولانا محمد علیؒ بے اختیار ان کے قدموں پر گر پڑے تھے

(کراچی کا تاریخی مقدمہ ج ۱ ص ۱۲۵)

کراچی جیل میں ان کے ہاتھ ہتھکڑیوں اور پیر بیڑیوں سے بوجھل تھے جوار کا پتلا دلیہ کھانے کو ملتا تھا، لیکن عزم و ہمت کا یہ عالم تھا کہ ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم رہے اور سامراجی قوتوں کو متنبہ کیا کہ قوت سے جسموں کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے لیکن دلوں کو زنجیریں نہیں پہنائی جا سکتیں۔ فرماتے ہیں:

"مادی قوت لپیٹ مارنے والے شعلہ کو دبا سکتی ہے مگر دلوں میں سلگنے والی آگ کو نہیں بجھا سکتی۔" (ج ۲ ص ۱۲۹)

ان کے ذوق سرفروشی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو قربانی اور عزیمت کا وہ سبق پڑھایا جس سے ملک کی آزادی کی تحریک ایک اور ہی منزل پر پہنچ گئی اور ایسا

محسوس ہونے لگا کہ ؎

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی

اپریل ۱۹۴۲ء کے بیان میں انھوں نے مسئلہ کو دوسرے ہی انداز سے دیکھا ہے، یہاں آزادی کے لیے اقوام کی جدوجہد، ہندوستانیوں کی متحدہ کوشش کی ضرورت اور تاریخ سے ہندو مسلم اتحاد کی مثالیں پیش کی ہیں۔

اگر ان محرکاتِ ذہنی کا تجزیہ کیا جائے جو مولانا مدنیؒ کو سیاسی میدان میں لے گئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ وقتی جذبات و احساسات نہیں تھے بلکہ اس کے پیچھے ایسے عوامل کام کر رہے تھے جن کی جڑیں تاریخ میں بہت دور تک چلی گئی تھیں۔

(۱) سب سے پہلا اثر ان پر اپنے باپ کا تھا۔ وہ ایک انتہائی دینی سرشاری کی حالت میں یہ شعر پڑھتے ہوئے ؎

بصارت تیز کرتی ہے حبیب اس کوچے کی مٹی
دل و جاں خانماں سب بیچ وہ سرمہ لگاتا ہے

ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے، اور وہاں مہینوں تک ایک وقت کھچڑی اور ایک وقت نمکین بیچ پر ان کے پورے کنبے کا گزارا ہوتا تھا۔

(نقش حیات ج ۱ ص ۴۷)

انھوں نے ایک بار اپنی اولاد کو جمع کر کے فرمایا تھا:

"میں نے تم سبھوں کو اس لیے پرورش کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں جہاد کرو اور رکھ کر کے شہادت حاصل کرو (نقش حیات ج ۱ ص ۴۳)

باپ کی یہ نصیحت مولانا مدنیؒ کے دل و دماغ میں اتر گئی، ان کے ذوقِ سرفروشی کی بنیاد باپ کی یہی وصیت تھی۔

(۲) دوسرا اثر تاریخ کے مطالعے کا تھا، اسکول میں ان کو تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، اسی مطالعے نے ان کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا، انھوں نے انگریز مورخین اور مصنفین کی کتابوں کے ترجمے بغور مطالعہ کیے تھے، برطانوی تسلط سے ملک کی فارغ البالی جس طرح تباہ ہوئی اور یہاں کے عوام معاشی بدحالی کا شکار ہو گئے اس کا پورا نقشہ ان کی تاریخی بصیرت نے کھینچ لیا تھا اور اس سلسلے کے بے اندازہ اعداد و شمار

ان کے حافظے میں محفوظ ہو گئے تھے، لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی پرانی تاریخی عظمتوں اور جغرافیائی قدرتی ہمہ گیر برکتوں نے نہایت گہرا اثر کیا اور اہل ہند کی موجودہ بے کسیوں کا اثر روز نہ افزوں ہوتا رہا۔"

اس نوع کے مطالعے کی افادیت کا ان کو اتنا احساس ہو گیا تھا کہ ۲۶-۱۳۲۵ھ میں انھوں نے ہفتے میں ایک دن (روز شنبہ) عصر سے مغرب تک تاریخ، اقتصادیات و سیاسیات پر لیکچر کے لیے مقرر کر دیا تھا، تاکہ طلبہ حالات گردو پیش سے ناآشنا نہ رہیں۔

تاریخ کا علم انھیں سیاست کے میدان میں لایا، مذہبی جذبے نے ان کے قدم مضبوط کیے اور مشائخ سلسلے کی روایات نے ان کے قلب و جگر کو گرمایا۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں نے "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں بھیجا تو انھوں نے اپنے مکتوب گرامی میں بڑی مسرت کا اظہار کیا اور کہا تھا کہ شاہ ولی اللہ کے متعلق ان واقعات کا ہم کو علم نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی خوشی کا باعث یقیناً یہ بھی جذبہ تھا کہ وہ جس مسند علم پر متمکن تھے، اس کی روایات کا مطالبہ وہی تھا جو وہ خود کر رہے تھے، شاہ ولی اللہ رح کا عمل بڑی سے بڑی سند تھی جو ان کو مل سکتی تھی اپنی جہد و سعی کے جواز میں۔

(۳) سید احمد شہید رح کی تحریک نے جس طرح سارے ملک میں احیائے دینی کی روح بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں سے آشنا کیا تھا اور قومی جذبات کو یہ کہہ کر آواز دی تھی کہ "تاجرانِ متاع فروش" اور "بیگانگانِ بعید الوطن" سے ملک کو آزاد کیا جائے اور ان کی جماعت جو "اہلِ فقر و مسکنت" پر مشتمل ہے وہ۔

"ہرگز ہرگز از دنیا داران جاہ نیستند"

مولانا مدنی رح کی ذات میں تحریک کی یہ روح سما گئی تھی، انھوں نے پورے مجاہدانہ عزم کے ساتھ سیاسی جنگ میں حصہ لیا، اور جب وہ مقصد حاصل ہو گیا تو عملاً "از دنیا داران جاہ نیستند" کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مسندِ درس کی طرف لوٹ گئے، کہتے ہیں کہ جب مولانا سید احمد شہید رح دیوبند کے علاقے سے گزرے تھے تو فرمایا تھا:

"یہاں سے علم کی بو آتی ہے" (علمائے حق حصہ اول ص ۲۷)

مولانا سید احمد شہیدؒ کی تحریک نے مولانا مدنیؒ کے بزرگوں کے قلب و جگر کو بھی گرمایا تھا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے پیر (شیخ نور محمد جھنجھانویؒ) کے پیر شاہ عبدالرحیم شہید سید احمد شہیدؒ کی جماعت مجاہدین کے اہم رکن تھے حاجی صاحبؒ کے مرشد اول مولانا سید نصیرالدین دہلویؒ کا بھی جماعت سے گہرا تعلق تھا اس طرح جہاد کی وہ روح جس کی تمنا میں تو... جیسا شاعر پکار اٹھا تھا ۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

ان بزرگوں کی رگ و پے میں موجزن تھی، بالاکوٹ کی چنگاری سے شاملی کا شعلہ ... شاملی ہماری تحریک آزادی میں ایک منزل ہے جہاں ہمارے قافلے نے ... لیکن حقیقتاً فتح پائی تھی. میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے خلیفہ حافظ ضامن شہیدؒ نے خدمت دار و رسن انجام دی تھی،

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم ... نے انگریزی تسلط کے خلاف عملاً حصہ لیا تھا، یہ سب روایات مولانا مدنیؒ کو ... عزیز تھیں بلکہ ان کی شخصیت کا اس طرح جزو بن گئی تھیں کہ ان کا ریشہ ریشہ ... تھا ۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

(۴) چوتھا اہم محرک جس نے مولانا مدنیؒ کے سیاسی جد و جہد کی ضرورت کا احساس بیدار کیا اور ان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا کی وہ ممالک اسلامیہ عرب مصر اور شام وغیرہ کے حالات کا جائزہ تھا، خود لکھتے ہیں:

"میں نے دیکھا کہ یورپین، ایشیائک، افریقی آزاد اقوام کس طرح اپنی آزادی کے گیت گاتی ہیں اور اس کے لیے ہر قربانی کو ضروری سمجھتی ہیں ان امور کے مشاہدہ کی بنا پر مجھ میں وہ قومی جذبات پیدا ہوتے شروع تھے کہ جن کے ہوتے ہوئے میں ہندوستان کی محبت اور اس کی آزادی میں بیش از بیش سعی اور جد و جہد میں کوتاہی کو روا نہ رکھوں۔"

(۵) پانچواں سبب ایک مہینہ مصر میں جیزہ کے سیاسی قید خانہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ کا قیام تھا، اس قید خانہ میں مصریوں کا آزادی پسند طبقہ مقید تھا، ان کی صحبت میں جذبہ آزادی کی پرورش کا سامان فراہم ہوگیا۔

(۶) چھٹا محرک مالٹا کی اسارت تھی، اس نے ان جذبات کو تیز تر کردیا جب مالٹا میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے تو وہاں بھی اتفاق سے یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں کے سیاسی اور فوجی لوگ مقید تھے، ڈیڑھ ہزار جرمن، ڈیڑھ ہزار آسٹرین اور بلغیرین اور ترک مرد وہاں تھے چار سال تک (۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۹ء) تک ان لوگوں سے صحبت رہی اور ان کے جذبات حریت میں ایک مستقل حرکت اور بے چینی پیدا ہوگئی۔

(۷) ساتواں سبب شیخ الہند کی صحبت کا اثر تھا، خود مولانا مدنی نے اپنی عملی اور سیاسی زندگی کا حقیقی سرچشمہ ان ہی کو قرار دیا ہے، شیخ الہند نے جب ملک کی آزادی کے لیے افغانستان میں اپنی خفیہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ریشمی خطوط، غالب نامہ وغیرہ کے واقعات پیش آئے، اس وقت مولانا مدنی نے ۔ ۔ ۔ مجاہدانہ خدمات انجام دیں، مدینہ منورہ میں مولانا مدنی نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں اور تقریر بھی کی ۱۹۲۰ء میں جب علی گڑھ کے طلبہ نے شیخ الہند سے ترک موالات کا فتویٰ حاصل کیا تھا تو انھوں نے فرمایا تھا:

"جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے تو اُس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔"

انھوں نے تعاون وموالات کو "اعتقاداً" و عملاً ترک کرنے اور سرکاری اسکولوں سے تعلق منقطع کرنے اور صرف ملکی اشیا و مصنوعات کے استعمال کرنے کا مذہبی جواز پیش کیا تھا، شیخ الہند کی یہ آواز جب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک آگ کی طرح پھیل گئی تھی تو ناممکن تھا کہ مولانا مدنی کے لیے جدوجہد کا ایک نیا میدان نہ پیدا کردے۔

یہ تھے وہ محرکات جنھوں نے مولانا مدنی میں سیاسی احساس بیدار کیا اور جذبات حریت کو بھڑکایا، جب ۱۹۲۰ء میں وہ مالٹا سے ہندوستان واپس آئے تو رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کے واقعات پیش آچکے تھے، برطانوی سامراج نے اپنی پوری قوت جذبات

آزادی کو کچلنے میں لگا دی تھی، تحریک خلافت اور ترک موالات میں مولانا مدنیؒ نے عزم و ہمت کے ساتھ حصہ لیا، اور پکارا:

"تمام افراد کو اسی مطالبہ اور اسی مقصد پر ثابت قدم رہنا چاہیے خلافت آزاد ہو، جزیرۂ عرب آزاد ہو، ہندوستان آزاد ہو، پنجاب کے مظالم کی تلافی ہو۔

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

(سرگزشت مولوی حسین احمد مہاجر مدنی اسیر مالٹا ص ۵۲)

یہ شعر ان کے جذبات کا مکمل ترجمان ہے، اب حصول مقصد کے لیے انھوں نے جان کی بازی لگا دی تھی، اور سر بکف میدان میں آ گئے تھے۔

مولانا مدنی کا یہ محکم خیال تھا کہ آزادی کی جنگ ہندو مسلمان دونوں کو شانہ بہ شانہ لڑنی چاہیے، شیخ الہند نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۰ء منعقدہ دہلی کے خطبے میں فرمایا تھا:

"استخلاصِ وطن کے لیے برادرانِ وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔"

اسی پر مولانا مدنیؒ نے اپنی سیاسی زندگی کی بنیاد رکھی ۱۹۴۲ء میں مراد آباد کی عدالت میں بیان دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا:

"میرا عقیدہ ہو گیا تھا کہ فرقہ داری کی تنگ وادیوں سے نکل کر تمام ہندوستانی قوم اور جملہ باشندگانِ ہند کو آزاد ہونا از بس ضروری ہے۔ میں نے بیرونی ممالک میں مشاہدہ کیا تھا کہ دوسرے ممالک میں ہندوستانی خواہ مسلمان ہوں یا ہندو یا سکھ یا پارسی وغیرہ ایک ہی نظرِ حقارت سے دیکھے جاتے ہیں، اور سب کو نہایت ذلیل غلام کہا جاتا ہے۔"

اپنے اس سیاسی مسلک پر جو انھوں نے اپنی زندگی کے بہت ہی ابتدائی سالوں میں طے کر لیا تھا وہ آخر دم تک مضبوطی سے قائم رہے۔

مولانا مدنیؒ کی سیاسی جدوجہد، تحریک آزادی میں ان کی قربانیوں، مالٹا، مصر، یاغستان میں ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی پوری تفصیل اب تک سامنے نہیں آئی، "نقش حیات" میں ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ ان کی منکسرانہ فطرت اور اخفائے راز کے جذبے نے اُن کا قلم روک لیا ہے اور اپنے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے پر اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں کر پائے، ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مستقل تحقیق کے بعد ایسی تصنیف تیار کی جائے جس میں ان کی تقریروں کے علاوہ ان کے خطوط اور وہ نوٹس بھی شامل ہوں جو انھوں نے برطانوی عہد کی پیدا کی ہوئی اقتصادی بدحالی کے متعلق جمع کیے تھے، برطانوی اقتدار کے خلاف جذبات ابھارنے میں ان معلومات کا بڑا حصہ تھا۔ مولانا سید محمد میاں صاحب کے بیان کے مطابق انھوں نے اخبارات سے جو یادداشتیں جمع کی تھیں (ان کا) بیش بہا ذخیرہ ہزار رطل [illegible] اس وقت حضرت موصوف کے پاس موجود ہے" (علمائے حق ص ۲۹۱) [illegible] قیام کے زمانے میں انھوں نے جس طرح لارنس (آف عربیہ) کی تحریک سے باشندگان دیارِ نبی کو محفوظ رکھا اس کی تفصیل بھی ان کی سیاسی جدوجہد کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان تمام کارناموں کو اب تفصیل کے ساتھ آنا چاہیے۔

ہندوستان کا دستور اور مذہبی آزادی

یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کانگریس اپنے اصولوں اور نظریات پر قائم رہی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کا دستور جمہوریت اور نامذہبی اصولوں پر وضع کیا گیا۔ یہ دستور ہندوستان کے ہر باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے اور بلا اختلاف مذہب وملت ہر ایک ہندوستانی کے لیے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر طبقہ کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقاد تحفظ وترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں، جو اس سلسلے میں ہمارے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان باتوں پر غور کریں کہ ملی اور اجتماعی فرائض کیا ہیں اور ہم کس طرح اپنے مذہب، مذہبی علوم اسلامی تہذیب، اپنے مآثر ومعابد اور اپنے اوقاف کی حفاظت کر سکتے ہیں اور کس طرح ملک کی تعمیر جدید میں اپنی اسلامی تہذیب وثقافت کی حفاظت وترقی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں؟

(خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند، حیدرآباد، ۱۹۵۱ء)

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی

کا سیاسی شعور،

ڈاکٹر سید عبد الباری

"اگر لارڈ ریڈنگ ہندوستان اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلا دیں، حدیث شریف کو مٹا دیں اور کتبِ فقہ کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں۔"

یہ تھی وہ صدائے خارا شگاف جو برطانوی استعمار کے خلاف 'خالق دینا ہال کراچی کے اندر میں انگریز حکومت کے مجسٹریٹ کے روبرو بلند ہوئی تھی جہاں مولانا حسین احمد مدنی کو دیگر چھ رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر کے اس الزام کے ساتھ عدالت کے روبرو پیش کیا گیا تھا کہ انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف ترک موالات کا ملک و ملت کو پیغام دیا تھا اور انھیں الفاظ پر شیخ الاسلام نے اپنے بیان کو ختم کیا تھا، اس جملہ کا یہ اثر تھا کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے بے ساختہ آگے بڑھ کر شیخ وقت کی قدم بوسی کی۔

اپنے مشفق استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ساتھ مالٹا میں ایک طویل ایام اسیری گزارنے کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے ہوئے ابھی کچھ ہی مدت گزری تھی کہ پھر شیخ الاسلام کو پیغام اسیری آپہنچا اور یہ سلسلہ آزادیٔ ہند تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ برصغیر کی اس صدی کی نصف اوّل کی تاریخ میں طبقۂ علماء میں جن چند ہستیوں کو کبھی اس تاریخ ساز کارنامے کی وجہ سے فراموش نہ کیا جا سکے گا کہ انھوں نے مسلمانوں کو بے عملی و بے حسی کی دھند سے نکال کر حکومت و مملکت کے مسائل سے دلچسپی لینے اور امامت و قیادت کا خواب دیکھنے اور مذہب و سیاست کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتے کو بحال کرنے

کی کوشش کی، ان میں شیخ الاسلام کا نام صف اوّل میں نظر آتا ہے۔

قدیم نصاب تعلیم اور خالص مذہبی نظام تربیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ پیکر زہد و تقویٰ جس کی رگ رگ میں مشرق کی تمام تابندہ روایات اور تہذیبی اقدار کا لہو دوڑ رہا تھا، اور جس نے خالص مذہبی ماحول میں اپنے دور کے ثقہ ترین اور تقدس مآب افراد سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی اور جس کے اندر عجم کا رنگِ طبیعت اور عرب کا سوز دروں دونوں پوری دل کشی کے ساتھ موجود تھے اپنے عہد کے علماء و مشائخ کی صفوں میں بعض مخصوص اوصاف کی وجہ سے سب سے نمایاں و ممتاز ہے، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ قرار دی جائے گی کہ اس نے شاہ ولی اللہ کی اس تابناک روایت کا چراغ جسے اس کے اسلاف نے اپنے خونِ جگر سے روشن کیا تھا بجھنے نہیں دیا کہ مذہب کو ریاست کے امورِ مملکت کے مسائل سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور اسلام ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے جملہ شعبوں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے اور زندگی کے کسی گوشے کو مذہب کے دائرہ اطاعت سے خارج نہیں کیا جا سکتا، ایک مسلمان جس ملک میں رہتا ہے، جس معاشرے میں آنکھیں کھولتا ہے اور جس خاندان کے آغوش میں تربیت حاصل کرتا ہے اس کے مسائل اور اس کی ذمہ داریوں سے، اس کے دکھ اور اس کے کرب سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے شعور کی آنکھیں ایک ایسے ہنگامہ پرور دور میں کھولیں جو نہ صرف اس برصغیر کی تاریخ میں بلکہ ایشیا اور افریقہ کی تاریخ میں بے حد انقلاب آفریں دور تھا، اس صدی کے ربع اوّل میں مسلمانوں کا سیاسی و اجتماعی زوال اور تہذیبی اختلال اپنی آخری حدوں تک پہنچ گیا تھا، ایک طرف ترکمان سخت کوش خاک و خون میں لت پت تھا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد دولِ یورپ سلطنت عثمانیہ کی تکا بوٹی کر رہے تھے، دوسری طرف حرم مقدس میں شریفِ مکّہ کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں اور کھلے بندوں ناموسِ دین مصطفےٰ کا سودا انگریز سامریوں کے ہاتھوں کر رہا تھا اور تیسری طرف ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا دل وطن سے باہر طرابلس و بلقان کے خونچکاں واقعات سے تڑپ رہا تھا اور وطن کے اندر تقسیم بنگال کی منسوخی، مہاسبھا و آریہ سماج کی شدھی و سنگھٹن کی تحریکیں، مسجد کانپور کے ایک حصے کے انہدام اور جلیانوالا باغ کے خوفناک واقعات سے لرزاں و ترساں تھا، پوری ملت ڈوبے ہوئے تاروں کے ماتم میں یا پھر شکستہ آرزوؤں اور خونچکاں

حسرتوں کے ماتم میں معروف تھی، کسی طرف سے امید و آرزو کی کوئی کرن پھوٹتی نظر نہیں آتی تھی، اس نازک مرحلہ میں مشیت الٰہی نے ملت کو ایک نیا ولولہ عطا کرنے کے لیے ایک نہیں کئی کئی چراغ روشن کر دیے، ایک طرف ابوالکلام کی نوائے سینہ تاب بلند ہوئی، دوسری طرف علی برادران کی سیماب پا اور زلزلہ صفت شخصیات سامنے آئیں جیسے پرجوش پہاڑی ندی بہہ رہی ہو یا کوئی آندھی گھن گرج کے ساتھ آرہی ہو......

ان چراغوں کے علاوہ علمائے ملت کی انجمن میں ایک اور انوکھا چراغ روشن تھا، وہ اگرچہ ہندوستان کے ایک گوشہ میں جل اور پگھل رہا تھا مگر اس کی روشنی پورے عالم اسلام میں پھیل رہی تھی، وہ اپنے عہد کی تاریخ کا مزاج شناس اور آنے والے طوفانوں کا رمز شناس تھا، دیوبند میں شیخ الہند محمود حسن پورے عالم اسلام کے غم اور غلام ہندوستان کی فکر میں گھل رہے تھے، انھیں کے دامن تربیت میں مشیت ایزدی نے اودھ کے ایک دور دراز علاقہ سے ایک لالۂ صحرائی کو لا کر ڈال دیا تھا۔

..شیخ الہند نے دیوبند کو ایک بین الاقوامی مرکز بنا دیا تھا، ان کے کردار کی عظمت اور ان کی بے پناہ وسعت ظرف نے انھیں ایک ایسی شمع بنا دیا تھا جس کے گرد پروانوں کا ہجوم تھا۔ وہ ملت کے اتحاد، اسلام کے غلبہ اور دین متین کے وقار کی بحالی کے لیے سرتا پا آرزومند تھے۔ اس مقصد عالی کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے زندگی کی آخری گھڑی تک وہ یہی خواب دیکھتے رہے کہ ایشیا کے پابہ زنجیر انسانوں کو کس طرح نجات دلائی جائے، ان کی انگلیاں حالات کی نبض پر تھیں اور وہ آنے والے طوفان سے خبردار تھے، وہ عالم اسلام کے گوشے گوشے میں جو کربناک طوفان اٹھ رہے تھے ان سے باخبر تھے اور ان کے مداوے کے لیے متفکر تھے۔ انھوں نے پورے ایشیا کی آزادی کے لیے ایک منصوبہ بنایا تھا اور نہایت خاموش سفارت اور طویل و مخفی سلسلہ خط و کتابت کے ذریعے اسے کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ اس کی تفصیلات ہم ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے جب دیکھتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ انگریزی سامراج اپنے غیر معمولی وسائل اور خفیہ تنظیموں کے بہت بڑے جال کے باوجود مدت تک اس منصوبے کا بھید نہ پاسکا اور اس کی بہت سی کڑیوں سے آخر تک ناواقف رہا، افسوس کہ یہ تحریک ناکام رہی ورنہ شاید آزادی تیس پینتیس سال قبل ہی حاصل ہوتی اور زیادہ باوقار طریقے سے حاصل ہوتی۔

اس تحریک میں آخری طور سے رنگ بھرنے کے لیے جب شیخ الہند عرب پہنچے تو حالات کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ شریف مکہ کی ہوا و ہوس اور انگریزوں کے مکر و فریب کی چالیں کامیاب ہوئیں اور شیخ الہند اپنے عزیز شاگردوں کے ساتھ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے گئے، مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی زندگی کا یہی نقطہ آغاز ہے اور اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محدود قوم پرستی کے بجائے عالمگیر انسان دوستی اور ملی اخوت کے وسیع تر جذبے سے اس کی ابتدا ہوئی۔

مولانا حسین احمد مدنی نے دیوبند ہی میں اس ادارے کی نصف صدی کی روایات جہاد و انقلاب کی حرارت اپنے خون کے ہر قطرہ میں اتار لی تھی، اس حرارت کو مزید تب و تاب مدینۂ منورہ کی سرزمین پر حاصل ہوئی تھی جہاں وہ اپنے والدین کے ساتھ اس صدی کے اوائل میں چلے گئے تھے، دس سال تک انھوں نے حرم نبوی میں اللہ کے کلام اور اس کے رسول کی تعلیمات کا درس دیا تھا، ان کے شاگردوں میں رومی، شامی، مصری، ترک، ہندی اور عرب ہر طرح کے نوجوان تھے۔ یہاں پر مولانا مدنیؒ کی آرزوے جہاد و انقلاب کو فروغ حاصل ہوتا رہا، یہ تمنا وہ ہندوستان ہی سے لے کر گئے تھے اور ایک دانشور ڈاکٹر اشرف کے مطابق:

"شاید کم لوگوں کو اس کا علم ہو کہ مرحوم نے بچپن ہی سے جہاد کی تیاری شروع کر دی تھی اور نوجوانی میں ان کا یہ معمول تھا کہ مئی کی تپش اور دھوپ میں گھنٹوں ریت یا پتھر کے فرش پر چلا کرتے تھے اور جاڑوں میں کڑاکے کی سردی میں نیم برہنہ بیٹھے رہتے تھے بعض دوستوں نے جب اس لاابالی پن کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آیندہ جیلوں میں اس سے زیادہ سختیاں بھگتنی پڑیں گی۔"

(الجمعیۃ۔ دہلی، شیخ الاسلام نمبر ص۲۹)

پھر یہی سبق مولانا کو اپنے استاد شیخ الہندؒ سے بھی حاصل ہوا تھا کہ ظالم کے رو برو کلمۂ حق کہنے میں انسان کو اپنی جان کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیے، شیخ الہند کے اندر بھی یہی آرزو شمع کی مانند فروزاں تھی کہ خدا کی راہ میں انھیں اپنی زندگی قربان کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو۔ زندگی کے آخری لمحات میں آپ نے حسرت کے ساتھ اس کا اظہار فرمایا:

مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ

تھی کہ میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے۔" (نقشِ حیات حصہ دوم ص۲۶)

مالٹا کے ایام اسیری نے شیخ الاسلام کے سیاسی شعور اور بین الاقوامی فہم و فراست کو پختہ تر کر دیا، ان کے اندر اپنے استاد جیسی وسعت نظر اور آفاقیت پیدا ہونے لگی، مالٹا میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۹ء کے درمیان انگریزوں نے جن بین الاقوامی قیدیوں کا کیمپ لگایا تھا، ان میں ایشیا و افریقہ کے چوٹی کے سیاسی و فوجی لوگ تھے، ان میں جرمن، آسٹرین، بلگیرین، ترکش، عرب اور ہندوستانی سبھی تھے، ان سے تبادلۂ خیالات کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں، یہ سب برطانوی استعمار کے مارے ہوتے تھے، یہاں مسلمانوں میں آزادی ہند کے سب سے بڑے علمبردار شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی نے انگریزوں کی ایشیائیوں اور افریقیوں سے نفرت و حقارت کے برتاؤ کو دیکھا خاص طور سے ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے ذلت آمیز طرزِ عمل کا قدم قدم پر مشاہدہ کیا، چنانچہ شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

"میں نے بیرونی ممالک میں مشاہدہ کیا تھا کہ دوسرے ممالک میں ہندوستانی خواہ مسلمان ہوں، ہندو یا سکھ ہوں یا پارسی وغیرہ ایک ہی نظرِ حقارت سے دیکھے جاتے ہیں اور سب کو نہایت ذلیل غلام کہا جاتا ہے۔"

(نقشِ حیات حصہ دوم)

حضرت شیخ نے دنیا کی تمام قوموں میں انگریزوں کے اندر سب سے زیادہ عداوت اور بغض و کینہ مسلمانوں کے سلسلے میں پایا جس سے وہ صلیبی جنگوں کا انتقام لینا چاہتے تھے اور پہلی جنگ کے زمانے میں ترکی سلطنت کو ختم کر کے دل کی آگ بجھانا چاہتے تھے، لسان العصر اکبر نے اسی حقیقت کو شعر کی زبان میں بیان کیا ہے ؎

کلیسا کے مقابل آج مشکل میرا جینا ہے
کہ غیروں سے اسے غصہ ہی ہے اور مجھ سے کینہ ہے

مولانا محمود حسن کی ریشمی رومال کی تحریک کی ناکامی یقیناً ان نفوسِ قدسیہ کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی ہوگی، اس لیے کہ اوّل تو وطن اور عالمِ اسلام کی آزادی کا جو خواب انھوں نے دیکھا تھا اور جس کی خاطر مدتوں تک بے شمار جتن کیے تھے وہ چکنا چور ہو گیا،

دوسرے، اسے چکنا چور کرنے میں غیروں کے ساتھ اپنوں کی بھی کرم فرمائی شامل تھی، مگر عمر کے آخری مراحل میں جب کہ شیخ الہند اس اندوہناک ناکامی کے غم اور مالٹا کی اذیت ناک اسیری کی کلفتوں سے دوچار تھے، اس عالی حوصلہ انسان کے عزم و ہمت کا چراغ گل نہ ہوا اس لیے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے تربیت یافتہ جاں نثار اس مشن کی تکمیل کے لیے وہ ساری صفات استقلال و پامردی پیدا کر چکے ہیں جو اس صبر آزما لڑائی کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ مولانا حسین احمد اپنی خود نوشت سوانح نقش حیات میں اپنے مرشد و مربّی کے عزم و ثبات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی عبارت میں آبشاروں کا سا خروش اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔

درج ذیل سطور ایک خوش آہنگ با محاورہ اور سلیس و رواں نثر کا نمونہ ہیں مولانا کے قلم سے پُر جلال استعاروں اور پُر ہیبت تمثیلوں کی جھڑی سی لگ گئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ رکھنے والا صاحب زبان ہی ہم سے ہم کلام نہیں بلکہ اردو نثر کا ایک مزاج شناس اور اردو کے اسالیب بیان کا مزاج داں جس کی مادری زبان اردو بلکہ اودھی ہے ہم سے مخاطب ہے۔ مولانا کی نثر کے ساتھ ان کے سیاسی مشن کے جائزے کے لیے یہ طویل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"شروع شروع میں بہت زیادہ مشکلات قیاس سے زیادہ سامنے آئیں، سخت اور تیز آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا، باد سموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے، احباب و اقارب مار آستین بن گئے ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بن کر سدِ راہ بنا، اور کیسے ساتھ ہوتا، انگریزوں نے اس قدر بندش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا سنسناون کا سماں باندھتا تھا، آزادی و انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھتا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا، ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برق جہاں سوز سے زیادہ تباہ کن شمار کی جاتی تھی۔ برطانوی تشددات و مظالم کے ہونے نے اس قدر حکومت اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا، خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے لوگ کام کر رہے تھے

جن پر شبہ کرنا بے دینی اور کفر سمجھا جا سکتا تھا چاروں طرف سی آئی ڈی کا جال بچھا ہوا تھا پھر کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص ہم خیال ہم زبان یا ہم محل ہو سکتا تھا خصوصاً جبکہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے کان پر ہاتھ دھرتا ہو۔ ان حالات میں شیخ الہندؒ نے اپنی کشتی بحرِ زخار میں ڈال دی اور طوفان میں کود پڑے اور لوگوں کو ہم خیال بنانے لگے۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ سے چوں کہ ناامید و مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور مولویوں اور پیروں سے امید نہ رکھنی چاہیے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی) وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے سب سے زیادہ خطرات لاحق ہو جاتے ہیں اس لیے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھ دار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے۔"

شیخ الہندؒ کے ایسے مخلص و جانباز معتقدوں و شاگردوں کی تعداد ہزاروں تھی اور پورے برصغیر بلکہ مشرق وسطیٰ میں پھیلی ہوئی تھی، ان سب کو شیخ الہند نے اپنے مشن میں جھونک دیا اور آگے چل کر سب کا سید طائفہ حسین احمد مدنی کو بننا تھا۔

مالٹا کے بعد تربیت، ریاضت اور قرآن کی دوسری منزل تحریک خلافت تھی اور مولانا حسین احمد ہندوستان آ کر اس بھٹی میں کود پڑے۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کی تنظیم بھی وجود میں آ گئی، اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار علماء ملکی و بین الاقوامی سیاست میں حصہ لینے کے لیے ایک منظم گروہ کی حیثیت سے منظر عام پر آ گئے۔ شیخ الہند کا یہ خواب برگ و بار لایا کہ مسلمانوں کا مذہب انھیں رہبانیت نہیں سکھاتا بلکہ بنی نوع انسان کے اجتماعی مسائل حل کرنے اور معاشرے کی ضروریات پوری کرنے اور خیرا ... رہنے کی حیثیت سے تمام انسانوں کے لیے خیر و برکت اور ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بننے کا سبق دیتا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے دین کے اس جامع تصور کو لوگوں کے سامنے رکھا اور خانقاہوں اور مدرسوں سے کھینچ کر لوگوں کو میدان عمل میں لانے کی زندگی بھر جد و جہد کرتے رہے۔

بقول مولانا محمد میاں:

"آپ کا نظریہ یہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ علم کو سیاست

کے میدان میں رہنما ہونا چاہیے۔ اسی سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔"

(الجمعیۃ۔ دہلی، شیخ الاسلام نمبر ص۱۳)

چنانچہ ان بزرگوں کے لیے تحریک استخلاص وطن میں شرکت ایک مذہبی فریضہ تھا، حب الوطنی ان کے نزدیک کوئی سیاسی مسلک اور جذبہ نہیں تھا بلکہ ایک دینی فریضہ اور مذہبی جذبہ تھا، چناں چہ جس دلولہ اور جس سرفروشی کے ساتھ ان بزرگوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی، جدید ہندوستان کا مورخ ان اہل اللہ کے کارناموں کے معاملے میں اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے تو اس سے ان کی عظمت نہیں گھٹ سکتی، حقیقت یہ ہے کہ، کروڑ مسلمانوں کی روحانی و تہذیبی امامت و قیادت کرنے والے یہ افراد اگر جنگ آزادی میں شامل نہ ہوتے تو شاید یہ لڑائی نہ جیتی جا سکتی۔

مولانا حسین احمد مدنی نے ۹ر جولائی ۱۹۲۱ء میں کراچی کی خلافت کانفرنس میں وہ تاریخ ساز ریزولیوشن پیش کیا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان اور پورے ایشیا کو انگریزی استعمار سے آزاد کرانے کی جدوجہد، مسلمانوں کو دینی و مذہبی حیثیت سے شامل ہونے کی راہ ہموار کر دی اور اس انقلاب آفریں فتوے سے جو جمعیۃ العلماء نے ۴۲۵ علماء کے دستخط سے شائع کیا تھا، جنگِ آزادی کا صحیح معنوں میں بگل بج گیا۔ اس فتوے کا لب لباب یہ تھا کہ اعداے دین سے محبت و دوستی اور موالات حرام ہے اور انگریزی حکومت کے استحکام و انصرام میں شمولیت کفر ہے۔ مولانا مدنی نے اس موقع پر مسلمانوں کو عالمگیر اخوت کا پیغام خلافت کے اسٹیج پر سے مسلمانانِ ہند کو دیا تھا، اور محدود قوم پرستی کے تیشے کو اپنے تیشۂ ایمان سے چکنا چور کر دیا تھا۔ مولانا نے فرمایا تھا:

"قرآن کہتا ہے کہ مسلمان کہیں ہوں، کسی رنگت کے ہوں، کسی نسل کے ہوں، مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے، گورے رنگ کے ہوں یا کالے رنگ کے ہوں، کسی قسم کی زبان رکھتے ہوں، ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے سے غافل ہو سکے یا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ایسی حالت میں چھوڑ سکے جس میں اس پر ایک

کی کسی عزت یا مال پر صدمہ پہنچتا ہو، یہ قرآنی آیت صاف طور پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں میں آپس میں ایک دوسرے میں ایسا ارتباط ہونا چاہیے جیسا کہ ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے ہوتا ہے۔"

مولانا نے اس موقع پر پوری جرأت ایمانی کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن میں حکم ہے کہ اے مسلمانوں جو لوگ تمہاری عظمت، تمہارے ملک، تمہاری دولت، تمہاری عزت کو برباد کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ تمہارے مذہب کو دنیا سے ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ تم مقابلہ کرو۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اسلامی شہروں میں سے کسی پر کسی طرف سے حملہ ہو تو اس کے لیے بھی تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر یہ حکم فرض ہو جائے گا کہ وہ اپنی جان و مال اور روپیہ پیسہ سے ان کا مقابلہ کریں اور مسلمانوں کی مدد کریں اور کافروں کو ان کے شہروں سے نکال دیں مولانا نے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ آج یورپ یہ چاہ رہا ہے کہ حکومت اسلامی روئے زمین پر باقی نہ رہے۔

(کراچی کا تاریخی مقدمہ ص ۶۰ تا ۶۴۔ مرتبہ عبدالقادر بیگ)

اسی موقع پر علماے دین نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ چوں کہ قوانین دیوانی و فوجداری خلافِ شرع ہیں اس لیے ان کے مطابق فیصلے کے لیے عدالتوں میں جانا یا ان پر اجراے عمل کے لیے پیشۂ وکالت اختیار کرنا بھی ناجائز ہے اور ایسے تعلیمی اداروں سے بھی علیحدگی ضروری ہے، جہاں اسلام کی صورت مسخ کرنے اور ذہنوں کو دین سے برگشتہ کرنے والی تعلیم دی جاتی ہے۔ کراچی کے مشہور مقدمے میں اپنے بیان تحریری کا آغاز مولانا حسین احمد مدنی نے ان الفاظ سے کیا تھا کہ ہندوستان ایک مذہب پرست ملک ہے اور ہندوستان کی حکومت کے لیے مذاہب کی رعایت کرنی نہایت ضروری سمجھی گئی ہے اس سلسلے میں مولانا نے ملکہ وکٹوریہ کے مذہبی آزادی کے اعلان کا ذکر کیا تھا جس کی پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریز خلاف ورزی کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی جان و مال کی حرمت پر شیخ الاسلام نے اس موقعے پر جو تقریر فرمائی تھی وہ اتحادِ ملی کے چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا ملت پرست کے بجائے محض قوم پرست تھے ان کی تردید کرتی ہے۔ مولانا نے چھ آیات قرآنی اور ۴۲ احادیث صحیحہ کا حوالہ دیتے ہوئے خونِ مسلم کی حرمت پر روشنی ڈالی تھی، اس موقعے پر

ابن ماجہ کی یہ حدیث بھی پیش کی تھی:

"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کعبہ شریف کا طواف فرما رہے تھے اور فرماتے تھے کہ اے کعبہ کیا ہی اچھا ہے تو اور کیا ہی اچھی ہے تیری ہوا، تو کس قدر بڑا ہے اور تیرا احترام کس قدر بڑا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ مومن کی جان اور مال کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیری حرمت سے زیادہ ہے۔"

اس موقعہ پر مولانا نے ترمذی کی یہ حدیث بھی پیش کی تھی کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں، ان میں سے ایک دروازہ اس شخص کے لیے ہے جس نے میری امت پر تلوار اٹھائی۔"

مولانا نے آخر میں فرمایا تھا کہ

"اگر گورنمنٹ کا منشاء مذہبی آزادی سلب کرنے کا ہے تو صاف صاف اعلان کیا جائے" تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کر لیں کہ آیا ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ کی رعایا، اور اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی غور کر لیں کہ ان کو کیا کرنا ہے کیونکہ جب مذہبی آزادی چھینی گئی تو سب کی چھینی جائے گی۔"

اکبر الہ آبادی نے اس موقع پر فوج میں موجود مسلمانوں پر طنز کیا تھا کہ ؎

شیخ پر خیر بھی کرتے ہیں نمازی بھی ہیں آپ
مدد کفر بھی ہے رونق اسلام بھی ہے

مولانا حسین احمد سے زیادہ انگریزوں کے لبرل ازم اور انسانی حقوق کے معاملے بلند بانگ دعوؤں کے کھوکھلے پن کا کون جاننے والا تھا انھوں نے اپنی آنکھوں سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اس قوم کے مکر و فریب اور وحشت و بربریت کے مناظر دیکھے تھے، وہ اس قوم کے جو مجسمۂ فتنہ و فساد تھی، پُرفریب انداز کے اچھی طرح واقف تھے، غدر ۱۸۵۷ء سے لے کر تحریکِ خلافت و تحریکِ ترکِ موالات تک برصغیر اور مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک ایک باب اور ایک ایک گوشہ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہماری اس صدی کے رہنماؤں میں ان کا تاریخی شعور سب سے زیادہ بالیدہ و بیدار تھا۔ عابد الوحید الحسینی نے ان کی سیاست کا

ایک قول نقل کیا ہے کہ گوکھلے کے بعد تاریخی اعداد و شمار کو اس قدر برجستہ بیان کرنے والا مولانا مدنی کے سوا اور کوئی نہیں پیدا ہوا۔ (الجمعیۃ دہلی، شیخ الاسلام نمبر ص۲۵)

"نقشِ حیات" کے دونوں حصوں میں وہ غدر ۱۸۵۷ء سے ریشمی رومال کی تحریک کے خاتمے تک کے تمام اہم واقعات کو آئینے کی طرح سامنے رکھ دیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"یہی وہ امور تھے جس نے مسلمانوں میں ایک تڑپ پیدا کردی تھی، یہ تڑپ کیا تھی، ایک درد تھا، پوری ملت کا درد تھا جو اس کو گلوخلاصی پر مجبور کر رہا تھا، یہ ایک نیم بسمل قوم کی اضطرابی حرکت تھی جس کا منشا یہ تھا کہ ملک اور ملت ان مصائب سے نجات پائے جن کے نشتر شب و روز جسدِ ملت کے ہر رگ و پے میں پیوست تھے۔"

(نقشِ حیات (حصہ اول) آخری پیراگراف)

کراچی کے مقدمہ کے بعد ڈھائی سال جیل میں گزار کر مولانا جب باہر آئے تو تپ کر کندن بن چکے تھے۔ اب انھوں نے پوری خوداعتمادی کے ساتھ قوم کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی اور برق رفتاری کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جاکر عام ہندوستانیوں اور اپنی ملت کے افراد کو مخاطب کرنے اور جھنجوڑنے لگے سیاسی بیداری کے ساتھ اخلاقی تربیت اور روحانی تزکیے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے عافیت پسند طبقے اور مذہب کا ایک محدود تصور رکھنے والے دیندار گروہ کے طلسم سے مسلمانوں کو نکالے بغیر کوئی انقلاب نہیں آسکتا مغرب سے مرعوبیت ختم کرنے میں انھوں نے اپنی تقریر و تحریر اور وعظ و نصیحت سے کلیدی رول ادا کیا، وہ انگریزی سامراج کے ان ستونوں کو گرانا چاہتے تھے جو انھیں کی ملت کے ان افراد نے تعمیر کیے تھے جن کو اپنی دنیا عزیز تھی۔ نقشِ حیات میں وہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر کا یہ قول نقل کرتے ہیں، جو اس کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" سے اخذ کیا گیا ہے:

"مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باعزت و خوددار ہیں، دنیادار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں، ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار نہ کرنا جانتا ہو، ایشیا کے پھلنے

پھولتے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقے کی امداد حاصل ہے، یہ لوگ اگرچہ کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائیداد کے مالک ہیں، اپنی نمازیں ادا کرتے ہیں اور بڑے اعتماد سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پروا نہیں کرتے۔"

شیخ الہندؒ نے اس ہوشربا دور میں انگریزوں سے گلو خلاصی اور ہندوستان میں ایک خود مختار اور آزاد حکومت کا خواب دیکھا اور اسے شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے برادران وطن سے تعاون کی اشد ضرورت محسوس کی، مولانا حسین احمد مدنی جس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام کو پوری دنیائے انسانیت کے بہی خواہ کی حیثیت سے دیکھتا تھا، ایک بار مولانا احتشام الحق کاندھلوی کی روایت کے مطابق مولانا محمد الیاس نے مولانا مدنیؒ سے مسلمانوں کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی تو شیخ وقت نے تیز لہجے میں فرمایا کہ کیا غیر مسلم مخلوقِ خدا نہیں۔

مولانا مدنیؒ نے ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت سے تعاون کا اصول اپنے استاد سے اخذ کیا تھا، جنھوں نے اتحاد و تعاون کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کچھ بنیادی اصول معیّن کر دیے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن علی گڑھ میں جامعہ ملیّہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد، جب دہلی تشریف لائے تو یہاں جمعیۃ العلماء کے دوسرے اجلاس کی صدارت فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا:

"میں ان دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں، اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حالات اگر اس کے مخالف ہو گی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔"

شیخ الہند نے مزید فرمایا تھا:

"ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی اور طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست دے سکے گی۔ ہاں! یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب میں فریقین کے مذہبی امور میں سے ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے، مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ہر ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے۔

شیخ الہند کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی معاملات اور سرکاری محکموں میں رقابتوں پر افسوس تھا، بہر حال ملک کی اکثریت سے اصولی اتحاد کا درس شیخ الہندؒ نے دیا تھا، اس کی شیخ الاسلام نے زندگی بھر پیروی کی اگرچہ اس راہ میں انھیں فرقہ پرست قوتوں کی وجہ سے اکثر نہایت کبیدہ خاطر ہونا پڑا، مذکورہ بالا خطبہ میں شیخ الہندؒ نے وضاحت کر دی تھی کہ مذہبی حقوق اور اسلامی تشخص کو قربان کر کے کسی طرح کا اتحاد قائم نہیں کیا جا سکتا، مرحوم نے نظریاتی اور فکر و عقیدہ کی بنیاد پر ہندوستان میں الگ الگ قوموں کے وجود کو بھی تسلیم کیا تھا جیسا کہ "نقش حیات" حصہ دوم کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، بعد میں چل کر کانگریس نے جب جغرافیائی بنیاد پر قومی وحدت کا تصور پیش کیا اور اس کی مولانا حسین احمد مدنی نے حمایت کی تو اس عہد کے بہت سے اسلامی مفکرین نے انھیں تنقید کا نشانہ بنایا، اگرچہ شیخ الاسلام جغرافیائی بنیاد پر ایک ہندوستانی قوم کے تصور سے قطعاً یہ معنی نہیں لیتے تھے کہ مسلمان اپنے ملی تشخص کو ترک کر دیں یا اپنے مذہبی حقوق کو خیر باد کہہ دیں دراصل مولانا قوم یا نیشن کو ملت سے الگ ایک سیاسی اصطلاح کے طور پر محدود معنوں میں استعمال کرتے تھے، جہاں تک ملی و مذہبی غیرت کا معاملہ ہے، دو قومی نظریے کے

علمبرداران کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس طرح کے معاملات میں مولانا مرحوم سے تمام اصحاب اجتہاد کی طرح خطائے اجتہادی تو ممکن تھی لیکن ان کے خلوص وللّٰہیت پر کسی کو انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اس لیے موقع پرستی، سربلندی وقیادت کی خواہش اور حب جاہ کی آرزو سے مولانا کی ذات بہت بلند تھی،

شیخ الاسلام کی سیاسی بصیرت کی روداد جمعیۃ العلماء کی سرگرمیوں کے جائزے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ برصغیر کے اس صدی کے نصف اول کی تاریخ میں مسلمانوں کی سیاسی تگ و تاز کا جائزہ لینے والے اہل نظر کو یہ شکوہ ہے کہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کی کوئی متعین پالیسی کبھی نہیں رہی، مگر میرے خیال میں اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت میں آزادی ہندوستان تک جمعیۃ العلماء بڑی حد تک جس متعین پالیسی پر کاربند رہی، وہ یہ تھی کہ اس ملک میں الگ سے تن تنہا کوئی اسلامی انقلاب نہیں برپا کر سکتے البتہ ایک برابر کے پارٹنر کی حیثیت سے برادران وطن کے ساتھ مل کر اگر وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں تو ضرور آزادی کے بعد نئے ہندوستان میں ان کو اس ملک میں اپنے مذہبی امتیازات کے ساتھ باوقار زندگی گزارنے کا موقع ملے گا، مولانا مدنیؒ کی قیادت میں جمعیۃ نے کانگریس کے ضمیمے کے طور پر کبھی کام نہیں کیا جیسا کہ کچھ لوگ اس کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے رہے ہیں، ملک کے سیاسی مورخین خواہ اسے تسلیم نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جمعیۃ نے اپنے ساتویں سالانہ اجلاس (بمقام کلکتہ ۱۹۲۶ء) میں مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں آزادی کامل کی تجویز منظور کی تھی اور جب کانگریس نہرو رپورٹ کے تار عنکبوت میں الجھی ہوئی تھی، جمعیۃ نے نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا تھا اور یہ ریزولیوشن منظور کیا تھا:

"چونکہ برادران وطن کے منافقانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے اس لیے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بل پر ملک کو آزاد کرائیں البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحاد عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے۔"

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، طفیل احمد منگلوری ص۵۳۱)

اس موقعے پر جو نکات طے کیے گئے تھے وہ یقیناً جمعیۃ العلماء کو شیخ الاسلام

کی سرپرستی میں مسلمانوں کے سیاسی شعور کی تربیت اور دین کے ایک وسیع و جامع تصور سے ملت کو روشناس کرانے کی سعی مبارک قرار دیے جائیں گے، وہ نکات یہ تھے:

(۱) مسلم قوم عموماً اور علما بالخصوص سیاسی امور میں غور و خوض کیا کریں۔

(۲) آزادیٔ ہند کے فریضہ ہونے کے وجوہ و اسباب کو نہایت غور و خوض سے دریافت کریں اور لوگوں کو سمجھائیں اور دیگر مذہبی امور کی اشاعت کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں۔ آزادی اور دیگر حقوق کے سلب ہونے کی مضرتوں اور مفاسد کی اشاعت نہایت پرامن طریقے سے کر کے ہر مسلمان کو زندہ کریں۔

۱۹۳۰ء کے نویں اجلاس میں جو امروہہ میں منعقد ہوا، جمعیۃ نے کانگریس کمیٹیوں کی مہلہ سبھائی ذہنیت پر اظہار افسوس کیا اور گول میز کانفرنس میں شرکت کو کارِ لاحاصل قرار دیا، دسویں اجلاس میں جو بہ مقام کلکتہ ۱۹۳۱ء میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا جمعیۃ نے مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی اور پرسنل لا کی حفاظت کا مطالبہ کیا، اور اپنے گیارھویں اجلاس میں جمعیۃ نے ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی کی واردھا تعلیمی اسکیم کو نامنظور کر دیا اور اس کے ساتھ ودّیا مندر کی تعلیمی اسکیم سے اختلاف کیا۔ کانگریس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کی حق تلفیوں کی تحقیقات کے لیے کمیٹی مقرر کرے، جمعیۃ نے ہندوستانی زبان کو سنسکرت کے قالب میں ڈھالنے پر بھی اظہار افسوس کیا، ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں جس کی صدارت خود شیخ الاسلام نے کی اور جس میں مولانا کا خطبۂ صدارت ان کی جرأت حق گوئی اور اظہار بے باکی کی وجہ سے انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا جمعیۃ نے ان لوگوں کی مذمت کی جو مسلم پیشہ ور برادریوں کو رذیل قرار دے کر اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں ۱۹۴۲ء میں لاہور میں جمعیۃ نے مولانا حسین احمدؒ کی صدارت میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ مختلف فیہ مسائل پر ایک دوسرے کو سب و شتم نہ کریں اور باہمی تعاون کر کے مثل ایک دیوار کے ہو جائیں، جمعیۃ نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلط برداشت نہیں کرے گی اور ایسی آزادیٔ کامل کے لیے جدوجہد کرتی رہے گی۔ اس میں مسلمانوں کے سماجی و تعلیمی مسائل پر بھی کچھ تجاویز منظور کی گئیں۔ سہارنپور کے اجلاس میں جو ۱۹۴۵ء میں شیخ الاسلام کی صدارت میں ہوا جمعیۃ العلما نے مسلمانوں میں

عسکری نظم پیدا کرنے کے لیے انصار اللہ رضا کاروں کو تقویت پہنچانے اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ تنظیم مساجد اور ائمۂ مساجد کے ذریعے مسلمانوں میں اصلاحی نظام عمل کی ترویج و اشاعت پر زور دیا گیا، مسلمانوں کو تعلیم کے فروغ اور گھریلو صنعتوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ کانگریسی وزارت کے کچھ اراکین کی اردو کے سلسلے میں معاندانہ پالیسی کی مذمت کی گئی اور مسلمانوں کے لیے ایسی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کا مطالبہ کیا گیا کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں پر تعدّی نہ کر سکے اور اس کی صورت یہ ہو کہ مسلمانوں کو مرکزی ایوان میں مسلمان ممبروں کی تعداد ہندوؤں کے مساوی ہو، گویا اس منزل تک آتے آتے کانگریس کے اندر فرقہ پرست عناصر کی طرف سے خود جمعیۃ العلما بھی اندیشناک ہو گئی تھی اور مسلمانوں کے تحفظات کا مطالبہ کرنے پر خود کو مجبور پا رہی تھی۔ ایک مرحلہ وہ تھا کہ جمعیۃ کانگریس پر کلی اعتماد کے ساتھ آزادی کی لڑائی میں شامل ہو گئی تھی اور جب لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا حسین احمد مدنی سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ جمعیۃ کی طرف سے کیا مطالبہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو شیخ الاسلام نے صرف اس قدر فرمایا تھا کہ "ہمارا مطالبہ تو ایک ہے وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لیے قاضی مقرر کرنے کا حق کیا جائے اور ہم نے کانگریس سے کہہ دیا ہے کہ جب تک ملک کو آزادی حاصل نہ ہو ہم خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے، البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اس وقت اگر ہم میں قوت ہو گی تو ہم اُسے منوا لیں گے۔

مولانا اپنی زندگی کے آخری ایام میں تدریسی مشاغل اور بندگان خدا کی روحانی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تاکہ ملت کی اخلاقی و روحانی طاقت برقرار رہے مولانا نے آزادی کے بعد اقتدار میں شرکت گوارا نہ کی۔۔۔۔۔ ہر شخص ملک کی خدمت کی قیمت وصول کرنے میں لگ گیا اور مولانا ان عظیم مقدس اور مخلصانہ جد و جہد کا یہ انجام دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے اس لیے کہ انھوں نے اپنی ساری سیاسی جد و جہد ایک دینی فریضہ سمجھ کر کی تھی۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

"مولانا اس کام کو اپنا ایک دینی فرض سمجھ کر اور ایک عقیدہ و ارادہ کے ماتحت کر رہے تھے، وہی بے غرضی وہی مستعدی وہی جفاکشی جو ایک

سپاہی ہی میدان جنگ کے اندر ہوتی ہے۔"

جنگ آزادی کے آخری چند سال مولانا پر بہت سخت گزرے جب کہ خود ان کی ملت کا ایک بڑا طبقہ ان کے مد مقابل آ گیا اور ان کے دین و ایمان اور ان کے کردار و اخلاص ہر شئی پر حملہ آور ہو گیا مگر اس وقت بھی وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کا پوری بے جگری کے ساتھ اعلان کرتے رہے، جب انگریز جیسی جابر طاقت سے ذرہ برابر نہ ڈرے تو پھر اپنوں کی حماقتوں سے کیا ہراساں ہوتے، کمال یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کے الفاظ ہیں:

"ان کے سامنے ایسے مسئلے آئے کہ اگر وہ عوام کے رجحانات کی پیروی کرتا تو کروڑوں گردنیں اس کے سامنے جھک سکتی تھیں اور اگر وہ خاموش رہتا تو اپنے ارادت مندوں کی نظر میں اور اونچا ہو سکتا تھا لیکن اسی حمایت حق اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے میں نہ اعزاز و احترام کا خیال کیا اور نہ برگشتگی عوام کا خوف اس کے پائے ثبات میں کوئی جنبش پیدا کر سکا۔"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۷)

آزادی کے بعد شیخ الاسلام اپنی قوم کے کچھ ناعاقبت اندیش افراد کی ستم رانیوں کو فراموش کر کے اس کشتی کی ٹوٹی ہوئی پتوار کو درست کرنے میں لگ گئے، اور لوگوں میں خود اعتمادی، مستقبل کی طرف سے اطمینان اور وطن میں رہنے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی تبلیغ کرتے رہے، ترکِ وطن سے انھوں نے مسلمانوں کو روکا اور تقسیم کے وقت دہلی میں یہ اعلان فرمایا:

"میں نے تو ہندوستان میں مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

ایسا نہیں کہ آخری ایام میں وہ ملک و ملت کے روشن مستقبل سے مایوس ہو گئے ہوں، فرقہ پرست عناصر کی ریشہ دوانیوں سے نبرد آزما ہونے کا ان کے اندر اب بھی حوصلہ برقرار تھا جو آزادی کے ثمرات سے ملک کے کمزور طبقات کو محروم کرنا چاہتے تھے ..... اخیر میں اس عظیم المرتبت مذہبی و سیاسی رہنما کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک وہی انسان عظیم ہے جو اپنی بہترین صلاحیتوں کو پورے طور پر عمر کے آخری مراحل تک بر سر کار لاتا رہے اور زندگی کے کسی مرحلہ میں پست ہمت اور دل شکستہ نہ ہو اور نہ اپنی زندگی کے مشن سے کنارہ کش ہو اور اس کی امید و آرزو

کا چراغ ہزار آندھیوں کے بالمقابل جلتا رہے، اس پیمانے پر جب ہم دیکھتے ہیں تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کو اس صدی کا ایک عظیم و عالی مرتبت انسان، فخر کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔

ذلک لمن عزم الامور

حضرت نے اپنی زندگی میں چالیس پچاس برس تک دن رات جس وقار اور عزیمت کے ساتھ عداوتیں، طنز و تشنیع، ناگفتہ بہ کلمات اور مختلف قسم کی ناروا حرکات برداشت کیں۔ اس کی بہترین تفسیر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ واذا مروا باللغو مروا کراما واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما کسی بھی مخالفت، عداوت، سب و شتم الزام تراشی اور ہلڑ بازی پر کبھی کسی زبانی یا عملی شکوہ و شکایت کا اظہار نہیں کیا۔ خود تو حلم و بردباری اور صبر و برداشت کا ثبوت دیتے ہی تھے، مخلصین و متعلقین کو بھی صبر و شکر کی تاکید کرتے تھے:

> "اگر میں حق پر ہوں اور مخلصانہ مذہبی اور اسلامی خدمات کرتا ہوں تو غیروں اور اپنوں سے جو کچھ بھی اذیتیں پیش آئیں یا آرہی ہیں، ان کے لیے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے احوال اور اعمال مشعل راہ ہیں۔ جو جو مصائب انبیاے کرام اور اولیاے عظام اور مقدس علماء کو پیش آئے ہیں۔ ان کے سامنے ہمارے مصائب تو وہ نسبت بھی نہیں رکھتے جو ذرے کو پہاڑ سے ہے۔ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل سے تو بشارت حاصل ہوتی ہے۔ جس سے قبولیت عند اللہ کا پتہ چلتا ہے اور اگر خدا نخواستہ میں غلط راستے پر ہوں اور معاذ اللہ ضلالت اور گمراہی میں پھنسا ہوا ہوں تب تو اس کا مستحق ہی ہوں۔" (مکتوبات شیخ الاسلام: ج ۲، ص ۳۸۳)

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی از فرید الوحیدی، ص ۹۲۔ ۳۹۱)

صاحب عزیمت سیاسی رہنما،

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی

(۱)
عزم واستقلال

کوئی شخص ماں کے پیٹ سے بڑا آدمی بن کر نہیں نکلتا۔ البتہ بڑا آدمی بننے کی قابلیت وصلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے پھر جو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ سے کارِ نمایاں انجام دیتا ہے وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے ؎

ہمت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق
باشد بقدر ہمتِ تو اعتبارِ تو

حضرت مدنیؒ کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں جو کام بھی انجام دیا پورے عزم واستقلال اور انتہائی ہمت وحوصلہ کے ساتھ انجام دیا جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ وہ بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ میں جوانمرد تھے جو تمام جوانمردوں سے سبقت لے گئے تھے۔ برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے، حصول آزادی کے لیے جو جدوجہد کی اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ووقعت برقرار رکھنے کے لیے جو کارنامے انجام دیے وہ آپ ہی کا حصہ تھا اور ابھی کچھ اور زندہ رہتے تو پھر کا کچھ کر جاتے جو برطانیہ کی سنگینوں سے ڈرنے والا نہ تھا وہ ہندوستانی حکومت سے کسی حالت میں بھی مرعوب نہیں ہو سکتا تھا۔ بے پناہ جذبات تھے جن کو بروئے کار لانے کے لیے وقت درکار تھا، حصول آزادی کے بعد ایک مرتبہ میں نے حضرت مدنیؒ کی خدمت

میں عرض کیا کہ اب تو حضرت کی حکومت بن گئی۔ ہنس کر فرمایا:

"ہمارے لیے تو پہلے بھی جیل خانہ تھا اب بھی جیل خانہ ہے"۔

اسی ایک فقرہ سے اندرونی سارے جذبات اور رجحانات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنیؒ کے عزم و استقلال کا ایک ادنی کرشمہ ہے ورنہ نہ معلوم مسلمانوں کی تباہی اور مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچتی اور نقشہ کیا سے کیا ہو جاتا۔

۱۹۴۷ء کے خونیں ہنگامہ میں جب کہ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑ رہی تھی اور مسلمان کے لیے کوئی جائے امان نظر نہ آتی تھی حضرت مدنیؒ پورے عزم و استقلال اور ہمت و حوصلہ کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانے کی کوشش میں مصروف تھے اور پورے وثوق کے ساتھ مسلمانوں کے ہند میں رہنے کی تلقین فرما رہے تھے۔ ایک آہنی دیوار بن کر سہارن پور کی سرحد پہ جم گئے اور اس تباہی کے آگے بڑھنے کی پوری روک تھام کی۔ اس وقت آپ جہاں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا سبق پڑھا رہے تھے۔ وہاں حکومت کی کوتاہیوں پر بھی سخت تنبیہ اور بازپرس فرما رہے تھے۔ اسی دوران جب کاندھلہ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ ہندوستان چھوڑنا تو نہیں ہے۔ لیکن یہ فرمائیے کہ یہاں کس طرح ٹھہرا جائے؟

ارشاد فرمایا:

"ہمت و حوصلہ اور عزم و استقلال کے ساتھ خدا پہ بھروسہ رکھو"

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران آپ نے پنڈت پنت وزیر اعلیٰ یوپی سے سخت غضبناک لہجہ میں حکومت کے رویہ کے خلاف بازپرس کی تو پنڈت پنت نے کہا کہ دارالعلوم کی حفاظت کے لیے فوج بھیج دی جائے تو حضرت مدنیؒ نے سخت غصہ میں فرمایا:

"دارالعلوم تو خدا کا ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ آپ سہارن پور کی خبر لیجیے اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ کرنے کے بارہ میں مذبذب ہیں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دے دیں میں مسلمانوں سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کر لیں"

ان تہدیدی کلمات کے بعد حد بد انتظام مکمل کیے گئے۔ اور فسادات کی بھڑکتی

ہوئی آگ آگے بڑھنے سے رکی

(۲)

جدّوجہد آزادی

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے برطانیہ کے روز افزوں اقتدار اور استبداد اور مسلمانوں کے روز بروز تنزل و انحطاط سے متاثر ہو کر برطانوی استبداد سے خلاصی اور مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لیے ایک اہم تحریک جاری کی تھی جو چند امور پر مشتمل تھی۔

(۱) ہر ممکن طریقہ سے برطانوی اقتدار کے خاتمہ کی کوشش کرنا اور غلامی سے آزادی حاصل کرنا اور بیرونی استبداد کا خاتمہ کرنا۔

(۲) ناواقف مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات کا واقف اور کر پیرو کار بنانا۔

(۳) ایسے علمی مراکز قائم کرنا جن میں اسلامی تعلیم و تربیت ہو اور اسلامی مجاہد اور اسلام کو پھیلانے والے رہنما کار پیدا ہوں۔

(۴) اسلام سے ناواقف لوگوں کو اسلام سے باخبر بنانا اور اسلامی تعلیمات کو اس انداز کے ساتھ پیش کرنا کہ طبیعتیں جلد قبول کرلیں۔ اس آخری مقصد کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے متعدد رسالے بھی تحریر فرمائے جن میں عجیب و غریب انداز سے خوش اسلوبی کے ساتھ اسلام کو پیش کیا اور تمام اسلامی تعلیمات کو عقلی طور پر ضروری اور مفید ثابت کیا تاکہ مسلمان اسلام کو سمجھ کر دوسروں میں پھیلائیں۔

حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد ان کے شاگردوں اور مریدوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں نے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جان توڑ کوشش کی اور ہر نوع کی قربانی دی پھر ولی اللٰہی سلسلہ کے تمام بزرگوں نے ان مقاصد کو اپنایا لیکن ہر ایک نے اس مقصد میں زیادہ محنت و جانفشانی کی جو اس کو زیادہ اہم نظر آیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی

حضرت مدنیؒ تھے۔

حضرت مدنیؒ کی سیاسی زندگی اور جدوجہد آزادی کا اس وقت آغاز ہوتا ہے جب آپ ۱۹۲۰ء میں مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی آپ بھی سرگرمی کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔ اگرچہ شروع سے آپ حضرت شیخ الہند کے شریک کار رہتے اور ہر خفیہ تحریک کے رازدار اور معین و مددگار رہے تھے۔ مگر یہ خفیہ کاروائیاں منظر عام پر اسی وقت آئیں جب آپ مالٹا کی رہائی کے بعد برملا سیاسی میدان میں کود پڑے اور پوری سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ ہر اس تحریک میں حصہ لیا جو برطانیہ کے خلاف جاری تھی۔ پھر جب جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تو آپ نے اس کانفرنس میں ایک اہم تجویز پیش کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ:

"موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے۔ اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشین کر دے۔"

اس کی پاداش میں حضرت مدنیؒ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور دوسرے حضرات کی گرفتاری عمل میں آئی اور خالق دینا ہال، کراچی میں مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ حضرت مدنیؒ کا جب بیان ہوا تو آپ نے بے خوف وخطر صاف طور پر کہہ دیا کہ:

"اگر مذہبی فرائض کا لحاظ و احترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلے کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے کے لیے تیار ہے تو مسلمان جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں گے۔ اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کر دوں گا۔"

آخری الفاظ پر بے ساختہ مولانا محمد علی مرحوم نے حضرت مدنی کے قدم چوم لیے جو گویا اس بات کی شہادت تھی کہ "میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا۔"

غرض اس مقدمے میں سب ماخوذین کو دو دو سال قید سخت کی سزا ہو لی۔

حضرت مدنیؒ نے دو سال قید کی سختیاں بھگتنے کے بعد پھر اپنی سیاسی سرگرمیوں کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ آپ کے مخلص ہمدردوں کی خواہش تھی کہ دو سال کی سخت سزا کے بعد کچھ آرام فرمائیں۔ کچھ اپنے رویّہ میں نرمی اختیار کریں۔ ایک مرتبہ ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی حضرت مدنیؒ نے جواب دیا میں نے ایک ڈاکو کو دیکھا جو پچیس سال سے جیل میں ہے۔ کچھ دنوں کے لیے باہر جاتا ہے پھر آجاتا ہے۔ جب ڈاکوؤں میں یہ ہمت ہے تو ہماری ہمت تو اس سے بہت بلند ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ ہر وقت جدوجہد آزادی میں منہمک رہنے لگے اور جب دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی پر آپ کو مجبور کیا گیا تو آپ نے اس کو ان شرائط کے ساتھ قبول کیا۔

(۱) سیاسی خدمات پہ کوئی پابندی نہ ہوگی۔

(۲) دارالعلوم کی جانب سے سیاسی امور میں کوئی مخل نہ ہوگا۔

(۳) ہر مہینہ میں ایک ہفتہ کی رخصت ہوگی۔ تاکہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے دیو بند سے باہر دوسرے مقامات کا سفر کیا جاسکے۔

(۴) ایک ہفتہ سے زائد اگر رخصت لی گئی تو اس پر تنخواہ وضع کی جائے گی۔

دارالعلوم کی صدارت کے بعد پھر اسی نظام سے سیاسی جدوجہد جاری رہی حضرت مدنیؒ کا جمعہ ہمیشہ سیاسی کام کے لیے باہر گزرتا تھا۔ اور طویل سفروں کے لیے مزید رخصت بھی لی جاتی تھی آپ نے ان سفروں سے ہندوستان کے طول و عرض میں چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں بیداری پیدا کی۔ اور برطانوی ظلم و استبداد سے خلاصی اور حصول آزادی کا عام جذبہ پیدا کر دیا۔ اور اس مقصد کے لیے اس قدر سفر کیے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ سال کا قریب قریب نصف حصہ سفر ہی میں گزرتا تھا۔ اور حصول آزادی کے لیے وہ قربانیاں دیں جو کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ حضرت مدنی کی تقریر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ واقعات اور خود برطانوی تحریرات سے حکومت برطانیہ کی مخالفت ہوتی تھی محض الفاظ کی بارش نہ ہوتی تھی۔ اس لیے آپ کی تقریر حکومت برطانیہ کے خلاف ایک زبردست تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور سامعین کے قلوب میں راسخ ہو جاتی تھی اسی لیے حکومت برطانیہ

آپ کو بڑا خطرناک آدمی سمجھتی تھی۔ اور آپ کی روک تھام کے لیے ہر وقت تدابیر کرتی رہتی تھی۔ مگر آپ کسی حال میں رُکنے اور جھکنے والے نہ تھے اور کسی زبردست طاقت سے ڈرنے والے نہ تھے۔

انجام کار برطانیہ کو اپنا بوریا بستر اٹھانا پڑا اور ہندوستان کو اس بیرونی استبداد سے خلاصی ملی اور قوم کو آزادی حاصل ہوئی۔

حضرت مدنیؒ کی یہ ساری جدوجہد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب والی تحریک کے مقصد اوّل کے لیے تھی جس کی آپ کے ہاتھوں تکمیل ہوئی۔

پھر یہ آپ کا کمالِ سیادت اور کمالِ طریقت تھا کہ آپ نے اس سیاسی پلیٹ فارم سے بھی مسجد و خانقاہ کا کام لیا۔ اور انہی سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ لوگوں کو "راہِ سلوک" طے کرایا اور بہت سے بندگانِ خدا کو عارف باللہ اور ولی کامل بنا دیا۔ اور اسی سیاسی پلیٹ فارم سے سیکڑوں غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخلاق و کردار سے باخبر اور واقف بنا دیا۔ اس مقصد کی تکمیل اور حصولِ آزادی کے بعد آپ ہمہ تن پوری سرگرمی اور گرمجوشی کے ساتھ دیگر مقاصد کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اگرچہ سیاسی سرگرمیوں کے دوران بھی آپ ان دیگر مقاصد میں برابر کوشش کرتے رہے تھے ...... مگر حصولِ آزادی کے بعد تو صرف وہی مقاصد اصلی مقاصد زندگی بن گئے تھے اور دوسرا کوئی مقصد و مشغلہ سامنے نہ تھا۔

تحریک آزادی میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ،

پروانہ ردولوی

حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی زندگی ملک کی تاریخ کا زریں باب ہے اور بغیر کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا راستہ جن ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے ان میں حضرت شیخ کے منجھے ہوئے ہاتھ بھی شامل ہیں، یہ ان کے عزم واستقلال اور ایثار و قربانی کا چراغ تھا جس کی روشنی سے ملک کا گوشہ گوشہ منور ہو چکا ہے۔

۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کا جو شعلہ بھڑکا تھا وہ ظاہر کی نظر سے اگرچہ روپوش ہو گیا تھا لیکن باطن کی بھٹیوں میں بھڑک رہا تھا، اور اس مقدس شعلہ کو اپنے سینے میں چھپا کر رکھنے والا دارالعلوم دیوبند کا بانی تھا۔ ظاہر ہے کہ دارالعلوم کی بنیاد دینی و روحانی تعلیم و تربیت کے ساتھ وطن آزادی کے پاکیزہ جذبات پر رکھی گئی تھی اس لیے اس عظیم درسگاہ کی ایک ایک اینٹ میں قومی آزادی کی تڑپ موجود تھی جس کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ اس درسگاہ کا ہر طالب علم تزکیہ نفس پاک باطنی، روشن ضمیری روحانی بصیرت اور سیاسی بصارت کے گوہر نایاب لے کر نکلتا تھا اور اس درسگاہ کی مسند پر جو ہستیاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرماتی تھیں وہ دینی و روحانی تعلیم و تربیت کے ساتھ جنگ آزادی کے جری اور سرفروش مجاہد بھی تیار کرتی تھیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی و روحانی تعلیم و تربیت اور وطنی جہاد میں عملی تربیت کا کام شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا، اور حضرت شیخ کو اپنی سیرت کا صحیح نمونہ بنا دیا۔ جس میں خود حضرت شیخ کی انفرادیت کا دیدہ زیب رنگ اپنی انسانی حیثیت سے موجود رہا۔

حضرت شیخ کی سیاسی زندگی، حضرت شیخ الہند کی سرپرستی میں اگرچہ ہندوستان ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن ان کی سیاسی زندگی کا عملی آغاز ۱۳۳۳ھ سے ہوتا ہے جبکہ حضرت شیخ الہند نے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے سفر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا،

ہندوستان کے عمال حکومت اور برطانیہ کے مدبران کو الجھن تھی کہ حضرت شیخ الہند ہندوستان چھوڑ کر حجاز کیوں جا رہے ہیں، یہ الجھن بے وجہ نہیں تھی اس وقت برطانیہ اور جرمنی کی جنگ شروع ہو چکی تھی، حکومت ترکی نے جرمنی کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا اور برطانیہ کے خلاف میدانِ جنگ میں اتر آیا تھا، حضرت شیخ الہند کی جانب سے حکومت برطانیہ کو گمان تھا کہ آپ سفرِ حج کے دوران حکومت ترکی حمایت کریں گے اور حکومت برطانیہ کے خلاف مسلم ممالک کو جنگ کے لیے تیار کریں گے، حضرت شیخ الہند کی طویل سیاسی زندگی کے پس منظر میں حکومت برطانیہ کا یہ گمان غلط یا بے جا بھی نہ تھا،

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ ایک پر جوش انقلابی اور ایک سرفروش مجاہد تھے بلکہ آزادیٔ وطن کی تحریک کے امام بھی تھے آپ نے یہ طے کر لیا تھا کہ انگریز گورنمنٹ کو ہندوستان سے ختم کر کے اپنے وطن کو ہر قیمت پر آزاد کرایا جائے لہذا تجویز ہوا کہ ایک طرف تو شمالی و مغربی سرحدوں سے ہندوستان پر حملہ ہو اور دوسری طرف ہندوستانی عوام اندرون ملک بغاوت کر دیں۔ اور اس طرح سلطنتِ برطانیہ کو ہندوستان میں تباہ و برباد کر دیا جائے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق افغانستان، ایران اور ترکی کے بعض لوگوں سے قائم ہو چکا تھا، سرحدی قبائل کے مؤثر لوگ حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مرید تھے جو اپنے اپنے مقام پر پہنچ کر کام شروع کر چکے تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین تیغ بدست و سر بکف تھے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے منتظر تھے مگر بعض یگانوں ہی کو یہ بات نہ بھائی اور ان کے توسل سے گورنمنٹ آف انڈیا کو حضرت شیخ الہند کی اسکیم کا پتہ چل گیا مگر گورنمنٹ حضرت شیخ الہند کے خلاف کوئی شہادت فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خاص مرید مولانا عبید اللہ سندھی۔ فتح محمد
[illegible] علی کو شمالی و مغربی سرحد اور ترکی کے لیے روانہ کیا تھا، یہ حضرات ۱۹۱۵ء میں یہاں سے
[illegible] اس وقت تک مایوسی کی کوئی بات ان حضرات کے سامنے نہیں تھی بعد میں حالات
[illegible] سے اور حضرت شیخ الہندؒ بیت اللہ کے لیے روانہ ہوگئے، یہ ان حضرات کا کمال تھا کہ
گورنمنٹ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو معہ رفقاء کے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا اور

رولٹ کمیٹی کو تحقیقات کے لیے متعین کیا گیا، مگر یہ کمیٹی اپنی تحقیقات کے دوران حضرت شیخ الہند کی سرگرمیوں اور ان کی سیاست کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔ ریشمی خطوط کی سازش کا تمام تر ذمہ دار مولانا عبید اللہ سندھی کو قرار دیا گیا اور لکھا کہ عبید اللہ سندھی سکھ گھرانے میں پیدا ہوا مسلمان ہو کر دیوبند پہنچا وہاں مذہبی تعلیم پائی اس نے وہاں برطانیہ کے خلاف جنگی سازشیں کیں، ان سازشوں سے کچھ طلبہ متاثر ہوئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس تحریک کے بانی نہیں ہیں بلکہ عبید اللہ سندھی اصل بانی ہیں جو اس وقت انگریزیہ کی حدود سے باہر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو پھانسی اور گولی کے نشانہ سے بچا لیا اور مالٹا میں آپ قید کر دیئے گئے۔

آخر حالات بدلے ترکی اور جرمنی جنگ میں ہار گئے، برطانیہ کو فتح ہوئی اور تمام نظر بندوں کی رہائی کی بحثیں شروع ہوئیں، دسمبر ۱۹۱۹ء میں اعلان ہوا کہ تمام قیدی چھوڑ سے جائیں گے چنانچہ ۱۲ ۔ مارچ ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مالٹا سے روانہ ہوئے۔ ۷/ جون ۲۰ ۱۹ء کو ممبئی پہنچے مگر جہاز سمندر میں دو میل کے فاصلہ پہ کھڑا رہا۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء نے ۸/ جون ۲۰ ۱۹ء کو ممبئی بندرگاہ پر اتر کر مخصوص حضرات سے مصافحہ و معانقہ فرمایا ہجوم اتنا تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر سب ممبئی پہنچ چکے تھے، ممبئی والوں کا اصرار تھا کہ حضرت چند دن ممبئی میں قیام فرمائیں، مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ کی علالت کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اس لیے ۱۰/ جون ۱۹۲۰ء کو بروز پنجشنبہ رات کے آٹھ بجے ممبئی سے مع رفقاء کے روانہ ہوئے۔ دیوبند تک دہلی میرٹھ غرض ہر اسٹیشن پہ استقبال کیا گیا۔

بہر حال اسیران مالٹا جب ہندوستان واپس پہنچے تو یہاں تین جماعتیں گورنمنٹ برطانیہ سے برسر پیکار نظر آئیں۔ کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ان تینوں جماعتوں نے حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اسیر مالٹا کو شیخ الہند کا خطاب دیا اور ملک اسیر مالٹا کو شیخ الہند کے خطاب سے یاد کرنے لگا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ وعظ اور تقریر بہت کم فرماتے تھے مگر یہ خالص آپ کے خلوص کی بات تھی کہ چند سیاسی تحریکات کے حضرت شیخ الہند علمبردار بنے ان پہ پورے ملک نے لبیک کہا۔ تمام ملک میں اس وقت انگریز کے خلاف ایسا جذبہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی اس کا تصور بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ہندوستانیوں اور

بالخصوص مسلمانوں کا شیرازہ اس طرح ایک ہو گیا تھا کہ ہر آدمی کو یقین تھا کہ انگریز کی اب خیر نہیں ہے، ہندوستان کی آزادی اور انگریز گورنمنٹ کی تباہی اب یقینی ہے۔

مگر افسوس کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسی زمانہ میں علیل ہو گئے اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ یہ مرض جو بعد میں تپ دق ثابت ہوا غالباً حضرت کو مالٹا ہی سے شروع ہو گیا تھا مگر یہ حب الوطنی تھی کہ بستر مرگ سے بھی حضرت شیخ الہند سیاسی تحریکات کی قیادت فرماتے رہے سیاسی اجلاسوں کی شرکت اور صدارت کی۔ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہند کا مرض بھی بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے حضرت شیخ الہند کو اپنی کوٹھی پر روک لیا اور علاج شروع ہوا مگر حضرت شیخ الہند کی نقاہت اور مرض بڑھتا ہی گیا بالآخر وقت موعود آپہنچا اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں حضرت نے انتقال فرمایا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک دارالعلوم کی بنیاد کلکتہ میں رکھی اور اس فکر میں تھے کہ کوئی اچھا عالم اس دارالعلوم کی سرپرستی کرے بہت لوگوں سے عرض کیا گیا مگر کوئی راضی نہ ہوا۔ بالآخر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا نام تجویز کیا اور حکم دیا کہ وہ کلکتہ تشریف لے جائیں استاد محترم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہو کر انتہائی رنجیدہ اور بے قرار کلکتہ کے لیے سوار ہو گئے، ابھی حضرت شیخ الاسلام سفر کرتے کرتے امروہہ ضلع مراد آباد ہی تک پہنچے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ شیخ الاسلام دیوبند واپس تشریف لائے حضرت شیخ الاسلام کو استاد محترم کی وفات کا کتنا رنج تھا اسے الفاظ میں بیان کرنا محال ہے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد تمام خاندان، تمام معتقدین، تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا کہ حضرت شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں۔

آپ نے صحیح جانشین ہونے کا پورا پورا ثبوت بھی دیا۔ اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند کی طرح سنبھال لیا، اور شیخ الہند کی طرح کانگرس، خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء کی رہنمائی کے فرائض انجام دینے لگے، اور عدم تشدد کے راستہ پر چل کر حکومت برطانیہ کے خلاف ملک و قومی سیاسی تحریکات میں جوش عمل کی روح بھرنے لگے۔

اگرچہ مالٹا سے واپس تشریف لائے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا مگر وطن کا یہ سرفروش رہنما پھر وطن کے لیے عظیم الشان قربانی دینے کو تیار تھا، چنانچہ ۸-۹-۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس ہوئی جس میں حضرت شیخ نے ایک تجویز پیش کی جس کا یہ حاصل تھا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا، اور ہر قسم کی اعانت کرنا حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے۔ شرکاء کانفرنس نے یہ تجویز پسند کی اور پاس کر دی۔ یہ تجویز اخبارات میں آئی۔ کتابی شکل میں شائع ہوئی، غرض پورے ملک میں شور ہوا، مگر ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت شیخ اور شرکائے کانفرنس گرفتار کر لیے جائیں گے مگر فوری گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

۱۸/ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند میں گرفتاری کی افواہ پھیلی اور دیوبند کے تمام لوگ افواہ سن کر مضطرب و بے چین ہو گئے۔ اسی دن شام کو چار بجے انگریز افسر اپنے ساتھ حاکم پرگنہ اور تھانیدار کو لے کر تھانے سے نکلا اور تمام مسلح پولس پیچھے پیچھے آئی۔ یہ سب لوگ حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کرنے کے لیے آستانۂ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر پہنچے۔ لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر حضرت کے گھر پر پہنچ گئے اور لوگوں میں انگریز افسر کے خلاف اتنا اشتعال پھیلا کہ سب ہی لوگ اسے قتل کر دینے پر تیار ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جوشیلے عوام کو پند و نصیحت کے سرد جام پلا کر ٹھنڈا کر دیا اور وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ گورنمنٹ رات کو گرفتار نہیں کرے گی بلکہ صبح کو ہم خوشی خوشی اپنے محبوب رہنما کو جلوس کے ساتھ اسٹیشن تک پہنچائیں گے اور ریل میں بٹھائیں گے۔ ڈپٹی کلکٹر اور انگریز افسر نے یہ شرطیں مان لیں اور لوگ بڑی مشکل سے گیارہ بجے رات تک منتشر ہو گئے۔

لیکن انگریز افسر نے سہارنپور اطلاع بھیجی کہ دن میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح کو گرفتار کرنا ناممکن ہے فوراً گورا یا گورکھا فوج بھیجی جائے تاکہ رات ہی رات میں حضرت کو گرفتار کر کے دیوبند سے لے جایا جا سکے ورنہ قصبہ میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو گا جس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملے گی۔ چنانچہ سہارنپور سے رات ہی میں ایک اسپیشل گورکھا اور گورا فوج لے کر دیوبند پہنچا۔ سب ہی لوگوں کو یہ گمان تھا کہ رات میں بڑی فوج آئے گی، کچھ لوگ پہرہ بھی دے رہے تھے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہو گیا کہ فوج نے شہر کے اہم مقامات اور

شاہراہیں روک دی ہیں اور حضرت شیخ الہند کے مکان کا پورا محاصرہ کر لیا۔ حضرت شیخ گھر سے باہر تشریف لائے اور آپ نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء سے خالق دینا ہال کراچی میں حضرت شیخ کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی، اور حضرت شیخ نے عدالت کے روبرو وہ تاریخی بیان دیا جو ہندوستان کی سیاسی علمی اور ادبی تاریخ میں مولانا آزاد کے قول فیصل کی طرح ایک عظیم مقام رکھتا ہے۔ حضرت شیخ کے بیان سے ہال میں عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تمام سامعین حضرت کا منہ تک رہے تھے اور ہر آدمی کی زبان پہ تھا مرحبا جزاک اللہ، یہ تیرا ہی کمال ہے کہ تو تلواروں کے سائے میں حق کی صدا بلند کر رہا ہے۔

سامعین حضرت والا کی تقریر سن کر لرزہ گئے ان دنیا والوں کو تو یقین تھا کہ حضرت اپنے بچنے کی فکر فرمائیں گے، اپنی تجویز کی تاویل کریں گے، بڑے بڑے وکیل حضرت شیخ الاسلام کی صفائی میں بحثیں کریں گے، مگر وطن کی یہ عظیم المرتبت شخصیت اپنی بات کی پکی تھی، جو بات زبان سے نکلی تھی وہ اس سے دنیا کی کوئی طاقت نہ ہٹا سکتی تھی۔ وہ اقرار کر رہے تھے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے حق جان کر کہا ہے، کانفرنس میں تجویز کی شکل میں جو پیش کیا ہے، عدالت میں بیان کے طریق پر پیش کرنا ہے۔

حضرت شیخ نے فرمایا "یہ ریزولیوشن کوئی نئی بات نہیں، مجسٹریٹ صاحب ہمیشہ سے مذہب اسلام کا یہی فیصلہ ہے اور اٹل ہے۔ اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا یہ ہمارے خدا اور رسول کا حکم ہے، اس کی اشاعت کو روکنا مذہب میں کھلی مداخلت ہے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔ اس کی اشاعت کا کیا یہی وقت تھا؟

حضرت والا نے فرمایا کہ مجسٹریٹ صاحب اس کی اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا یہی تقاضا ہے، جس طرح مریض کی سخت حالت کو دیکھ کر طبیب دوا اور پرہیز میں سختی کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح علماء کا فرض ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی حالت کو گرتا دیکھ کر بہت جلد اس کو سنبھالنے کی فکر کریں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فتح بیت المقدس کے وقت مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اس جنگ کو صلیبی جنگ کے نام سے موسوم کیا ہے، اور مسٹر چرچل نے بھی اس کو

صلیبی جنگ کہا ہے، اب میں ایسی حالت میں صاف صاف کہتا ہوں کہ جو مسلمان عیسائیت کا ساتھ دے گا وہ صرف گناہ گار نہ ہوگا بلکہ کافر ہو جائے گا۔

یہ آخری فقرے حضرت کے سن کر لوگ دھاڑیں مار مار کر رو تے تھے۔ بلا خوف عدالت، پولیس اور فوج، حسین احمد مدنی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے، اور ہر شخص خواہ ہندو ہو یا مسلمان، بے چین و بے قرار نظر آ رہا تھا۔

عدالت کو مخاطب فرماتے ہوئے حضرت شیخ نے فرمایا "اگر گورنمنٹ کا منشا مذہبی آزادی سلب کرنا ہے تو صاف صاف اعلان کرے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کریں کہ ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا۔ اسی طرح بائیس کروڑ ہندو بھی سوچ لیں کہ ان کو کیا کرنا ہے کیونکہ جب مذہبی آزادی ہی چھینی جائے گی تو سب کی چھینی جائے گی۔ اگر لارڈ ریڈنگ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کریم کو جلا دیں، احادیث کو مٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں۔

مختصر یہ کہ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تمام رفقاء سیشن سپرد کر دیئے گئے۔ سیشن میں ۲۲ اکتوبر ۲۱ء سے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ ۲۸ اکتوبر ۲۱ء کو حضرت شیخ نے مسٹر کینیڈی جوڈیشنل کمشنر سندھ کی عدالت میں بیان دیا۔

حضرت شیخ نے فرمایا۔ جو قرارداد میں نے پیش کی ہے وہ قرارداد نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا فرض ہے اور مذہبی فرض ہے یعنی خدا اور خدا کے رسول کا حکم ہے اس کا فیصلہ کرنا، لارڈ ریڈنگ کا کام نہیں بلکہ علماء کا کام ہے۔

آج انگریز گورنمنٹ کی فوجی بھرتی اس لیے حرام ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کے مارنے کے لیے بھرتی کیا جا رہا ہے، عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ ہے۔ قرآن شریف میں مسلمان کو قتل کرنے کی سخت ممانعت ہے، مسلمان کے لیے مسلمانوں کو قتل کرنا حرام ہے اس لیے یہ ملازمت بھی حرام ہے۔

حضرت شیخ نے فرمایا کہ ہم اس تجویز کو خدا اور خدا کے رسول کا حکم جانتے ہیں، ہم کسی طرح مجرم نہیں بلکہ یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم اب تک فوجوں میں جا کر خدا کا یہ حکم بیان نہیں کر سکے۔

بکم نومبر ۱۹۲۱ء کو فیصلہ سنایا گیا۔ اسیسران اور جیوری کے ارکان نے فوج میں بغاوت پھیلانے یا کسی فوجی کو ملازمت سے باز رکھنے کے جرم سے بری قرار دیا اور جج نے بھی اتفاق کیا۔ البتہ زیر دفعہ ۱۱۵ اور ۱۰۹ تعزیرات ہند حضرت شیخ کو دو سال قید بامشقت کا حکم سنا دیا گیا، اور چند دن بعد حضرت شیخ کو سابرمتی جیل بھیج دیا گیا۔

دو برس کی قید بامشقت کاٹنے کے بعد اب رہائی کا وقت آیا، دیوبند میں استقبال کی تیاریاں شروع ہوئیں ہر گھر میں عید کی سی خوشی تھی مگر حضرت شیخ بغیر کسی اطلاع کے رات کی تاریکی میں تن تنہا تشریف لے آئے۔ لوگوں میں جوش تھا جلوس نکالنے پہ اصرار ہو رہا تھا۔ لیکن حضرت شیخ نے فرمایا جلوس کیسا۔ کیا برطانیہ کو ہم نے شکست دے دی۔ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں، بلکہ مجھے اس کا رنج ہے کہ برطانیہ جیتی اور ہم ہارے۔ کہیں شکست خوردہ لوگ بھی جلوس نکالتے ہیں ماتم کرو ماتم وغیرہ وغیرہ۔ ان الفاظ کو لوگ سن کر رنجیدہ ہوئے اور خاموش ہو گئے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد حضرت شیخ نے ملک کی جو حالت دیکھی وہ عجیب تھی فرقہ وارانہ سیاست پروان چڑھ رہی تھی ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ چند دن پہلے تک ہندوستان کے تمام باشندے ایک پلیٹ فارم پہ متحد تھے مگر آج سب جدا جدا ہو چکے تھے۔ انگریز گورنمنٹ جو عوام کے اتحاد سے کل تک پریشان تھی آج بے حد مضبوط اور مطمئن تھی ہندوستان کی آزادی کے بڑے بڑے علمبردار فرقہ واریت میں مبتلا ہو چکے تھے اور انگریز کی ذلیل پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کامیابی سے چل رہی تھی، ملک کے بہت سے مقامات پہ ہندو، مسلم بلوے ہو رہے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے ملک کا اندازہ پوری طرح فرمالیا تو سہارنپور کی جامع مسجد میں تقریر فرمائی جس میں وطن کی محبت تھی آزادی کی لگن تھی، فرقہ وارانہ فسادات پہ قلبی رنج کے تاثرات تھے، اتحاد کا پیغام تھا مگر ہندوستانی عوام انگریز کے جال میں پھنس گئے تھے۔

حضرت شیخ نے غازیانہ انداز میں پورے ملک کا دورہ فرمایا اور عوام کے جلسوں میں جوشیلی تقریریں کیں، مگر پورے ملک پہ تحریک خلافت کی ناکامی کا گہرا اثر تھا ملک کا ہر لیڈر مایوسی سے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل کو تک رہا تھا خود حضرت شیخ بھی بعض حالات سے متاثر ہوئے ... ابھی چند ہی ماہ گذرے

تھے اور قید وبند کے مصائب کا اثر زائل نہ ہوا تھا مگر ملک کے حالات کا یہ تقاضہ تھا کہ آپ "کوکناڈا" میں جمعیۃ علماء کے اجلاس کی صدارت فرمائیں حالانکہ یہ بات روشن تھی کہ حکومت برطانیہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور سخت ہو چکی ہے، مگر کوکناڈا کے اجلاس میں حضرت شیخ نے ثابت کر دیا کہ شیر زخمی ہونے کے بعد ہمت نہیں ہارتا بلکہ ہر ضرب کے بعد پہلے سے زیادہ بہادر اور اپنے حملہ میں پہلے سے زیادہ بہادر اور اپنے حملہ میں پہلے سے زیادہ جری اور دلیر ہو جاتا ہے چنانچہ اس اجلاس کا خطبۂ صدارت انتہائی سخت ہے اور جس جرم پر دو سال کی سزا ہوئی تھی، اسی کو پوری قوت سے دھرایا گیا ہے۔ اس خطبۂ صدارت میں حضرت شیخ نے فرمایا، ضروری اور فرض ہے کہ اس گورنمنٹ سے مقابلہ کیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی عزت وشوکت کو کم اور اس کی قوت کو فنا کر دیا جائے۔ اور یہی اعلیٰ درجہ کی جنگ اس گورنمنٹ کے ساتھ ہوگی۔ ہندوستان کی مکمل آزادی اور سوراج انگلستان کی موت کا مرادف ہے۔

حضرت شیخ نے سوال فرمایا لیکن کیا یہ مقابلہ اور انگریز سے جنگ صرف مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے کی جائے یا صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے لیے آپ نے فرمایا نہیں پورے ہندوستان کے لیے بلکہ پورے ایشیا کے لیے مغرب کے مقابلہ میں تمام مشرق کے لیے یہ جنگ ہونی چاہیے۔

حضرت شیخ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا یہ اعلان دسمبر ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے اس وقت فرمایا تھا جبکہ بڑے سے بڑے لیڈر ہوم رول قبول کرنے کے لیے قریب تیار ہو گیا تھا مگر حضرت شیخ نے ملک کے لیڈروں سے الگ ہندوستان کی مکمل آزادی ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کی مکمل آزادی کا اعلان فرمایا اور مغرب کے مقابلہ پر مشرق کو مکمل آزادی دلانے کا وعظ کہا حال تحریکِ آزادی دلانے کا وعظ کہا۔ بہرحال تحریکِ آزادی میں لیے انگریز بھی طرح طرح کی چالیں چل رہا تھا۔

۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا کہ ہندوستان کی دستوری حکومت کے لیے سفارشات کرے مگر حضرتِ شیخ مدنی نے جگہ جگہ تقریریں فرمائیں اور بتایا کہ دستور تو بنے ہندوستان کی حکومت کا اور بنائے انگریز، ایسے دستور کو کسی طرح پسند نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے چنانچہ کانگریس اور دوسری جماعتوں نے سائمن کا بائیکاٹ کر دیا اور فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا دستور

حکومت ہندوستانیوں کو ہی بنانا چاہیے چنانچہ کانگریس اور دوسری جماعتوں نے مل کر ایک کمیٹی بنائی جس کے صدر موتی لال نہرو بنائے گئے اور یہ نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی، اس کمیٹی نے جو دستور حکومت بنایا وہ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے، مگر اس رپورٹ میں بھی ہندوستان کی مکمل آزادی کا تصور نہ تھا اور بھی کئی باتیں قابل قبول نہ تھیں اس لیے حضرت شیخ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ابھی مذکورہ بالا سیاسی کش مکش چل رہی تھی کہ برطانیہ نے ایک قانون شاردا ایکٹ کے نام سے پاس کیا۔ جس کو شیخ الاسلام نے مذہب میں مداخلت بتایا۔ جمعیۃ علماء ہند میدان میں آئی اور قانون کی خلاف ورزی کا ریزولیوشن پاس کیا۔ حضرت شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء خدام نے اس کے خلاف تقریریں کیں اور خلاف ورزی میں چھوٹے بچوں کے نکاح پڑھائے اور جیل میں جانے پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ ساردا ایکٹ تھوڑے دنوں میں بے اثر بنا دیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ فیڈریشن ہوم رول۔ اور دوسرے دستوروں پر کافی بحث ہوئی، کانگریس بھی اس پر مجبور ہوئی کہ مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کرے، چنانچہ اسی اجلاس میں مکمل آزادی کی تجویز پاس کر کے آزادی کی جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا اس نازک وقت میں بھی حضرت شیخ کی ذات گرامی تھی جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرمایا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسر اقتدار آتی ہے، مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے بھائیوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لیے کانگریس میں شرکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جمعیۃ علماء کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مراد آباد میں کیا گیا۔

جنگ آزادی میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا اور جمعیۃ علماء ہند نے ایک مستقل دائرہ حربیہ قائم کیا۔ سنہ ۳۰ء سے ۳۲ء تک اس ملک میں جنگ آزادی پوری زوروں سے لڑی گئی جس میں علماء حق اور قوم پرور مسلمانوں نے ناقابل فراموش جانی و مالی قربانیاں پیش کیں، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے دن رات انتہائی جانفشانی سے ملک بھر کا سفر کیا اور جگہ جگہ جلسوں میں تقریر فرما کر آزادی کی جدوجہد میں جان ڈالتے رہے۔ اس دور کی سختیوں کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے علماء کی طرف سے علماء دیوبند خصوصاً حضرت شیخ کے خلاف انتہائی

مذموم اقدامات ہو رہے تھے مگر حضرت شیخ اور ان کے خدام سر پر کفن باندھے میدان میں تھے اور کسی کی پرواہ لیے بغیر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے کہ ملک میں پھر کتابیں شائع کی گئیں جس میں یہ بتایا گیا کہ کانگرس چونکہ ہندوؤں کی جماعت ہے اس لیے اس کی شرکت مسلمانوں کے لیے جائز نہیں مگر اس مرد مجاہد سے جب سوال کیا گیا کہ فلاں شخص نے آپ کے خلاف یوں لکھا ہے تو مسکرا کر فرمایا کہ یہ لوگ تو پہلے سے لکھتے آئے ہیں تم اپنا کام کرو ان کی طرف نہ دیکھو۔ یہ تو ترک موالات کے زمانہ میں بھی اسی طرح بہہ گئے تھے ان سے یہ امید کہ انگریز کے خلاف کچھ کہہ سکیں، غلط ہے، خاموش رہ کر مورد الزام بنیں یہ کیسے ہو سکتا ہے اس لیے اپنی جان بچانے کو ایسی باتیں کرتے ہیں ان کو چھوڑو اپنا کام کرو سول نافرمانی کی تحریک کے روح رواں بھی حضرت شیخ ہی تھے یہ تحریک سول نافرمانی ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون پیکٹ پر ختم ہو گئی تھی مگر ۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی پر پھر شروع ہو گئی۔

اب انگریز گورنمنٹ نے آرڈینینس جاری کیے اور کانگرس خلاف قانون جماعت قرار دی گئی کانگرس کے لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں، کانگرس نے مختلف طریقوں سے سول نافرمانی کو جاری رکھا۔

چنانچہ جمعیت العلماء ہند نے بھی اپنی مجلس عاملہ کو توڑ کر ڈکٹیٹرشپ کا طریقہ اختیار کیا اور حضرت شیخ نے بحیثیت ڈکٹیٹر اعلان فرمایا کہ میں فلاں دن دہلی پہنچ کر جامع مسجد میں تقریر کروں گا۔ اس خبر کو ملک میں کتنی اہمیت تھی اس کا اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت پورے ملک میں تہلکہ تھا برطانیہ عظمیٰ بھی دہل رہی تھی کہ اب شیخ الاسلام اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے دہلی تشریف لا رہے ہیں، یہ بات گورنمنٹ کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور پریشان کن تھی کیوں کہ برطانیہ نے پوری دنیا میں یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ اس سول نافرمانی سے کوئی تعلق نہیں ہے اب شیخ الاسلام کو گرفتار کیا جائے تو دنیا کیا کہے گی کہ تمام دنیا میں انگریز کے جھوٹ کی پول کھل جائے گی۔

الحاصل حضرت شیخ جمعہ کے دن دیوبند سے روانہ ہوئے۔ پروگرام یہ تھا کہ جمعہ کی نماز کے بعد دہلی کی جامع مسجد میں تقریر فرمائیں گے مگر گورنمنٹ نے مظفر نگر اسٹیشن پر آپ کی گاڑی کا محاصرہ کر لیا اور آنجناب کو گرفتار کر کے ریل سے اتار لیا گیا آپ کی گرفتاری کا پہلے

سے یقین تھا مگر یہ گمان کسی کو نہ تھا کہ مظفر نگر ہی پر اتار لیے جائیں گے حضرت والا کو بھی یہ گمان تھا کہ دہلی جامع مسجد میں پہنچنے سے پہلے دفتر میں یا شہر دہلی میں گرفتاری عمل میں آئے گی اور تقریر کی نوبت شاید نہ آئے اس لیے حضرت شیخ نے اپنا بیان لکھ کر ایک شخص کو پہلے ہی دے دیا تھا اور ہدایت فرما دی تھی کہ اگر میں گرفتار کر لیا جاؤں گا تو یہ بیان جامع مسجد میں پڑھ دیا جائے چنانچہ حضرت شیخ کی ہدایت کے مطابق حضرت شیخ کا تحریری بیان جامع مسجد میں پڑھا گیا اور انگریزی گورنمنٹ حضرت شیخ کے پیغام سے ہندوستانی مسلمانوں کو محروم رکھنے میں کامیاب نہ ہوئی۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک ملک کی سیاسی تاریخ کا خاص زمانہ ہے اس زمانہ تک مسلم لیگ کی تحریکات نے بھی ملک میں خاص اہمیت حاصل کر لی تھی چنانچہ ۱۹۳۶ء میں حضرت شیخ کو پنجاب سے بذریعہ تار دہلی بلایا گیا۔ اکابر جمعیت العلماء سے مسٹر محمد علی جناح، مولانا شوکت علی صاحب چوہدری خلیق الزمان، نواب اسماعیل خاں وغیرہ کی گفتگو پہلے ہی ہو چکی تھی یہ تمام گفتگو حضرت شیخ کو سنائی گئی اور مسلم لیگ سے اتحاد عمل کی تجویز سامنے آئی اگرچہ اس وقت بھی لیگ کے سیاسی کردار سے مشتبہ تھے لیکن حالات نے لیگ کے سیاسی کردار کی عملی آزمائش اور تجربہ کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت اس تجربہ کے نتائج دیکھنے کے لیے خاموش ہو گئے مگر حسب توقع یہ تجربہ ناکام رہا اور ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد مسلم لیگ کے رہنما اپنے مواعید سے منحرف ہو گئے اور ان کا عمل برطانوی گورنمنٹ کی بنیاد کو مضبوط بنانے لگا۔ حضرت شیخ کے لیے یہ بات کسی طرح برداشت کے قابل نہ تھی، چنانچہ حضرت شیخ نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار فرمائی اور ایک رسالہ میں اپنی علیحدگی کے وجوہ بیان فرمائے۔

ملک کے سیاسی حالات بڑی تیزی سے ملک کو آزادی کی طرف لیے جا رہے تھے ایک طرف حضرت شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء انگریز سے برسرپیکار تھے دوسری طرف انگریز ان نام نہاد لیڈروں کو اپنے مفاد میں استعمال کر رہا تھا جو سیاسی اغراض کی بنا پر خود انگریز نے پیدا کیے تھے چنانچہ ہندو لیڈر ہندوؤں میں اور مسلمان لیڈر مسلمانوں میں فرقہ واریت پھیلانے لگے۔ اور فرقہ وارانہ سازشوں کے تحت ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جھگڑے شروع ہو گئے اور دو قومی نظریہ کی تبلیغ ہونے لگی ان مشکل حالات میں

حضرت شیخ نے پورے ملک کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا " ملک والو، مذہب الگ الگ ہیں مگر قوم ایک ہے، دو قوموں کا تصور ملک کو تباہ کر دے گا، یہ غلطی نہ کرو۔ اس غلطی سے انگریز کو فائدہ اور تم کو نقصان ہوگا"، مگر حضرت شیخ کی یہ آواز نہ سنی گئی اور ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے ہیں جو نقصانات ہوئے وہ ہر شخص کی یاد میں محفوظ ہیں۔

ملک کے یہ تکلیف دہ سیاسی حالات تھے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ اور جرمنی کے ما بین دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی طرف سے بھی اعلان جنگ کیا لیکن حضرت شیخ نے میرٹھ کے اجلاس میں جو ۷-۸-۹ جون ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا تھا صاف اعلان کر دیا کہ اس جنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے حضرت شیخ کا یہ اعلان کانگریس کے لیے بھی رہنما بنا اور وہ بھی جنگ میں عدم تعاون کے مسئلہ پر غور کرنے لگی، بہرحال اب خود برطانیہ کو بھی اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ اور سر اسٹیفورڈ کرپس۔ لارڈ لن لتھگو۔ وائسرائے، وزیر اعظم مسٹر چرچل اور مسٹر ایمری وزیر ہند یہ طے کرنے پر مجبور ہوگئے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو بزور قوت دبا دیا جائے۔

حضرت شیخ ۲۴-۲۵ جون ۱۹۴۲ء کی شب میں اس وقت گرفتار کر لیے گئے جبکہ حضرت والا اتحاد کانفرنس کی شرکت کے لیے سفر فرما رہے تھے۔ اسٹیشن دیوبند سے اگلے اسٹیشن ٹپری پر سب انسپکٹر پولیس حضرت شیخ کے ڈبہ میں آیا اور حضرت شیخ کے سامنے گرفتاری کا وارنٹ پیش کیا۔

اور صبح کو مراد آباد کے لیے روانہ کر دیا گیا کیونکہ حضرت شیخ کی گرفتاری بچھرائیوں ضلع مراد آباد کی ایک تقریر کی بنا پر عمل میں آئی تھی جو حکومت وقت کی نظر میں خلاف قانون اور بغاوت کے مترادف تھی۔

مراد آباد میں حضرت شیخ کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور حافظ محمد ابراہیم صاحب نے مقدمہ کی پیروی کی لیکن حکومت وقت کی مصلحت کے تحت اسپیشل مجسٹریٹ جناب سری واستوا نے حضرت شیخ کو ڈیڑھ برس قید بامشقت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا۔

دفاع کمیٹی نے اپیل دائر کیا۔ جناب آصف علی مرحوم کو دہلی سے بلوایا گیا، انہوں نے ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء کو تقریباً تین چار گھنٹے اپیل پر بحث کی جج نے ۱۳ اگست ۴۲ء کی تاریخ فیصلہ کے لیے مقرر کی ابھی فیصلہ کی تاریخ نہ آئی تھی کہ حکومت برطانیہ کے خلاف ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو زبردست

تحریک شروع ہوگئی۔ مراد آباد میں گرفتاریاں ہوئیں ۱۱۔ اگست ۴۲ء کو بازار چوک میں گولی چلی جس سے کچھ اشخاص ہلاک اور کچھ زخمی ہوئے اور شہر میں انتہائی بے چینی پھیل گئی چنانچہ ۱۲ اگست کو حضرت شیخ کے مقدمہ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا جس کی بنا پر اپیل کا یہ نتیجہ ہوا کہ سزا تو صرف چھ ماہ کی رہ گئی مگر حضرت شیخ کو مراد آباد جیل کی اس کال کوٹھڑی میں رکھا گیا جس میں پھانسی والے قیدیوں کو رکھا جاتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ حب یا کوئی کتاب رکھنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

حضرت شیخ ۲۵/ جون ۴۲ء سے ۲۴/ جنوری ۴۳ء تک مراد آباد جیل میں رکھے گئے۔

پھر ۲۴/ جنوری ۴۳ء کو نینی جیل الہ آباد روانہ کر دیئے گئے جہاں تقریباً ۲۰ ماہ قید رہے۔

بہر صورت ۲۶/ اگست ۴۴ء کو حضرت شیخ دو برس دو ماہ کی ظالمانہ اسیری کے بعد رہا ہوئے اور سلہٹ تشریف لے گئے تاکہ رمضان مبارک کا مہینہ حسب وعدہ سلہٹ میں بسر کریں۔

ابھی جیل سے رہا ہوئے چند ماہ نہ گزرے تھے علالت اور جیل کی تکالیف کا اثر زائل نہ ہوا تھا کہ حضرت شیخ نے ۱۳/ جنوری ۴۵ء کو مجلس عاملہ جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ مرکزی حکومت میں اگر کسی بل، یا تجویز کو مسلم ارکان کی دو تہائی اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دیدے تو وہ بل، یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔ ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد کی تعداد مساوی ہو، اور ان ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔

خطبۂ صدارت اجلاس سہارنپور ہم - ۵-۶/ مئی ۴۵ء میں حضرت شیخ نے حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی لیکن دوسری طرف ملک میں مسلم لیگ کی سیاست کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور مسلم لیگ کے رہنما قوم پرست مسلمانوں کے لیڈروں کو بدنام و رسوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے چنانچہ قائد اعظم محمد علی جناح نے ۱۲۔ مارچ ۴۵ء کو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"قوم پرور مسلمان، مسلمان ہی نہیں ہیں ہندوؤں کے زرخرید خیمہ بردار ہیں"

جناب آئی آئی چندریگر نے ۲۔ ستمبر ۴۵ء میں بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قوم پرور

جماعتیں کانگرس کے اشاروں پہ ناچنے والی طوائف ہیں وغیرہ وغیرہ ۔ اسی کے ساتھ مسلم لیگ نے یہ الزام عائد کیا کہ ۴۲ء کی تحریک (انگریزوں کے خلاف ہندوستان چھوڑ دو تحریک مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھی ۔ شیخ الاسلام اور ان کے نیشنلسٹ خدام جیل میں بند تھے اور پورے ملک میں مختلف طریقوں سے یہ پروپیگنڈہ ہو رہا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان کانگرس کے زرخرید غلام ہیں تاکہ عام مسلمانوں میں ان کے خلاف بد گمانی پھیل جائے اور ان کی آواز کا اثر کمزور ہو جائے ، ان حالات میں حضرت شیخ جیل سے باہر تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ پوری جماعت کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہے اور پروپیگنڈا کے تمام ذرائع نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں ، خود برطانوی حکومت کو بھی یقین تھا کہ اس نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی کمر توڑ دی ہے لیکن سہارنپور کے اجلاس میں حضرت شیخ نے گورنمنٹ کو یہ بتا دیا کہ ہم زندہ ہیں اور برطانوی سامراج کو شکست دینے کے لیے زندہ رہیں گے ۔ سہارنپور کے اجلاس کی کامیابی نے انگریز اور انگریز کے خوشہ چین حضرات کو چراغ پا کر دیا اور ملک میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ نے مذموم رُخ اختیار کر لیا ۔ اسی اثنا میں لارڈ دیول نے اپنی اسکیم پیش کر دی اور شملہ کانفرنس کا کھیل ہندوستانی عوام کے سامنے آیا ۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب حقیقت میں قائد اعظم محمد علی جناح (مرحوم) اور خضر حیات خاں (مرحوم) کا ٹکراؤ تھا ۔ خضر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب ایک نشست کے مطالبہ سے نہ ہٹے ، تو محمد علی جناح (مرحوم) واحد نمایندگی سے ایک انچ ہٹنے پر راضی نہ ہوئے لہٰذا کانفرنس ناکام ہو گئی جس کا الزام مسلم لیگ نے قوم پرور مسلمانوں پہ رکھا اور ان کے خلاف اشتعال انگیزی شروع کر دی ۔

شملہ کانفرنس کے بعد الیکشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور حضرت شیخ کی مقبولیت اور اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے جمعیت علماء ہند کے مقابل جمعیۃ علمائے اسلام قائم کی گئی ، لیکن حضرت شیخ کی تنہا کوشش سے جمعیۃ علمائے ہند نے چالیس فی صد ووٹ حاصل کیے ۔ اور صوبائی اسمبلیوں میں ۱۶ فی صد نشستیں حاصل ہوئیں ۔

ابھی صوبجاتی اسمبلیوں کے انتخابات پورے ہندوستان میں مکمل نہ ہوئے کہ وزارتی

مشن لندن سے ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان کی مختلف پارٹیوں کو ملاقات کی دعوت دی گئی۔

حضرت شیخ بھی ۱۶۔ اپریل ۴۶ء کو حافظ ابراہیم صاحب، خواجہ عبدالمجید صاحب، شیخ حسام الدین صاحب، اور شیخ ظہیر الدین صاحب کے ساتھ وزارتی مشن سے ملے اور جمعیۃ علماء کا فارمولا پیش کیا۔

یہ پس منظر ہے جس میں مسلم لیگ نے ۲۸، ۲۹۔ جولائی کی قرارداد کے مطابق ۱۶۔ اگست ڈائرکٹ ایکشن شروع کیا، اور بنگال میں فسادات شروع ہو گئے جن کا سلسلہ پورے ملک میں پھیل گیا، نواکھالی بہار اور گڑھ میکٹیشر میں خوفناک فسادات ہوئے۔

بہر حال ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندوستان کو آزادی دیئے بغیر چارہ نہیں مگر برطانیہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہندوستان کو کوہ آتش فشاں بنا چکا تھا اور ملک کی تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا، جس کے مطابق بالآخر ۱۴ اگست ۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا اور ۱۵ اگست ۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کا پرچم لہرایا گیا۔

ملک کی طویل سیاسی جدوجہد میں حضرت شیخ نے کن سرفروشانہ جذبہ کے ساتھ متواتر حصہ لیا ہے اس کا اندازہ مندرجہ بالا واقعات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کا مورخ، ہندوستان کے جہادِ آزادی کی تاریخ میں حضرت شیخ کو ممتاز رہنما کے نام سے یاد کرے گا اور حضرت شیخ کے کارناموں کو زریں حروف میں تحریر کرے گا۔

(روزنامہ نئی دنیا، دہلی عظیم مدنی نمبر ۱۹۵۹ء)

مولانا سید حسین احمد مدنی،

کی وطنی خدمات،

وشوا ناتھ طاؤس

حبُّ الوطنی مسلمان کے ایمان کا جزو ہے، فرزندانِ توحید کے سامنے ان کے پیغمبر جلیل رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ موجود ہے جس سے وطن کی محبت آشکارا ہے اور اپنے ملک سے فطری تعلق کے مضبوط جذبات کا اظہار ہوتا ہے، حبیب نبی آخرالزماں حضور سرورِ کائنات ؐ نے کفّار کے ظلم وستم سے مجبور ہوکر بحکمِ خداوندی اپنے وطن مکہ سے ہجرت فرمائی تو ارشاد فرمایا:

"اے مکہ! خدا کی قسم روے زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اگر میری قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا"

سیدالکونین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جذباتِ وطن یہ ہیں تو کیا ممکن ہے کہ کوئی سچا مسلمان حبِّ وطن سے خالی ہو؟ مسلمان اپنے دین کی رُو سے اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اس امر کے پابند ہیں کہ وہ اپنے لیے غیرملکی اقتدار کو پسند نہ کریں، یہی بات ہے جس کو علماے حق نے سمجھا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی سربراہی ورہنمائی کی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور فرنگی اقتدار کے سائے ملک پر منڈلا رہے تھے۔ انھوں نے نعرۂ حق بلند کرکے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنے کی کوشش کی اور ایک انقلابی جماعت بنانے کا عزم کیا۔ انھوں نے ایک ایسا نظام وضع کیا اور ایک ایسے معاشرے کا تصوّر پیش کیا جس کی بنیاد حق گوئی ایمان وایقان، صدق وصفا، عہدو امانت، امن وآشتی، عدل وانصاف، آزادیٔ ضمیر، احترامِ انسانیت، تحفظِ جان ومال اور معاشی نعمات پر تھی

حضرت شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کی ایک حیثیت متعین کردی اور اس کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ انھوں نے فرنگیوں کے مکروفریب کے خلاف فتویٰ جاری کیا اور مجاہدین کی تیاری کے لیے اپنی مہم شروع کی حسنِ اتفاق سے انھیں رائے بریلی کے قدیم بزرگوں کی اولاد کا ایک ہونہار شاگرد سید احمد میسّر آگیا۔ انھوں نے عملی بنیادوں پر مجاہدین کی ایک جماعت تشکیل کی اور اپنی دعوتِ تجدید و احیاے اسلام کا رُخ جہادِ اکبر کی طرف موڑ دیا اور صوبہ سرحد کو مرکز بنا کر آزادیٔ وطن کی سعی شروع کی۔ جو لوگ سید احمد شہید کی تحریک کا رخ ہندوستان کے ایک فرقہ کے خلاف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کی دور بینی، فراخ دلی اور بلند نگاہی کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حضرت سید احمد شہید کا طرزِ عمل اور منشا کیا تھا یہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب "نقشِ حیات" کے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

"سید صاحب کا اصل مقصد چوں کہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انھیں بتادیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک کے بدیسی لوگوں کے اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ریاست گوالیار کے مدارالمہام اور مہاراج دولت راؤ سندھیا کے وزیر برادرِ نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت سے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد اس خط کو نقل کیا ہے جو طویل ہے اور جس میں دربارِ گوالیار کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اطمینان سے نہ بیٹھے کیوں کہ فرنگی حکومت سرطان کی طرح ملک میں پھیل رہی ہے جس نے عزت والوں کی عزت خاک میں ملادی ہے۔ نہ مسلمان اس سے محفوظ ہیں اور

نہ ہندو۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس خط کا جو تجزیہ کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں:

"(۱) آپ انگریزوں کو بیگانگانِ بعید الوطن اور پردیسی سمجھتے تھے اور اُن کے تغلب سے تنگ آ کر اُن سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

(۲) آپ ہندوستان کو اپنا ملک و وطن سمجھتے تھے۔

(۳) جہاد سے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا۔

(۴) آپ مظلومیت اور پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض ان دونوں ہی کو اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔"

حضرت مولانا مدنیؒ نے آگے چل کر بیان کیا ہے کہ تحریک آزادی جو علما کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی اور جس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اُن کے خاندان کے لوگ اور اُن کے شاگرد ہیں اُن میں فرقہ واریت اور تنگ دلی کا نام تک نہ تھا، نہ اُن کا مقصد دُنیاوی مفادات، مُلک گیری، خود غرضی، عہدوں اور منصبوں کا حاصل کرنا یا کسی کو غلام بنانا تھا، اور یہ تحریک شخصی یا کسی فرقہ کی حکومت قائم کرنے کے لیے عمل میں نہیں لائی گئی تھی، بلکہ حقیقی جمہوریت اس کا نقطۂ نظر تھا۔

حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کا گروہ مردان خود آگاہ اور خدا پرستوں کا لشکر تھا جنھوں نے دنیاوی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر آزاد قبائلی علاقے کی سنگلاخ چٹانوں پر میدان جہاد آراستہ کیا اور راہِ حق میں شہادت کا بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علمائے صادق پور نے قربانی اور جاں نثاری کی شاندار مثال قائم کی۔ بعد ازاں علمائے دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران میں معرکۂ شاملی میں بے پناہ جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

استخلاصِ وطن کے لیے برادرانِ اسلام کی کاوشوں اور قربانیوں کی بڑی طویل داستان ہے اور اس کا کچھ حصہ میں نے اختصار کے ساتھ اس لیے بیان کر دیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے آزادیِ وطن کے مشن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ماضی اور حال کی کڑیاں ملائے بغیر صورتِ حال کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ماضی کو کریدنا میرے لیے ضروری تھا۔ اب میں اپنے

اصل موضوع یعنی حضرت مولانا مدنیؒ کی وطنی خدمات طرف آتا ہوں۔

حضرت کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی کہ اُن کی ذات بابرکات ہندوستان کے لیے قدرت کا ایک عطیہ تھی۔ انھوں نے ایک زاہد کی حیثیت سے ملک و ملت کی آزادی کے لیے جو دلیرانہ جدوجہد کی اور ایک مجاہد کی حیثیت سے ایمانِ کامل زہد و تقویٰ اور صبر و ایثار کو زادِ راہ بنا کر جس پامردی کے ساتھ فرنگی استعمار خانوں کو خاکستر کیا وہ تاریخِ ہند کا ایک تابناک باب ہے۔

ایک محاذ پر وہ انگریزوں سے نبرد آزما تھے تو دوسری طرف مسلمانوں کی گمراہ قیادت کے بے نقاب کرنے میں مصروف تھے جو پوری ملت کو صراطِ مستقیم سے دور لے جا رہی تھی۔ ایک طرف، وہ زورِ بازوئے قاتل آزمانے کے لیے بے خوف و خطر اس مقام کی طرف بڑھتے رہے جہاں ہر لمحہ دار و رسن کی آزمایش تھی تو دوسری طرف ماحول کی ناسازگاری اور اپنوں کی جفاکاریوں کا سامنا استقلال و استقامت سے کرتے رہے۔ انھوں نے فرنگی استعمار خانوں کی دیواروں پر تحریکِ حریت کی شمع کو اس قدر فروزاں کیا جس سے فرنگی اقتدار کا ایوان جل کر خاک ہو گیا۔ برصغیر کی تاریخِ آزادی میں اُن کا کردار اتنا واضح اور اُن کا حصہ اتنا عظیم اور وسیع ہے کہ اس پر کام کرنا ایک ادارے یا ایک اکیڈمی کا کام ہے۔ میرا مختصر مقالہ اُن کی پوری جدوجہد کا احاطہ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اگرچہ اپنی تعلیمی زندگی کی ابتدا ہی سے حضرت شیخ الہند کی خصوصی توجّہ کا مرکز بن چکے تھے اور وہ انھیں اس نہج سے تربیت دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہو کر مسلمانانِ ہند کی قیادت کر سکیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں قیام کے دوران پیرِ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے روضۂ اطہر کے سائے میں اُن کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی، پھر قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی نے خلعت و دستارِ خلافت بخش کر آپ کو جوہرِ قابل بنا دیا۔ میدانِ عمل میں اُترے تو حضرت شیخ الہند کی معیت میں اسارتِ مالٹا کے دوران جانبازی و سرفروشی کو مقصدِ حیات بنا لیا۔

حضرت شیخ الہند کے بعد مولانا حسین احمد مدنی اُن کے جانشین قرار پائے اور انھوں نے تحریکِ آزادی کی زمامِ سنبھال لی۔ ابھی مالٹا سے واپس آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہی گزرا تھا کہ جولائی ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں حضرت مدنی نے ایک

تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ سرکارِ انگلشیہ کی فوج میں ملازمت کرنا، یا کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور کسی قسم کی اعانت کرنا حرام ہے اور ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے۔

شرکائے کانفرنس نے یہ تجویز پاس کر دی اور جب اگلے روز اخبارات میں شائع ہوئی تو انگریزی حکومت کے ایوان لرز اُٹھے۔ اس باغیانہ تجویز کی بنا پر ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند میں حضرت کی گرفتاری کی افواہ پھیلی تو عوام مشتعل ہو گئے اور انھوں نے انگریز افسر کی قیادت میں دیوبند آنے والی مسلح پولیس پر حملہ کر دیا۔ حالات قابو سے باہر ہو گئے تو سہارنپور سے گورکھا پلٹن مدد کے لیے بلائی گئی جس نے پورے شہر اور حضرت کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت گھر سے باہر تشریف لائے، عوام کو پُرسکون رہنے کی تلقین کی اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

۲۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو خالق دینا ہال کراچی میں حضرت مولانا مدنیؒ اور دیگر شرکائے کانفرنس کے مقدمہ کی سماعت ہوئی اور حضرت نے عدالت کے سامنے وہ پُرجوش بیان دیا جو وطنِ عزیز کی سیاسی تاریخ میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے "قولِ فیصل" کی طرح ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے انھوں نے قرآن شریف اور سنّتِ رسول اللہ سے وہ دلائل اپنے موقف کی وضاحت میں پیش کیے کہ ہر سننے والا جزاک اللہ، سبحان اللہ کہہ اُٹھا۔ ہر زبان پر یہ الفاظ تھے کہ اے حضرت! یہ آپ ہی کا کمال ہے کہ انگریزی سامراج کی تیغوں کے سائے میں کلمۂ حق بلند کر رہے ہیں۔ بعض اوقات حضرت مدنیؒ کے دلائل و براہین سے سامعین کی یہ حالت ہو جاتی تھی کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔ اسی عدالت میں حضرت کے جرأت مندانہ کلمات سن کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ان کے قدموں پر گر پڑے تھے اور پاؤں کو بوسہ دیا تھا اور ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

"جو جرأت میں نے آج آپ میں دیکھی ہے آج تک کسی مجاہد میں نہ دیکھی اور نہ سُنی۔"

یہ تھے ہمارے حضرت مدنیؒ جنھیں انگریز کے دیوہیکل قید خانے خوف زدہ نہ کر سکے۔ جن کے جذبۂ حب الوطنی اور جرأتِ ایمانی کے سامنے فرنگی سامراج کے تمام ہتھکنڈے

ہیچ ثابت ہوئے اور یہ حسینی چراغ حالات کی تند و تیز آندھیوں کے سامنے بھی ضیا پاشی کرتا رہا۔

یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو اس مقدمے کا فیصلہ سُنایا گیا۔ جیوری نے فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام سے بری قرار دیا البتہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ کے تحت دو سال قید بامشقت کا حکم صادر کر دیا۔ چند روز بعد حضرت مدنیؒ کو سابر متی جیل بھیج دیا گیا۔ رہائی کے بعد جب حضرت بڑی خاموشی کے ساتھ تنہا رات کی تاریکی میں دیوبند پہنچے تو لوگوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ جلوس نکالنے پر اصرار کر رہے تھے مگر حضرت نے فرمایا:

"جلوس کیسا؟ کیا ہم نے برطانیہ کو شکست دے دی ہے۔ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ اس بات کا رنج ہے کہ برطانیہ جیتا اور ہم ہارے۔ کبھی شکست خوردہ لوگ بھی جلوس نکالا کرتے ہیں؟"

سابر متی جیل سے رہائی کے چند ہی دن بعد انھوں نے کوکناڈا میں جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس ۱۹۲۳ء کی صدارت کی۔ انھوں نے بڑے سخت الفاظ میں جس جرم پر دو سال کی سزا ہوئی تھی اُس کو پوری قوت سے دُہرایا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے نہ صرف ہندوستان کی مکمل آزادی بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ یہ اعلان انھوں نے اس وقت کیا جب انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے بڑے رہنما محض ہوم رُول قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ اس کے چھ سال بعد ۱۹۲۹ء میں اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں کیا جو دریائے راوی کے کنارے منعقد ہوا تھا مگر حضرت مدنیؒ نے ۱۹۲۳ء میں ہی پُورن سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن اس غرض سے آیا کہ ہندوستان کی دستوری حکومت کے لیے اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ سب سے پہلے حضرت مدنیؒ نے کیا۔ انہیں اعتراض تھا کہ دستور نو بنے ہندوستان کا اور بنائے انگریز جو ہمیں ہرگز منظور نہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری قومی جماعتوں نے اس کے بعد یہ طے کیا کہ سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا جائے۔ ہندوستان کا دستور ترتیب دینے کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جو نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے جو

دستور بنایا وہ نہرو رپورٹ کے نام سے شائع ہوا اس رپورٹ میں کامل آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا لہٰذا حضرت مدنیؒ نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ ہم مکمل آزادی کے سوا کسی طرح راضی نہ ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر نہ تو ہندوستانیوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ اُن کے مصائب کا خاتمہ ممکن ہے۔ آزادی کی تحریک میں حضرت مدنیؒ انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت اور مدد کرتے رہے کیوں کہ اُن کا یقین تھا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی بر سرِ اقتدار بھی آتی ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے امروہہ سالانہ اجلاس میں انھوں نے بحیثیت جماعت کانگریس میں شرکت کے فیصلے کا باضابطہ اعلان کیا تھا[1]

آزادی کی جدوجہد میں حضرت مدنیؒ کسی غرض سے شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ صرف حبِّ وطن کی اُس سنّتِ رسولؐ کو تازہ کرنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا کہ اے مکہ تو کس قدر پاک اور مجھے محبوب ہے۔ یہ وطن سے بے پناہ محبت کا اعلان تھا جسے اس مجاہدِ اعظم نے زندہ کر کے دکھا دیا۔ اُن کی خود نوشت سوانح حیات "نقشِ حیات" جو گزشتہ ڈیڑھ صدی کی آزادی کی جدوجہد کی غمازی کرتی ہے ان کی وطن دوستی کی مظہر ہے یہ کتاب اُن کی زندگی بھر کے تجربات و مشاہدات کے علاوہ سیاسی معلومات کا خزینہ ہے جس میں انگریز کی سیاہ کاریوں، چالبازیوں اور عیاریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح انھوں نے جی بھر کے ہمارے ملک کو لوٹا اور برباد کیا اور ہم پر احسانات بھی جتائے۔ حقیقت یہ کہ "نقشِ حیات" تحریکِ آزادیٔ ہند کی ایک جامع دستاویز ہے۔

۱۹۲۸ء میں ایک ایسا واقعہ پیش کیا جس نے پورے ملک کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ ۸ جنوری کو حضرتِ اقدس مولانا مدنیؒ نے مل بنگش صدر بازار دلّی کے ایک جلسے میں تقریر کے دوران کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ حضرت کی اس تقریر کو دلّی کے دو ممتاز اخبارات "تیج" اور "انصاری" نے شائع کیا۔ چند روز بعد دلّی ہی کے دو پرچوں نے "الامان" اور "وحدت" نے اس تقریر کو کچھ دوسرے انداز سے اپنے صفحات میں شامل کیا۔ ان پرچوں سے لاہور کے دو مشہور روزناموں

---

[1] امروہہ میں جمعیت علمائے ہند کا یہ سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا شاہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ کی صدارت میں ہوا تھا (مرتب)

"زمیندار" اور "انقلاب" نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرت مدنیؒ کی طرف منسوب کر دیے کہ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بھی اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔ حالاں کہ حضرت مدنیؒ کی اس تقریر کا مدعا محض یہ تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم بنا سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادیِ وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔

جب اس تقریر کی اخباری اطلاع علامہ اقبال تک پہنچی تو انھوں نے تحقیق یا تصدیق کیے بغیر جھٹ سے بڑے تلخ لہجے میں مولانا مدنیؒ کے خلاف تین فارسی اشعار کی ہجو لکھ ماری جو ان جیسے سنجیدہ انسان اور عظیم شاعر کے شایانِ شان نہ تھی۔ اس موضوع پر ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اخبارات میں گرما گرم بحث چل نکلی۔ دونوں طرف سے مضامین نظم و نثر کا تانتا بندھ گیا، یہاں تک کہ حضرت مدنیؒ کو اپنے موقف کی وضاحت میں ایک کتابچہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کے عنوان سے تحریر کرنا پڑا جس پر مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا حفظ الرحمٰن نے رسالہ "برہان" دلّی میں کئی ماہ تک مدلل بحث کی۔

حضرت مولانا مدنیؒ کی وضاحت سے علامہ اقبال کا دل صاف ہو گیا اور انھوں نے اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اپنے طنزیہ اشعار واپس لے لیے مگر علامہ کے یہ اشعار ان کے انتقال کے بعد "ارمغانِ حجاز" میں شریک کر دیے گئے اور معذرت کو دیدہ و دانستہ غائب کر دیا گیا، حد یہ کہ جس شدت سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کی جماعت کے خلاف سیاسی پروپیگنڈہ کیا گیا اس کا عشرِ عشیر بھی اسلام کے خلاف فتنہ آرائی کرنے والی قوتوں کے خلاف مفقود تھا اور اب بھی ہے۔ خود اقبال کے مدرسۂ فکر نے حضرت مدنیؒ کے خلاف قلم درازی کرنے والوں کو چھوا تک نہیں۔

۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی سیاست ایک طوفانی دور سے گزرتی رہی۔ برطانیہ دوسری جنگ عظیم میں اُلجھ گیا تھا۔ اس جنگ میں برطانیہ کی کوئی مدد نہ کرنے کے اعلان کی پاداش میں بڑے بڑے قومی رہنما اسیرِ زندان بنا دیے گئے تھے۔ میدان اب فرقہ پرست عناصر اور علیحدگی پسند قوتوں کے لیے کھلا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا اور فرقہ وارانہ سیاست گل کھلانے لگی۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمے

پر قومی رہنما جیلوں سے باہر آئے تو فرقہ وارانہ جنون اپنی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ تعصب اور منافرت کی اس فضا میں ہندوستان کی تقدیر کے فیصلے ہونے والے تھے۔

جہادِ حریت میں وطن دوست مسلمانوں نے قربانی واستقامت، شجاعت اور جانثاری کی روشن مثال قائم کی تھی۔ ایک نہیں بے شمار مسلمان مجاہدِ حریت تھے جن کے نعرہ ہائے انقلاب سے فرنگی حکومت کی مضبوط اور بلند و بالا دیواریں لرز جایا کرتی تھیں۔ جن کی صدائے حق فضا میں گونجتی تھی تو انگریز حاکموں کی نیندیں حرام ہو جایا کرتی تھیں۔ جن کے جوشِ جہاد، جذبۂ صادق، یقینِ محکم اور عملِ پیہم نے ملک کو آزادی کی منزل کے قریب پہنچا دیا، لیکن مسلمانوں کی گمراہ کن قیادت کے صدقے میں ان انقلابی شخصیتوں کی زندگیاں محرومیوں کا مرقع ہو کر رہ گئیں۔ یہ لوگ جن کے دم سے کبھی قافلۂ آزادی رواں دواں تھا اب عبرت کی بھولی بسری داستانیں بن کر رہ گئے تھے۔

اُن پر آشوب ایام میں آزادیٔ ہند کے قافلہ سالار حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پر جو کچھ گزری وہ فرزندانِ اسلام کی بہت بڑی بدنصیبی ہے جس کا خمیازہ وہ اب تک بھگت رہے ہیں۔ یہ ہندوستان کے محسنین کے امتحان کا دور تھا۔ استخلاصِ وطن کے لیے قرآن وسنت کی پیروی کرتے ہوئے اُنھیں کئی جاں کاہ راستوں سے گزرنا پڑا۔ باطل پرست قوتوں اور فرقہ پرست جماعتوں کے ہر سب و شتم، طعنہ و تعریض کا مقابلہ انھوں نے پامردی اور خندہ پیشانی سے کیا۔ وہ عمل و ہمت کی ایک چٹان اور عزم و بلند حوصلگی کا ایک کوہِ گراں تھے جن کو حادثاتِ زمانہ اور انقلاباتِ زمانہ اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔

اُن دنوں سیاست کی جن پُر خار وادیوں سے حضرت مدنیؒ کو بار بار گزرنا پڑا اس کا ذکر مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "پرانے چراغ" میں حضرت سے متعلق لکھے گئے خاکے میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔ میں اختصار کے ساتھ ان کے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ اُس ہنگامہ خیز دور میں حضرت مدنیؒ کی رائے اور سیاسی بصیرت عام مسلمانوں کی خواہش اور جذبات اور اس وقت کی مقبول قیادت کے سیاسی فکر سے بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں کی نئی لیڈر شپ نے مسلمانوں کے جذبات کو اتنا متحرک اور مشتعل کر دیا تھا کہ ان میں کسی مخالف رائے کے سننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ حضرت

مدنیؒ کے خلوص، عزم اور احساسِ فرض نے اس کیفیت کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا اور اپنے عقیدے اور منبر کے مطابق رائے عامہ کی اس طاقت سے کلمۂ حق کو اپنا فرض اور افضل جہاد سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفروں اور جلسوں میں وہ سب کچھ پیش آیا جو مولانا کی شخصیت، اُن کی سابقہ خدمات اور اُن کے علمی و دینی مقام کے بالکل شایان نہ تھا۔ ایک طبقہ ایسا تھا جو مختلف مقامات پر پیش آ رہے ان واقعات کو مسلمانوں کے حق میں نامناسب سمجھتا تھا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ ایک ایسی ہی مجلس میں جب سید پور کے اسٹیشن کا واقعہ کسی اخبار سے پڑھ کر سنایا جا رہا تھا اس مجلس میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب فرطِ تاثر سے رو پڑے۔ مشکل سے کوئی ایسا تھا جس کی آنکھیں نم نہ ہوں"

نیشنلسٹ مسلمانوں کو زندگی بھر کی جدوجہد کے بعد جو کچھ ملا وہ ہماری سیاسی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ انھیں اپنوں ہی کے ہاتھوں پسپا ہونا پڑا لیکن حق پرستوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔ بقول آغا شورش کاشمیری:

"امویوں نے اپنے دور میں ہاشمیوں کا خون حلال کر لیا، نتیجتاً اُن کا سچا تذکرہ ایک گھناؤنا جرم ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد پر منبر و محراب پر تبرّیٰ ہوتا رہا اور یہ سلوک قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے تھا۔ ہر دور میں تاریخ اسی طرح مجروح ہوتی رہی، صداقتوں کو برسوں کی مسافت کے بعد جگہ ملی۔ مثلاً شاہ ولی اللہ اور اُن کے خاندان سے اُس عہد کے مسلمانوں نے کیا سلوک کیا، شاہ عبدالعزیز کے پنجے توڑ دیے اُن کے بدن پر چھپکلی کا تیل ملا جس سے انھیں برص ہو گیا۔ آج دعوت و عزیمت اور فکر و نظر کی محراب میں اُن کا نام گونج رہا ہے تو اس گونج کے پیدا ہونے میں پوری ایک صدی صرف ہوئی ہے، خوانینِ ہزارہ کی غدّاری سے سید احمد شہید ہو گئے تو اُن کی سیرت تقریباً ایک صدی تک گرد و غبار میں دبی رہی۔ اعتراف و ستائش کے الفاظ گنگ ہو گئے۔ خود مسلمانوں نے اُن کے خلاف گز بھر کی زبانیں تیز رکھیں۔ اب کہیں جا کے اُن کا نام اُبھرا ہے اور مسلمانوں نے

تحریکِ آزادی کے ڈانڈے اُن کی جدوجہد سے ملائے ہیں۔"

حالات کی سنگ دلی ایک بار پھر عود کر آئی۔ جب ۱۹۴۶ء کے انتخاب کے دوران امرتسر اور جالندھر کے ریلوے اسٹیشنوں پر ناعاقبت اندیش نوجوانوں نے حضرت شیخ الاسلام کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور اُن پر حملہ آور ہوئے۔ جالندھر میں مفسدوں نے مولانا کی ٹوپی اُتار کر پھینک دی اور اُسے پاؤں تلے روندا۔ ایک نے مولانا کی ریشِ مبارک کو نوچا دوسرے نے گال پر طمانچہ مارا حتیٰ کہ ان کے منہ پر تھوکا۔ حضرت کا تکیہ چھین لیا گیا، گندے نعروں اور گالی گلوچ کی بھرمار تھی۔ حضرت کے ساتھ ایک خادم تھا اُس سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اس نے مزاحمت کی کوشش کی تو حضرت نے اُسے منع کر دیا اور فرمایا:

"تم یہ سب نہیں دیکھ سکتے تو دوسرے ڈبے میں چلے جاؤ، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

اُس وقت حضرت مدنیؒ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ" کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے۔

جس طرح جگر گوشۂ رسولؐ کے قاتلوں میں سے کوئی بھی آخرت سے پہلے گناہوں کی سزا سے محفوظ نہ رہا تھا اُسی طرح شمس الحق سے لے کر فضل محمد تک رقصِ ابلیس کرنے والا کوئی بھی مفسد خدا کے خوفناک قہر سے نہ بچ سکا اور آفاتِ سماوی اُن پر نازل ہو کر رہیں۔ ایک بار یہ پھر ثابت ہو کر رہا کہ خدا اپنے محبوب بندوں کو دُکھی کرنے والوں سے کڑا انتقام لیتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام بہ حیثیت محب وطن،

ایم - ایم جلالی

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی مجموعۂ کمالات تھی۔ وہ نہ صرف دنیائے اسلام کے واجب التسلیم رہنما، علم حدیث و فقہ، ادب و معانی، فلسفہ و منطق کے زبردست و متبحر عالم تھے بلکہ ہر ملک و ہر قوم کی تاریخ انہیں از بر تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ سارے ہندوستان کے لیے بہ یک وقت بلا تفریق و امتیاز مذاہب و ملل محبوب ترین رہبر اعظم تھے۔

حضرت نے آزادی وطن کی خاطر جو قربانیاں پیش کیں اور جس اولوالعزمی اور فراخ دلی سے اہل ہند کو بدیشی سامراج کے پنجوں سے چھڑانے کی تگ و دو کی، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں جلی حرفوں سے لکھی جائیں گی، ہر قوم، ہر جماعت اور ہر فرد و بشر کو اس کا اعتراف ہے کہ حضرت جنگ آزادی کی صف اول کے رہبر اعظم تھے۔ وہ آزادی کا آفتاب تھے انہوں نے اپنی زندگی کو ملک کی آزادی کے لیے وقف کر دیا تھا۔

حضرت کو سرزمین ہند سے قلبی محبت تھی، فطری انس تھا، حضرت کا نظریۂ حب الوطنی دنیا کی تمام قوموں سے ممتاز تھا، وہ ہندوستان کو صحیح معنوں میں اپنا وطن تسلیم کرتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سوال نے جب بہت سے مسلمانوں کو بانداز دگر مشتعل کیا اور مسلم لیگ کے نام پہ ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم ہند کے ولولے پیدا کیے، وہ ایسا نازک وقت تھا کہ کانگرس نے بھی تقسیم ہند کی قرارداد منظور کر لی، مگر یہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہی جذبۂ حب الوطنی تھا کہ آپ نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے مدبرین اعظم نے مولانا کی حب الوطنی پہ اظہار تعجب و آفریں کیا، یہ انہیں کا عطیہ ہے کہ آج تک مسلمانوں کے قلوب میں ہندوستان کی عظمت و محبت دوسری قوموں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ راسخ ہے۔ مولانا جس طرح ہندوستان کو

ہندوؤں کا وطن سمجھتے تھے ہندوستان کو مسلمانوں کے قدیم ترین وطن ہونے پر یقین کامل رکھتے تھے۔

جب مطالبہ پاکستان کا اختراع کیا گیا اور مسلمانوں کو انتقال وطن کی تلقین کی جانے لگی تو مولانا رشد و ہدایت کی شمع لے کر ان مسلمانوں پر مسلط ہو گئے جن کی گمراہ کن قیادت نے ہندوستان کے مسلم عوام کو قعر مذلت میں پھینکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مولانا کی اعجاز بیانی و بلیغ الاثری نے حب الوطنی کا صحیح جذبہ قلوب عوام میں راسخ کیا۔ حضرتؒ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

"ہندوستان کی عظمت و فضیلت جو قرآن و احادیث و مؤرخین اسلام کی روایات سے ثابت ہے، ان کے زیر نظر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی ہندوستان سے بیگانگی نہیں اختیار کر سکتا، وہ سرزمین جو خلیفۃ اللہ کا سب سے پہلا مہبط ہو، جو انسانیت کا سب سے پہلا دار الخلافہ ہو، جو سرزمین آفتاب نبوت کا سب سے پہلا مشرق بن چکی ہو۔ جس بقعۂ مبارکہ پر روح القدس کا سب سے پہلے نزول ہو چکا ہو۔ صحیح معنوں میں وہی سرزمین مسلمانوں کا اصلی پاکستان ہے"

یہ الفاظ اکثر حضرت اپنی تقاریر و ارشادات میں فرمایا کرتے تھے، حضرت کو جو محبت سرزمین ہند سے تھی وہ آخر تک رہی۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد یکساں طور پر حب الوطنی کا جذبہ حضرت کے دل میں باقی رہا، کانگریس میں حضرت کی شمولیت، آزادی کی تحریکوں میں آپ کی جانبازانہ شرکت ان کے جذبہ حب الوطنی کی آئینہ دار ہے۔

مولانا کے نزدیک ہندوستان کے باشندوں میں صرف مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اس ملک کو اپنا قدیم ترین آبائی وطن کہہ سکیں۔ مولانا نے اپنی ایک تصنیف میں جو "ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل" کے عنوان سے جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ۱۹۴۵ء میں شائع کی گئی تھی اس کے دلائل یہ بیان کیے ہیں:

(۱) سب سے پہلے انسان اور ہم سب کے مورث اعلیٰ حضرت آدمؑ جو مسلمانوں کے سب سے پہلے پیغمبر ہیں اسی سرزمین پر تشریف لائے۔

(۲) توسیع نسلِ انسانی کا آغاز سب سے پہلے اسی سرزمین پر نورِ اسلام سے ہوا۔

(۳) اس کے علاوہ صدیوں تک پیغمبروں کا سلسلہ اسی سرزمین پہ جاری رہا۔

(۴) حضرت شیثؑ اور نوحؑ وغیرہ نے صدیوں تک اسی سرزمین پہ نعرۂ توحید بلند کیا جسے جمہور مؤرخین مانتے ہیں۔

انہیں وجوہ کی بنا پر حضرتؒ نے ہمیشہ مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ ہندوستان کی سرزمین سے محبت کریں یہ ان کا پاکیزہ وطن ہے۔ انہوں نے بسا اوقات ارشاد فرمایا:

"ہوسکتا ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی بہ آسانی ایک وطن سے منتقل ہوکر دوسرے وطن کو چلے جائیں مگر مسلمانانِ ہندوستان کو یہاں سے منتقل ہونا از بس مشکل ہے نہ وہ اپنی مساجد سے بیگانگی اختیار کرسکتے ہیں نہ اپنے مقابر سے، نہ اپنی زمینوں سے، نہ اپنے گھر بار سے اور نہ ان میں اس قدر استطاعت ہے۔"

سرزمین ہندوستان ہی وہ مقدس سرزمین ہے جہاں رشد و ہدایتِ خداوندی، معرفتِ قربِ الٰہی، ونجاتِ اخروی اور فوز و فلاحِ ابدی کے حصول کے لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے عہد و پیمان ہوا۔ سرورِ کائنات علیہ الصلاۃ والسلام کا وہ نورِ مقدس جو سب سے پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صلبِ مقدس سے منتقل ہوکر اپنے زمانہ کے بہترین آباء اور بہترین امہات کے ذریعہ سے جملہ منازل طے کرتا ہوا افقِ مکہ سے طلوع ہوا۔ اس لحاظ سے بجا طور پر حضرت نے فرمایا:

"نورِ محمدیؐ اور افضالِ سرمدی کا سب سے پہلا مطلع ارضِ ہند اور سب سے آخری مشرق حجاز ہے"

الغرض مذہبی، سیاسی، ملکی، وطنی ہر حیثیت سے سرزمینِ ہندوستان مسلمانوں کے لیے واجب الاحترام ہے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جس نے حضرت شیخؒ کی ذاتِ پاک صفات کو حیاتِ ابدی بخشی۔

وہ کبھی کشمکش اور تذبذب میں نہیں رہے، انھوں نے جس مسلک کو اپنایا۔ قرآن و احادیث کی روشنی میں اس کی صداقت کا جائزہ لیا۔ اور مستقل مزاجی سے اس پہ چلے اور عوام کو اس پہ چلنے کی ہدایت کی۔ ایسے دور کش مکش میں بھی آپ نے جذبۂ حب الوطنی کو اپنے دل میں برقرار رکھا جب کانگریس ہی کے کچھ فرقہ پرست ذہنیت والوں نے آپ کے دل کو ٹھیس پہنچائی، انھوں نے اپنا راستہ کبھی نہیں بدلا اور کانگریس کا ساتھ آخر تک نہ چھوڑا اصول کی پابندی، راست بازی، صداقت، عدل و انصاف کے موڑ پہ بڑے بڑے رہنما کترا گئے مگر آپ نے کبھی صحیح راستہ سے روگردانی نہیں اختیار فرمائی۔ وہ اسی سرزمین مقدس پہ پیدا ہوئے تھے۔ اسی سرزمین ہند کے مایۂ ناز اور قابلِ فخر رہنما بنے اسی سرزمین کی محبت اور عظمت کا جذبہ لے کر زندگی کے بیش قیمت اوقات گزار دیے اور آخر میں اسی سرزمین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے پردہ فرما گئے۔ خدا اُن کے نقوش پہ چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

افکار:

حضرت شیخ الاسلام اور نظریہ، حریت اقوام،

مولانا محمد اویس قاسمی مظفرپوری

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہُ العزیز کی حیات مبارکہ کا ہر پہلو خواہ وہ تصوف ہو یا تدریس، تبلیغ ہو یا سیاست سبھی نمایاں اور اجاگر ہیں بلکہ اظہر من الشمس اور زبان زد ہر خاص وعام ہیں۔ لیکن اس صحبت میں ہم ایک ایسے پہلو پر قلم اٹھانا انسب اور فائق ترین تصور کرتے ہیں۔ جس کا تعلق عوام وخواص دونوں ہی کی زندگی اور مصالح حیات کے ساتھ نہایت ہی گہرا اور استوار تھا۔ اور اپنے اندر ایک صدی کی مستقل تاریخ چھپائے ہے۔

ہندوستان کی تاریخ سیاست میں ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم میں باشندگان مغرب کا دنیائے انسانیت پر جو ناقابل فراموش جبر واستبداد ظلم وتعدی بعنوان آخر بہیمیت وبربریت کی شکل میں احسان عظیم ہے وہ ایک اہم اور مستقل باب ہے عربوں نے جس طرح ایک طویل مدت تک عہد جاہلیت کے انسانیت سوز مظالم وشدائد اور پرفتن ماحول میں سانس لی ہے اسی طرح انگریزوں کے زیر اقتدار تمام ممالک نے عموماً ہندوستان نے خصوصاً انگریزی عہد استبداد کی ہولناک ستم ظریفیوں اور دریدہ دہنیوں کا باچشم نم نظارہ کیا ہے غارت گران انسانیت نے یہ تصور کیا تھا کہ یہی صیقل شدہ اور ملمع شدہ تصویر ان حواس باختہ ناوانوں کو دکھاتے رہیں گے اور یہ یونہی ٹکٹکی باندھے مجنونانہ دیکھتے رہیں گے اور شاید یہی سوچا تھا کہ ع

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے!

لیکن شعلہ غضب کا حق کے کب تک خموش رہتا

ملک کی تعمیر جدید اور علماء ہند:

عادۃ اللہ ازل سے یہ جاری ہے کہ جب بھی خلاف عدل کوئی ظلم کی جمعیت سے سر اٹھاتی ہے،

تو اس کے سر کچلنے اور نظام عالم کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ ایک مصلح جانباز کو اس کے مقابلے میں مقرر فرماتا ہے۔ اور یہ علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کوئی شئی اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے تو اس کا ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مجاہدین کی ایک جماعت اسی مقصد کی تکمیل اور آبیاری کے لیے سر سے کفن باندھے عالم وجود میں آئی جس جماعت کے سرخیل اور سید الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عظیم المرتبت شخصیت تھی جن کے علوم و اذکار کا محور ہی سرتاسر انسانیت اور خلق اللہ کی خدمت اور عدل وانصاف کی ترویج اشاعت حقانیت تھا اسی سلسلہ کے بزرگوں میں قاسم النانوتوی کا بھی نام نامی ہے جنہوں نے خدمت خلق اور رفاہ عام کی خاطر زندگی وقف کی تھی "جہاد حریت" کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اور بالآخر قربانی دی اور اسی سلسلے کے دوسرے بزرگ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی گرانقدر شخصیت تھی۔ جنہوں نے اپنی خاموش اور سیرت کی بے آواز صدا سے سارے ملک کو للکارا عالم سیاست میں ایک ہیجان اور طوفان برپا کر دیا۔ قلوب انسانی میں وہ عظیم الشان انقلاب رونما کیا کہ ملک کا بچہ بچہ طالب حریت نظر آنے لگا۔ اور ایک محدود مدت میں مجاہدین کی ایک کثیر التعداد صف منظم ہو گئی جن میں سب سے اول اول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد المدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات گرامی تھی۔ حریت وہ پودا تھی جس کی محدث دہلوی نے داغ بیل ڈالی۔ قاسم النانوتوی نے آبیاری کی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے تہذیب کی اور حوادث ایام سے بچایا اور بالآخر جانشین وجاں نثار شیخ الہند شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے قربانی دے کر پروان چڑھایا۔ اور یہی وہ ذات تھی جس نے ملک کو انگریزوں کی سالہاسال کی غلامی سے نجات دلانے اور آزادی کامل کے لیے تن من کی بازی لگادی اور ہندوستان کی آزادی کو انگریزوں کے زیر تسلط دیگر ممالک کی حریت کے لیے تمہید اور توطیہ قرار دیا۔ چنانچہ راقم الحروف نے خود جشن آزادی کے ایک اجلاس کے موقع پر عوام کو خطاب کرتے ہوئے شیخ الاسلامؒ سے سنا ہے کہ انڈونیشیا، ملایا، مصر اور دیگر ممالک ہندوستان ہی کی آزادی کے طفیل میں آزاد ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان کی قدیم تاریخ پر طویل اور مفصل روشنی ڈالی آخر میں عوام کو اتفاق اور اتحاد

باہمی کی طرف دعوت دی۔ صرف یہ دیوبند کا ایک چھوٹے پیمانہ پر جشن آزادی کا اجلاس ہی نہیں بلکہ حضرت ممدوح کی عمر مبارک کے تقریباً ۵۵ یا ۶۰ سال جس رستا خیز ہنگامہ آرائی کے گزرے ہیں وہ ایک عظیم الشان ریکارڈ ہے۔

حضرت شیخ اور جہاد حریت کی سرگرمیاں:

آپ نے ایسے وقت میں قوموں کی زمام قیادت سنبھالی ہے جب کہ ہندوستان کی زمین اور اس کا آسمان بدلا ہوا تھا، انگریزی جابرانہ تسلط اور تشدد کی مسموم ہواؤں نے فضا کو تیرہ و تار بنا رکھا تھا۔ انسانیت نیم جان بلکہ لب جان ہو چکی تھی۔ یہ بے باک مجاہد آیا اور ملک و قوم کو خلاف فطرت شاطرانِ مغرب کی غلامی سے آزاد کروانے کا بیڑا اٹھایا۔ اور آزادی ہند کو اپنا فرض منصبی سمجھا جو خواب حریت کہ شیخ الہند نے کبھی دیکھا تھا حسین احمد کی سعی پیہم اسے شرمندۂ تعبیر کر کے رہی۔ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر قوموں میں زندگی کی روح پھونکی، بیدار کیا، حریت کی اہمیت بتلائی۔ چنانچہ شیخ الاسلام کے اکثر و بیشتر مکاتیب اسی اطمینان دہانی اور ایثار آفرینی پر مشتمل ہیں۔ خصوصاً ایام اسارت کے خطوط تو ایک مستقل درسِ حیات اور جذبۂ عمل کا پیغام اور پرخلوص تعلیمات ہیں۔ وہ ایک صداقت کیش، جفاکش، وفا شعار، مجسمۂ اخلاق اور پیکر عمل تھا جس کے جذبۂ عمل میں کبھی ضعف اور بڑھاپا آیا ہی نہیں۔ وہ جوان تھا اس کی ہمت جوان تھی۔ اس کا جذبۂ ایثار پُرشباب تھا اور اس کا ہر قدم انقلاب آفریں تھا۔ جس نے کراچی جیل سے قوم کے نام وہ پیغام بھیجا جو روح پرور بھی تھا اور انقلاب آور بھی ہم اس موقع پر مکتوبات کے کچھ اجزا افادۂ ناظرین کے مدنظر تحریر کرتے ہیں:

"ہم کمزور ہیں ہم میں اتفاق نہیں، ہم ہتھیار نہیں رکھتے، ہم مال نہیں رکھتے، ہمارا دشمن قوی ہے، اس کے پاس ہر قسم کا سامان ہے، ہم کو اس کو سیدھا کرنا اس سے بدلہ لینا ضروری ہے۔ لیکن ہمیشہ مقابلہ سمجھ اور طاقت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے یہی طریقہ قرآن حدیث اور آنحضرت نے بتلایا ہے۔ اسی لیے ہم کو جب تک کہ ہمارے مقاصد حاصل نہ ہو جائیں یعنی خلافت کی آزادی جزیرۃ العرب کی آزادی پنجاب کی تلافی، اس وقت تک ہم کو چین سے نہ بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔"

مکتوبات کا آخری جزء قند مکرر کی حیثیت رکھتا ہے۔

"ہم روز اپنے مقصد یعنی آزادیٔ ہند اور دیگر مذہبی مقاصد کے قریب ہوتے جارہے ہیں الحمد للہ ملک اور قوم کا قدم نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، خداوند کریم مددگار ہے ہم ضعیف ہیں مگر انشاء اللہ العزیز پلیگ کے کیڑے ہوکر گورنمنٹ کے موجودہ طریقہ اور جماعت کو وبا میں مبتلا کرکے ڈھائی گھڑی کی لگا دیں گے بعون اللہ تعالیٰ سہ

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

حضرت شیخ اور ہمہ گیر حریت کا تصور:

حضرت مدنیؒ کی نظر میں صرف ہند کا مسئلہ حریت نہیں تھا صرف جزیرۃ العرب کی آزادی کا خیال نہیں تھا۔ صرف پنجاب کی تلافی کا منصوبہ نہیں تھا بلکہ یہ انسانیت کا خادم اور راعی تھا۔ اس کی نظر میں عالم انسانیت تھا اس نے جہانبانیٔ جہانبان انسانیت رحمت عالم کی تعلیمات سے سیکھی تھی جس میں استحکام ہے، بے مثال صداقت ہے، بے لاگ حق پسندی ہے، مغربی شعبدہ بازیوں کو یہ سیاست کا معزز لقب نہیں دے سکتے تھے۔ اور نہ پسند کرتے تھے۔ ہزار افسوس ہے کہ ان تملق پسند جفا شعار اور قوم و ملک کے ان کلنگ کے ٹیکوں پر جنہوں نے ذاتی مفاد کے پیش نظر یا ایک جماعت مخصوصہ کے مفادات کی خاطر ایک ملکی و ملی مفاد کا خون کرنا اپنا نظریۂ سیاست اور دستور جماعت قرار دیا اور میدانِ منازعت و مخاصمت گرم کروایا۔ اور بے جرم مادرِ وطن کے ہزارہا افرادِ انسانی کو موت کے گھاٹ اتروایا۔ علماءِ حقانی اور خدامِ ملک و قوم کی دل کھول کر پگڑیاں اچھالیں۔ اور العوام کالانعام انجام سے بے بہرہ قوم کو بے نادِ راہ بلا تعینِ منزل ایک گم کردہ راہ راہبر کی حیثیت سے لے چلا۔ لیکن حضرت مدنیؒ نے جہاں حریتِ ہند کو وقت کی سیاست کا اہم مسئلہ قرار دے کر موضوع حیات بنا یا وہیں قرب و جوار کے دیگر ممالک جو انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اُن کی آزادی کو مقصد اصلی ثابت کر دیا۔ اور ہندوستان کی حریت کو ان کی حریت کی مفتاح و کلید بتلایا۔ اور افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر کے صبر آزما فریضہ کو حیرت انگیز جرأت کے ساتھ ادا کیا۔ اور یہ اعلان کیا تھا کہ اس ملک کی آزادی سے قرب و جوار کے اسلامی ملک مثل افغانستان۔

افغانستان، ایران وغیرہ بہت سے مصائب اور خطرات سے محفوظ ہو جائیں گے مقامات مقدسہ اور دیارِ عرب مصر، شام، فلسطین، سوڈان، شمالی لینڈ وغیرہ جن میں اسلامی آبادی ہے اور ہندوستان کی غلامی کی وجہ سے یہ سب غلامی کی بیڑیوں میں جکڑے گئے ہیں۔ آزاد ہو سکیں گے۔

مظلوم اقوام اور اتحاد باہمی کی اہمیت:

آپ نے حصول آزادی کی خاطر تمام ہندی اقوام میں اتحاد باہمی کی وجہ کو لازمی اور ضروری قرار دیا۔ جو کہ قدیم زمانہ سے ہندو مسلم اور دیگر ہندی قوموں کے مابین چلی آرہی تھی۔ اور ساتھ ہی دشمنان مذہب و ملک و قوم کی مخالفت کی تدابیر کا تدارک خود بھی اپنے اوپر فرض کر لیا اور قوموں کے لیے بھی فرض قرار دیا اور ببانگ دہل اعلان کیا چنانچہ اسی زمانہ میں ایک فتویٰ شائع کیا جس کے خلاف بعض جماعتیں برافروختہ ہوئیں لیکن اس جبل العزم کی عزیمت و جرأت تھی کہ حدیثِ رسالتمآب کی روشنی میں تمام اہلِ باطل کا مقابلہ کیا۔ اور یوں اعلان کیا کہ میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج میں ملازمت حرام ہے .... یہ صحیح ہے کہ قرآن نے ہمیں اولی الامر کی اطاعت اور بادشاہِ وقت کی وفاشعاری کی تعلیم دی ہے لیکن ایسی اطاعت کو حرام قرار دیا گیا ہے جس میں خالق کی معصیت اور بغاوت لازم آتی ہو۔ یہ وہ کلی اصول تھا جو حضرت شیخ الاسلام کا اس باب میں مطمح نظر اور بے باک مبنی بر صداقت نظریہ تھا۔

قومیت متحدہ کا تصور اور اس کی حقیقت:

یہ اتحاد باہمی کا مسئلہ صاحب الشریعتہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اس پُر اعجاز ارشاد کی واضح تفسیر تھی جب کہ فخرِ دو عالم ؐ نے اپنوں اور بیگانوں سے سرزمین مکہ کے بسنے والوں سے کبھی سنگباری اور کبھی نیزہ بازی کی شکل میں اور کبھی توہین آمیز فقروں اور سب وشتم کی صورت میں ایذائیں اٹھائیں اور آپ نے تمام مصائب و شدائد کا خوشی خوشی استقبال کیا اور ان کے حق میں دعائیں کیں جنہوں نے پتھر برسائے تھے۔ آپ نے ان پر پھول برسائے

اور فرمایا:

اَللّٰھم اھد قومی فانھم لایعلمون۔ آپ نے تمام عرب کو اپنی قوم بتایا اور

اپنے کو ان میں کا ایک فرد شمار کیا۔ بعینہ یہی صورت حال ہندوستان میں مسلم وغیر مسلم تعاون باہمی اور اتحاد کا تھا۔ چنانچہ وطن کی حفاظت اور ترقی کے لیے صاحب الشریعۃ نے متحد ہو کر دشمنوں اور مخالفوں سے مقابلہ کرنے اور دفاع کے لیے ہر ممکن قوت کو بروئے کار لانے کی اجازت دی ہے اور جابجا ارشادات نبوی میں اس کی نظیر موجود ہے۔ اسی مشکوٰۃ نبوت کی روشنی اور تائید کے بل بوتے پر حضرت مدنیؒ نے ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کا اعلان بلا پس و پیش ہندوستانیوں میں کیا اور مادی طاقتوں کے بل بوتے پر اترانے والی طاقتوں کے مقابلے میں اسے ایک مجرب نسخہ اور کارآمد حربہ بتلایا۔ اس مقام پر ہم اس شبہ کا ازالہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جو اکثر دلوں میں شیخ الاسلامؒ کے دور سیاست میں بھی اور آج بھی اکثر اذہان میں کھٹکتا نظر آتا ہے اور اس شبہ کی برکت تھی کہ نظریہ متحدہ قومیت کے خلاف دو منظم مخالف جماعتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور راہِ مقصد میں آڑے آئیں اور سدِ حائل بن کر سامنے آئیں جن کا وجود حصول مقصد اور آزادی کے لیے سم قاتل تھا جسے تاریخ کی زبان میں مسلم لیگ اور شدھی سنگھٹن کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت مدنیؒ نے دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں قومیں وطنوں سے بنتی ہیں تمام باشندگان ہند خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی یا عیسائی بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں ایک قوم ہیں متحدہ قومیت کا سوال ایک ایسا سوال تھا۔ جو ہر سنجیدہ شخص کے سامنے آرہا تھا۔ اور معترضین محسوسات اور مشاہدات و تجربات کی دنیا کی سیر کرتے۔ اور متحدہ قومیت کے خلاف مثالیں ڈھونڈتے کبھی اقبال کی شاعرانہ بندشوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے استدلال پکڑتے اور بصد مسرت اقبالؒ کا مشہور شعر لوگوں کے لبوں پہ گونجتا نظر آتا ہے

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں!

اور کبھی جرمن و فرانس کی وحدت مذہب اور دوسری طرف تفریق قومیت اور دو جدا نیشن کیے جاتے ہیں استعجاب کرتے نظر آتے لیکن یہ متبع سنت اور نبض شناس قوم کہ اصول شریعت میں غلط بینیوں اور مصنوعی سیاست داں کہلانے والوں سے مرعوب ہو کر

ادنیٰ ترمیم کو گوارا کر سکتا تھا آپ نے اسے غلط توہم اور خدشہ قرار دیا اور سنت کے پیش نظر اپنے قول کی تشریح کی اور اطمینان قلوب کا سامان بہم پہنچایا چنانچہ حضرت موصوف رحؒ نے فرمایا کہ ہماری مراد قومیت متحدہ ہے جس کی بنیاد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی۔ یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ بحیثیت ہندوستانی ایک قوم ہو جائیں اور اس بدیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتے ہوئے سب کو فنا کر رہی ہے جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں اور اس ظالم و بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں کوئی ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے بلکہ ہندوستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات اخلاق و اعمال میں آزاد ہیں۔ (حیات شیخ الاسلام) اس تفصیل اور تشریح کے بعد یقینی طور پر ازالۂ خدشات ہو جاتا ہے۔ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کو تائید شارع حاصل تھی کہ جس کے سہارے مذہب و سیاست میں ہم آہنگی پیدا کر کے عمل پیرا ہونا لائحہ عمل اور اپنی سعادت اور قوم کی فلاح تصور کرتے رہے میری نظر میں مسئلہ متحدہ قومیت ایک شرعی مسئلہ ہے۔ یہ شریعت کا کھلا اصول ہے کہ معاملات اور رواجہ سیاسیہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں مساوی ہیں ورنہ انسانی مصالح حیات کا نظام درہم برہم ہو جائے، تخریبی عناصر مادر وطن کے بطن سے پیدا ہو ہو کر پھیل جائیں اور ظلم و جبر کا بازار گرم ہو جائے اگر ہم تجارت میں، اقتصادیات میں غذا کی بہم رسانی کے معاملات میں غیر مسلم کے لیے مذہب اسلام میں کوئی صورت نہیں ثابت کریں تو یہ دین اسلام کا نقص شمار ہو گا۔ کیونکہ دوسری طرف یہی شریعت نفوس انسانیہ کے قتل و خون کو ظلم عظیم قرار دیتی ہے تو اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو گا کہ ہم کسی پہ باب رزق مسدود کر دیں اور فقر و فاقہ پہ مجبور کریں خواہ ایسا معاملہ کسی فرد مسلم کے ساتھ ہو یا یہ سلوک کسی غیر مسلم کے ساتھ برتا جائے، اور اگر ظالموں اور باغیوں کو ان کے جرائم و معاصی پہ کماحقہ سزا نہ دی جائے اور نقصان رساں عناصر کو کیفر کردار کو نہ پہنچایا جائے تو عالم میں عدل و انصاف اور حقانیت کا قیام دشوار بلکہ محال ہو جائے اور رنگارنگ نقائص اور عیوب کا ظہور ہونے لگے۔ دلائل عقلیہ کے علاوہ جب خود حکیم الامت طبیب ... مسئلہ کو

ایک شرعی مسئلہ کہنے میں کوئی عذر باقی نہیں رہتا بلکہ ہم کہنے پہ مجبور ہیں۔ جب یہ مسئلہ مؤید بالنقل والعقل ہو کہ مسلّم ہے تو پھر وقت اور ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر متحدہ قومیت کا اعلان شیخ مدنیؒ کا ایک مبارک اور نیک اقدام تھا اور عجیب بات ہے کہ دیگر ماہرین سیاست جب دنیائے سیاست میں قدم رکھتے ہیں تو سیاست کو ایک مستقل موضوع شریعت اور مذہب سے جداگانہ مسلک عمل تصور کرتے ہیں لیکن شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کو فطرۃً مافوق العادت جرأت اور فہم رسا عطا کی گئی تھی۔ اس لیے اپنے لیے جس جماعت کو انتخاب کیا اس کے اصول بھی فی نفسہٖ نہایت پاکیزہ اور خلوص پہ مبنی تھے چنانچہ مسئلہ متحدہ قومیت کانگریس کا بھی پہلا اور ضروری مقصد بتایا گیا اور کانگریس نے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۵ء میں اپنا پہلا اور ضروری مقصد حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا تھا "ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔"

وطن عزیز کی تعمیر و ترقی کا جذبہ صادق:

حضرت موصوف کی حب الوطنی اور ارتقاءِ ملکی کا نظریہ بھی ایک ایثار اور جذبہ خالص تو اریخِ ماضیہ اور سیاستِ حاضرہ کے عین مطابق تھا وہ اپنے وطن عزیز کو خوشحال اور معراجِ ارتقاء پر دیکھنے کے متمنی تھے غیروں کے دستبرد کو ایک ظلم اور ناجائز تصرف سمجھتے تھے۔ اسے اپنا آبائی وطن تصور کرتے تھے۔ اسے بام عروج پہ پہنچانا اپنا حصہ اور فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ تمام تر مساعی اور جدوجہد اس دعوے پہ کافی ثبوت ہیں شیخؒ کا پرفتن ماحول تھا۔ ایک طرف ایک تحریک حریت جاری تھی۔ تو دوسری طرف شدھی اور سنگھٹن کی تحریک مقصد آزادی میں ناکام بنانے کے لیے پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم عمل تھی ماور ہموار اور خوشگوار ہونے والی فضا کو مکدر بنا رہی تھی ایسے وقت میں سیاست حاضرہ کا تقاضا تھا کہ امن قائم کیا جائے موافق فضا اور ماحول پیدا کیا جائے۔ عوام کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دی جائے اور روحِ انقلاب پھونک کر اس ساعت سعید کا شدت سے انتظار کریں کہ عروس آزادی آراستہ پیراستہ زینت آغوش بنے ایسے ناساز گار دور میں شیخ الاسلام ہی جیسے جانباز مجاہد کی ضرورت بھی تھی بالآخر وطن عزیز کے لیے اپنے آپ کو

پیش کیا اور مسلم حلقہ میں اتحاد اور امن پسند جماعت کا نگریس کے ممتاز رہنما اور اس جدوجہد کے مجاہد اعظم شیخ مدنیؒ ہی رہے اور مسلم نوجوانوں میں عموماً جماعت علما میں خصوصاً ذہن انقلاب دیتے رہے یہ بھی پیارے وطن کی حریت کی تمہید اس حب الوطنی کی تعلیم درگاہ رسالت ہی سے حاصل کی تھی۔ چنانچہ سرکار دو عالمؐ خود بھی سرزمین مکہ سے محبت کرتے اور امت پہ تا ابد اس مقدس سرزمین سے محبت اور اس کی تعظیم کو واجب قرار دیا جب آپؐ نے مکّہ والوں کو توحید کی دعوت دی اور خدائے واحد کی طرف بلایا وہ آغاز اسلام کا دور تھا۔ اسلام عرب کی سرکش قوم کے لیے ایک اجنبی دین تھا اصنام پرستی کے علاوہ ہر آواز پر دعوت ایک جرم عظیم بلکہ موت کو دعوت دینا تھا چنانچہ مکہ کا ہر فرد بشر رسول اکرمؐ کے خون کا پیاسا نظر آنے لگا اور جان کا گاہک بن گیا اور انواع و اقسام کے مصائب و شدائد کے پہاڑ آپؐ پر توڑے جانے لگے۔ مکّہ کی وسیع و عریض آبادی تنگ کر دی گئی تھی غرض کہ دست انسانی میں جو امکانی صورت ایذا رسانی کی ہو سکتی ہے آپؐ کو پہنچائی گئی بالآخر حکم خداوندی اور وحی ربانی کے بموجب مکّہ مقدسہ کی مفارقت کا عزم کیا الوداع کے وقت مکہ کی فضا پہ بار بار نظر ڈالتے اور حسرت کے ساتھ فرماتے:

"اے سرزمین مکّہ میری قوم مجھے تیرے اوپر رہنے نہیں دیتی، تیرے فرزند مجھے نکالتے ہیں ورنہ تیری مفارقت مجھے کسی صورت گوارا نہیں" یہ وہ تعلیم حبُ الوطنی تھی۔

جسے شیخ الاسلامؒ نے تاجدار مدینہ سے سیکھ کر اہل وطن کو سکھایا۔ کیا سنت و سیاست کی یہ ہم آہنگی قابل تحسین و ستائش اور لائق صد رشک نہیں جو حضرت مدنی کا روشن کارنامہ ہے۔

عظیم الشان قربانیوں کا اصلی محرک:

سیاسی خدمات کے سلسلے اور اس زندگی کے دوران قید و بند مصائب و شدائد، مظلومیت و بے بسی کی زندگی حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کی حیات مبارکہ میں ایک بلند مینار اور روشن نشان ہے۔ اور از خود بہ تائید غیبی سنت یوسفی کی ادائیگی ایک شرف و سعادت ہے۔

آپ نے تحریک حریت میں متعدد مرتبہ سیاسی مجرم ہونے کی حیثیت سے ظالموں اور غدار انسانیت کے ہاتھوں سخت سے سخت قید و بند کی زندگی گزاری جن میں ہر ایک واقعہ

بجائے خود مستقل تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان میں اسارت مالٹا اور اسارت لبراپی حضرت مرحوم کی زندگی کے زریں، سیاسی کارنامے ہیں۔ چونکہ آپ کی نظر میں ہندوستان کی ماضی کی تاریخ اور حال کی تباہ کاریوں اور بربادیوں دونوں ہی کا نقشہ مرتسم تھا اس لیے آپ نے آزادی ہند کو ایک بنیادی اور اساسی مسئلہ قرار دے کر اس کی ضرورت اور اہمیت کو مذہبی دلائل اور شواہد سے ثابت کیا۔ اور اقتصادی اور معاشی نقطۂ نظر سے بھی ضروری بتلایا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں اور رہنماؤں کے قدم جادۂ عزیمت سے اکھڑ گئے۔ اور شاطران مغرب کی شعبدہ بازیوں اور عیاریوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور ہندوستانی عوام کو شدھی اور سنگھٹن جیسا ترش اور تلخ جام پلایا۔ مگر یہ خمخانۂ قاسمی کا بادہ نوش دیوانہ اپنے دماغ میں وہ نشہ رکھتا تھا جسے دنیا کی کوئی ترشی نہ اتار سکی۔ آپ کی باطن بیں نگاہیں اگر ایک طرف دولتِ عثمانیہ کے مسئلہ تحفظ دار تقاریر پہ تھیں تو دوسری طرف ہندوستان کی آزادی پہ تحریک خلافت نے کم و بیش ۳، ۴ سال کی عمر پائی اس دور میں بھی آپ کی جدوجہد اور سعی مسلسل سب وہ نوکِ قلم پہ آنے کی محتاج نہیں آپ نے خدمت قوم کا بلند حوصلہ اس لیے نہیں پیدا کیا تھا کہ جیل کے دروازوں اور پھانسی کے تختوں یا برسر خلق رسوائیوں سے مرعوب ہو کر غداروں کی تسخیری طاقتوں کے سامنے سر نیاز خم کر دیں گے یا سرنگوں ہو کر ان کے حلقۂ غلامی میں اپنا نام لکھوائیں گے بلکہ آپ کے سامنے فخر رسالت کی پیش کردہ صداقت کی وہ آواز تھی جو آگے بڑھا رہی تھی من رای منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔ آپ چونکہ ایک غیرت دار ماں کے جگر گوشہ اور جواں ہمت باپ کے فرزند تھے اس لیے آپ اضعف الایمانی پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔ نہ اسے اپنا شیوہ سمجھتے تھے۔ لامحالہ دست و زبان کو عمل میں لانا پڑا اور عیش و عشرت کی پرسکون اور قابل رشک زندگی پہ دار و رسن کو ترجیح دی۔ یہ خدمت ملک و قوم کے سلسلے میں آپ کی عالی حوصلگی تھی یہ آپ کا جذبۂ ایثار تھا سہ

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یہ ساری قربانیاں کیوں تھیں۔ یہ حوصلے کیا تھے۔ یہ ایثار کیا تھا۔ یہ سب صدقہ اور طفیل تھا تعلیمات پیغمبر اسلام آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جن کی فکر کا نقطہ آغاز اور منتہائے پرواز تخلیق عالم کی راز دانی۔ اور خالق کائنات کی معرفت، پر مرکوز تھا۔ شیخ الاسلامؒ نے بھی اصول فطرت کو اپنایا تھا۔ مذہب و سیاست کا صحیح مفہوم مشکوٰۃ نبوت کی روشنی سے حاصل کیا تھا۔

ایک مشہور عام نظریہ کی تقلید:

جس طرح پیغمبر انسانیت ﷺ عالم کے لیے ایک عظیم الشان مربی اور معلم اخلاق تھے۔ حضرت مدنیؒ نے بھی مربی اور معلمی کی یہی مثال پیدا کی تھی اور ایک مثال قائم کی تھی کہ بہیر کسی کا منہ یہ کہنے کے لیے نہ کھل سکے کہ لا حَظَّ للعلماءِ فی السیاسۃِ حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا یکہ و تنہا وجود مورخ کو اپنے غیر صائب قول سے رجوع کروانے کے لیے سو دلیلوں کی ایک دلیل ہے۔

حوصلہ شکن حالات کے مقابلے میں بلندی حوصلہ:

واضح رہے کہ خدمت قوم کا علم ہندوستان کے دیگر بڑے بڑے رہنماؤں نے بھی بلند کیا تھا اور مصائب و شدائد کے نشانہ بنے تھے۔ لیکن شیخ الاسلام مدنی قدس سرہ العزیز اور دیگر رہنماؤں کی خدمت ملک و قوم میں آسمان و زمین کا فرق ہے اگر کوئی جیل جا رہا تھا تو جے جے اور "زندہ باد" کے نعرے بھی لگائے جا رہے تھے اور شاباشیاں بھی دی جا رہی تھیں حوصلہ افزائیاں کی جا رہی تھیں مگر کوئی منصف مزاج مورخ زمانہ کی "بوالعجبی" نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اس جانباز مجاہد کو خدمت ملک کے صلے میں جوتوں کا ہار پہنایا جا رہا تھا اور مظالم و شدائد کا تختۂ مشق بنایا جا رہا تھا۔ سنگباریاں تھیں اور گالیوں کے تحفے اور یہ کہا جا رہا تھا۔ کہ یہ ہندوؤں کے ہاتھ بک گیا ہے کانگریس کا ذوں کی جماعت میں مل گیا ہے۔ ایسے نازک ترین وقت میں استقلال و عزیمت کا دامن نہ چھوڑنا اور اولوالعزمی کا ثبوت شیخ الاسلام مدنی کی مافوق العادۃ و جرأت رندانہ تھی جو ہندوستانی خادموں اور اہل سیاست کی صف میں آپ کو ممتاز رکھتی ہے اور آپ کی خدمت کی قدر و قیمت دیگر رہنماؤں کی خدمتوں کے مقابلے میں گراں مایہ اور بیش بہا ہو جاتی ہے۔

متحدہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ اور مدنی فارمولا،

مولانا سید حامد میاں

نوائے وقت، لاہور کی اشاعت ۱۴ نومبر ۱۹۸۳ء میں ایک صاحب سیٹھیؒ، کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں شیخ الاسلام مولانا حسین مدنی کے بارے بعض خیالات کا اظہار کیا تھا، بعض واقعات کی صحت پہ شبہ اور بعض باتوں پہ حیرت واستعجاب ظاہر کیا تھا۔ مولانا سید حامد میاں نے اس کے جواب میں ایک مضمون لکھ کر روزنامہ جنگ، لاہور کی، اشاعت مورخہ ۱۵، ۱۶ اور ۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کی تین قسطوں میں شائع کرایا تھا۔ یہ ایک فکر انگیز اور تحقیقی مضمون تھا۔ اس کے مطالب کی افادیت کا تقاضا تھا کہ اس مجموعے میں شامل کرلیا۔

سیٹھی صاحب کو تعجب ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو (مولانا رشید احمد) صدیقی صاحب نے بزرگ اور ولی کیوں کر شمار کرلیا۔ حالانکہ سیٹھی صاحب اگر ان کے حالات پر مشتمل کتابوں کا مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ وہ چشتی صابری نقشبندی مجددی، اور طریقہ قادریہ و سہروردیہ ہر چہار سلسلوں میں مجاز تھے۔ شیخ الطریقہ تھے۔ اور اپنے تمام خلفاء کو منتہاء تصوف یعنی مراقبۂ ذات مقدسہ (احسان) تک تعلیم فرمایا کرتے تھے۔

انہیں سلوک و تصوف میں اپنے دور میں بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ اسی لیے خداوندِ کریم نے انہیں وہ مقبولیت عطاء کی جو اولیاء کرام میں بہت بڑے بڑے اولیاء کو ہی حاصل تھی۔ ان کے گرد بیعت ہونے والوں کا اتنا مجمع ہوتا تھا کہ وہ لاؤڈ اسپیکر پہ بیعت فرماتے تھے۔ پانچ ہزار تا آٹھ ہزار بیک وقت بیعت ہونے والوں کا اندازہ تحریر کیا گیا ہے۔ جس کی مثال ذی زمانہ میں نہیں ملتی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیک وقت

بیعت ہونے والوں کی تعداد دس ہزار تک تبلائی گئی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ تعداد بیعت جہاد کرنے والوں کی ہو۔ لیکن حضرت مدنی رحؒ سے بیعت ہونے والے بیعت طریقت کرتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحؒ کے پاس حضرت مدنی رحؒ کی تصوف و سلوک کے موضوع پر چند تقاریر ٹیپ تھیں۔ جنہیں وہ آخر حیات تک سنتے رہے۔ کیونکہ مفتی صاحب رحؒ خود بھی کامل صوفی تھے۔ انھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ میں تکمیل سلوک کی تھی اور یہ بات شاید سیٹھی صاحب کو معلوم نہ ہو کہ نظامی صاحب کے (ایڈیٹر نوائے وقت) محبوب اور ممدوح مولانا عبدالماجد دریابادی، حضرت مدنی رحؒ سے ہی بیعت تھے۔

۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء میں آپ برّاعظم ایشیاء میں علوم دینیہ کے سب سے بڑے مرکز کے سب سے بڑے درجہ کے مدرس یعنی شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ اور ۱۳۷۷ھ دسمبر ۱۹۵۷ء تک اسی مسند پر درس حدیث دیتے رہے۔ جن حضرات نے اب سے ستاون سال قبل دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ اگر زندہ ہیں تو آپ ہی کے شاگرد ہیں۔

۲۔ سیٹھی صاحب نے استفسار کیا ہے کہ سلہٹ میں جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ وہاں کون صاحب میزبان تھے۔ اس کے جواب کے لیے پورا واقعہ نقل کر رہا ہوں مولانا رشید احمد صاحب صدیقی (کلکتہ) لکھتے ہیں۔

"مختلف مقامات پر حضرت رحؒ کی تقریروں کے پروگرام بنانا اور آپ کے متعلق سفر کے انتظامات کرنا راقم الحروف سے متعلق تھا۔ بہرکیف ہمارا قافلہ ۳ مارچ کی شام کو گوپال پور تھانہ بیگم گنج پہنچا۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی مولانا نافع گل اور دیگر چار پشاوری طالب علم ہمراہ تھے۔ چوہدری رازق چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ نواکھالی کے دولت کدہ پر قیام ہوا۔ دوسرے دن ایک عظیم الشان جلسہ میں انتخابی تقریر کرنی تھی۔ نمازِ عشاء کے بعد گیارہ بجے طعام تناول کیا اور تقریباً بارہ بجے سونے کی غرض سے آرام فرمانے لگے۔ راقم الحروف پاؤں دباتا رہا کچھ دیر کے بعد آپ کو نیند آ گئی

اور ہم لوگ دوسرے کمرے میں ضروری کام کرنے لگے۔

تقریباً دو بجے شب کو راقم الحروف اور چوہدری محمد مصطفٰے انسپکٹر مدارس ریٹائرڈ کو طلب فرمایا۔ ہم دونوں فوراً حاضر خدمت ہوئے۔ ارشاد فرمایا کہ لو بھئی اصحاب باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا۔ اور ہندوستان کے ساتھ بنگال و پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا۔

راقم الحروف نے عرض کیا کہ اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں۔ کیا کریں گے؟ آپ نے جواب دیا ہم لوگ ظاہر کے پابند ہیں اور جس بات کو حق سمجھتے ہیں اس کی تبلیغ پوری قوت کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ دوسرے دن گوپال پور کے عظیم الشان جلسہ میں تقسیم کی مضرتوں پر معرکہ آرا تاریخی تقریر ارشاد فرمائی اور ایک سال چار ماہ کے بعد ۳/ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل ہند کے غیر متوقع اعلان سے اس واقعہ کی حرف بحرف تصدیق ہو گئی[۵۹]

یہ واقعہ اوائل ۱۹۴۶ء میں پیش آیا۔

سیٹھی صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں میزبان کا نام بھی ہے۔ ساتھیوں کے نام بھی ہیں اور راویوں کے بھی۔

۳۔ سیٹھی صاحب نے لکھا ہے۔

"حضرت مولانا مدنیؒ اپنے تبحر علمی کے باوجود علماء ظواہر میں سے تھے۔ اور ایک خالص سیاسی شخصیت تھے۔"

سیٹھی صاحب نے اگر تصوف کا مطالعہ کیا ہو گا تو وہ یہ بات بآسانی سمجھ سکیں گے کہ اولیاء کرام کی دو قسمیں ہیں ایک اصحاب ارشاد اور دوسرے اصحاب تکوین۔ اصحاب ارشاد جتنے بھی ہوں قطب الارشاد تک سب کے سب ظاہر شریعت پر ہی چلنے کے پابند ہوتے ہیں۔ ان پر جذب کا قطعاً بھی اثر نہیں ہو...

۵۹۔ حفظہ ہو روزنامہ الجمعیۃ دہلی شیخ الاسلام نمبر ۱۵/ فروری ۱۹۵۸ء ص ...

وہ اصحاب صحو ہوتے ہیں۔ تیقظ اور بیدار مغز، اور یہ فرق قرآن کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ پندرھویں پارہ کا آخری اور سولھویں پارہ کا پہلا رکوع دیکھ لیں۔

سیٹھی صاحب کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ خالص سیاسی شخصیت نظر آ رہے ہیں۔ سیاسی ہونا عیب نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کی سیاست کے فرائض انبیاء کرام انجام دیا کرتے تھے۔ کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء۔ (بخاری ص۴۹۱ ج ۱)

سیٹھی صاحب نے لکھا ہے:

"لیکن جہاں تک انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد کے حالات میں مسلمانوں کی پوزیشن کا تعلق تھا وہ اس مسئلہ کو ملتوی رکھنا چاہتے تھے۔ کہ آزادی کے بعد ہندوؤں سے معاملہ کر لیا جائے گا۔"

سیٹھی صاحب جیسے اور بھی لوگ ہو سکتے ہیں۔ جنہیں تاریخ کا پورا علم نہ ہو اس لیے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایسا خیال کرتے ہوں گے۔ جب کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور انکی جماعت جمعیۃ علماء ہند کا موقف یہ تھا۔ کہ تقسیم ہندوستان کے سب مسلمانوں کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ تقسیم سے ان علاقوں کو فائدہ پہنچے گا۔ جہاں مسلمان پہلے ہی سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ اور وہ فائدہ بھی ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ ان علاقوں کی مسلم آبادی ۵۰٫۵ ہے اور غیر مسلم آبادی ۴۹٫۵ رہی ہے۔ غیر مسلم آبادی مؤثر ترین اقلیت ہوگی۔ (اگر پاکستانی علاقوں سے غیر مسلم نہ جاتے تو یہی تناسب تھا) ادھر جو صوبے ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ ان کی مسلم آبادی بہت دشواریوں میں گھر جائے گی اور وہ ضعیف اقلیت بن کر دوسروں کے رحم پہ رہ جائیں گے اور تقسیم کے بعد پاکستان ایسا ہی ایک پڑوسی ملک ہو جائے گا۔ جیسے افغانستان اور ایران۔

لیکن قائداعظم نے ان نظریات کا جواب کانپور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ دیا تھا:

"میں اکثریت کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر مسلم اقلیت والے صوبوں کے ڈھائی کروڑ[1] مسلمانوں کو قربان کرکے ان کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کرنے کو تیار ہوں"[2]۔

اس سے بہت پہلے احمد آباد کی تقریر میں فرمایا تھا:

"اقلیت والے صوبوں پہ جو گزرتی ہے گزر جانے دو۔ لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو آزاد کرا دیں جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں: تاکہ شریعتِ اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کرسکیں"[3]

معلوم ہوا کہ یہ نکتہ کہ مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کا کیا ہوگا اور ان کے لیے کونسا فارمولا مفید رہے گا؟ شروع سے بھی پہلے سے مدارِ فکر چلا آرہا تھا۔ جمعیۃ کے حضرات یہ بھی برابر کہتے رہے ہیں کہ سب یکجا مل کر بیٹھیں اور اس مسئلہ پہ غور کرکے ایک بات طے کرلیں۔ ہر پہلو پہ بحث و تمحیص کے بعد کچھ طے ہو اس پہ سب متفق ہو کر چلیں۔ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے الفاظ یہ ہیں:

"اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح طریقِ کار یہ ہے کہ مسلمانوں اور مسلم جماعتوں کے نمایاں اصحابِ رائے اور صائب الرائے حضرات مجتمع ہوں اور موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لے کر کھلے دل اور دماغ کے ساتھ یہ سوچیں اور غور کریں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے باعزت

---

[1] تقریر میں انہوں نے یہی فرمایا تھا ورنہ اس وقت انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے چار کروڑ تھی۔ اور اب وہ ۱۲۵ کروڑ سے زیادہ ہیں۔ اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد پاکستان کی کل آبادی سے تعداد میں زیادہ ہیں یعنی ہندوستان کی مسلم "اقلیت" اکثریت میں اور پاکستان کی مسلم "اکثریت" اقلیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اگر قائداعظم حیات ہوتے تو کیا اقلیت کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کرنے کو تیار ہوتے۔

[2] قائداعظم کا بیان سہ روزہ مدینہ، بجنور، ۹ جولائی ۱۹۴۴ء نیز دیکھیے: کشفِ حقیقت از مولانا حسین احمد مدنی ص ۵۸۔

[3] ایمان، لاہور، پاکستان نمبر، ۲۸ فروری ۱۹۴۰ء نیز دیکھیے کشفِ حقیقت، محولۂ بالا، ص ۵۹۔

مقام کس طریقے سے مل سکتا ہے اور اس کے حصول کے لیے کیا طریق کار ہو؟[1]

حضرت مدنی رح جمعیت علماء ہند کے صدر تھے۔ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ (ناظم عمومی) تھے۔ آئیے آپ کو ان کی اس زمانہ کی ایک تحریر دکھلائیں جس سے امید ہے آپ کی تاریخی معلومات میں اضافہ ہو گا اور یہ بھی کھل کر سامنے آ جائے گا کہ جمعیت کا موقف کیا تھا۔ کیا ان کا موقف وہ تھا جو بقول سیٹھی صاحب کانگریس کہتی تھی یا اپنا جدا فارمولا تھا۔ اور وہ آخر تک چاہتے رہے تھے کہ مسلمان سب مل کر بیٹھیں اور حل نکالیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن تحریر فرماتے ہیں:

"**صحیح طریقہ کار** آخر میں بصد عجز و الحاح پاکستانی اور لیگی حضرات کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ صحیح طریق کار وہ نہیں ہے جو مسلم لیگ کے قائد اعظم نے اختیار کر رکھا ہے۔ بلکہ مسلم مفاد کے لیے سب سے بہتر طریق کار یہ ہے کہ تمام مسلم جماعتیں پارٹی بازی یا جماعتی برتری کے غیر اسلامی تصور سے بالاتر ہو کر ایک جگہ بیٹھیں اور پھر دیانت و سنجیدگی کے ساتھ تمام پیش کردہ مسلم اسکیموں پر غور کریں۔ تاکہ سب مسلمان ایک نقطے پر جمع ہو کر متفقہ طور سے ایک مسلم مطالبہ حکومت اور کانگریس کے سامنے پیش کر سکیں اور کسی جماعت اور کسی پارٹی کو اس سے اختلاف نہ ہو۔

چونکہ جمعیۃ علماء ہند بار بار اس اقدام کے لیے مسلم لیگ کو خصوصیت کے ساتھ دعوت دے چکی ہے۔ اس لیے اب مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرنے کا اعلان کرے۔ ورنہ تو ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ حالت کا نتیجہ محض یہ ہے کہ صرف حکومت اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے اور خدا جانے کب تک اٹھاتی رہے گی۔ وہ کبھی پاکستانی حضرات کو طفل تسلی دیتی رہے گی۔ اور کبھی کانگریسیوں کو سراہنے لگے گی۔

---

[1] کشف حقیقت از مولانا حسین احمد مدنی رح ص ۱۳

اگر میری اس گذارش کو نیک خواہی پر محمول کر کے اس صحیح طریق کار کو اختیار کر لیا جائے تو اگرچہ آج ہندوستان کو ڈومی نین اسٹیٹس (درجہ نو آبادیات) سے زیادہ نہ ملے۔ مگر اس کے بعد وہ وقت بھی جلد ہی آ جائے گا۔ جب تھوڑی سی جدوجہد سے ہمارا یہ ملک آزادیٔ کامل کی منزل تک بھی پہنچ جائے گا۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراطٍ مستقیم۔"

"جمعیۃ علماء ہند کا فیصلہ: پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہے:

ہم ذیل میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور ۱۹۴۲ء کا فیصلہ اور اس کے بعد کی اضافہ کردہ تشریح درج کرتے ہیں۔ تاکہ ہر ایک انصاف پسند طالب حق یہ فیصلہ کر سکے کہ جمعیۃ علماء صرف نفی کے پہلو پر عامل نہیں۔ بلکہ پاکستان کے مقابلہ پر ایک ایسا حل بھی پیش کرتی ہے جس سے مسلمانوں کو وہ تمام فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو تحریک پاکستان کے حامی پیش کرتے ہیں۔ مزید برآں پورے ہندوستان میں ان کی قوت اور ان کا رسوخ باقی رہتا ہے (ذیل میں فیصلہ ملاحظہ فرمائیے جو اجلاس سہارنپور میں ہوا) جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس عام اس جمود و تعطل کی حالت کو ملک و قوم کے لیے نہایت مضر اور ملی حیات و ترقی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کی تمام معتدبہ جماعتیں اور عام پبلک حصول آزادی کے لیے بے چین و مضطرب ہے اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اور تمام افراد مختلف خیالات اور فارمولے تجویز کر رہے اور شائع کر رہے ہیں۔ مجلس عاملہ اپنی رائے اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء کی تجویز نمبر میں ظاہر کر چکی ہے، آج پھر اس کی تجدید کرتی ہے اور اس کے آخری حصہ کی رفع اجمال کی غرض سے قدرے توضیح کر دینی مناسب سمجھتی ہے یہ بات بدیہی اور مسلمات میں سے ہے کہ ہندوستان آزادی کی نعمت سے اس وقت تک متمتع نہیں ہو سکتا، جب تک ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ اور متحدہ محاذ قائم نہ کیا جائے اور ہندوستانی کسی متفقہ مطالبہ کی تشکیل

اور متحدہ محاذ قائم کرنے میں جتنی دیر لگائیں گے۔ اسی قدر غلامی کی مدت طویل ہوتی جائے گی۔ جمعیتہ علماء ہند کے نزدیک تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ حسب ذیل نکات پر اتفاق کرلیں۔ اور اسی بنیاد پر حکومت برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کردیں۔

الف: ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔

ب: وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہو گا۔ مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہو گی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے۔ جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

ج: ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیار ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں گے اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

د: ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہو گی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

تشریح: اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیت ہمارا مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ وہ بے شک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں مجموعہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لیے یہی مفید ہے۔ مگر یہ وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے

حق خود ارادیت تسلیم کر لیا جائے اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی سیاسی تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدّی نہ کر سکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدّی کا خوف نہ رہے، باہمی افہام و تفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم و غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے ممکن ہے:

۱۔ مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔

ہندو ۴۵ مسلم ۴۵، دیگر اقلیتیں ۱۰

۲۔ مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔

۳۔ ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم وغیرہ مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے، یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے تنازعات کے آخری فیصلے کرے گا۔ نیز تجویز ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مُسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

۴۔ یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔

نوٹ (۱) مندرجہ بالا تجویز الف سے بشمول د تک اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء میں پاس ہو چکی تھی۔ اس پر مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۵/۱۲/ جنوری، یکم و دوم فروری ۱۹۴۵ء میں تشریح کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد یہ پوری تجویز مع تشریح جمعیۃ علماء ہند کے چودھویں اجلاس عام بمقام سہارنپور منعقدہ ۴۔۵۔۶۔۷ مئی میں منظور کی گئی۔

نوٹ (۲) ہر تجویز کے ساتھ اگر مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سہارنپور منعقدہ ۳ر اگست ۱۹۳۱ء کے فارمولا کی، مندرجہ ذیل دفعات بھی پیش نظر رہیں۔ تو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا نقشہ ہر مسلمان کے سامنے آسکتا ہے۔ اور وہ بآسانی یقین کرسکتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی تائید و حمایت سے نہ یہ کہ پاکستان ہندوستان کے چند گوشوں میں سمٹ کر رہ جائے، بلکہ پورا ہندوستان ایسا پاکستان بن سکتا ہے۔ جس میں شرعی محکمے اور دار القضاء قائم ہوں۔ اور پرسنل لا (یعنی شرعی احکام) کا نفاذ مسلمانوں کے کامل اور آزاد اختیارات کے ذریعہ سے پورے ہندوستان میں نافذ ہو۔

مجلس عاملہ اجلاس سہارنپور کے منظور کردہ فارمولا کی چند دفعات:

(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کی کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی آزادی، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تصریح ہوگی کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی (مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین، خلع، عنین و مفقود، نفقہ، زوجیت، حضانت، ولایت نکاح و بال وصیت، وقف، وراثت، تکفین و تدفین قربانی وغیرہ)

(۳) مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے، مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے[1]

---

[1] "تحریک پاکستان پر ایک نظر" از صفحہ ۵۹ تا ۷۰۔ مؤلفہ: مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاری ناظم اعلیٰ مرکزیہ جمعیۃ علماء ہند، ناشر ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس (دہلی)

ان اکابر کے فارمولے کے مطابق معرض وجود میں آنے والی حکومت میں مسلمان مرکز میں بڑی طاقت ہوتے اور آسام، بنگال، پنجاب، کشمیر، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں غالب ہوتے اور مذہبی معاملات میں اور تمام صوبائی امور میں خود مختار رہتے اور اقلیت والے صوبوں میں انہیں مذہبی امور میں حق استرداد حاصل ہوتا۔

یہی وہ فارمولا تھا۔ جسے دیکھ کر پہلے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پر زور تائیدی کلمات لکھے تھے کہ:

"مسلمانوں کے اطمینان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی عمدہ تجویز نہیں"۔

اور پہلے اس فارمولے پر مسلم لیگ بھی متفق تھی۔

حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے جو طویل عرصہ تک ناظم جمعیۃ علماء ہند رہے۔ پھر حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب کی وفات پر ناظم عمومی (جنرل سیکرٹری) مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں الجمعیۃ کے مجاہد ملت نمبر میں اپنے ایک طویل مضمون میں بہت سے احوال و واقعات قلم بند فرمائے ہیں۔ ان میں اس فارمولے کا پورا خاکہ دیا ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے پہلے ہر جماعت کو اختیار تھا کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق جو فارمولا مسلمانوں کے لیے زیادہ فلاحی سمجھے اسے پیش کرے۔ اگر جمعیۃ علماء ہند نے اپنا فلاحی فارمولا پیش کیا۔ تو کیا جرم کیا؟ اس بحث کے لیے ان ہی تاثرات کے تحت ایک عنوان بھی قائم فرماتے ہیں۔ کہ "جرم کیا تھا؟" اور پھر فارمولا بیان کرتے ہیں۔ جو ہم بعینہٖ نقل کر رہے ہیں۔

"جرم کیا تھا؟

میرے احباب اور بزرگ یہ تلخ نوائی معاف فرمائیں کہ اس دور میں ایک بڑا ظلم جمعیۃ علماء ہند پر کیا جاتا رہا۔ برطانوی مشنری جمعیۃ علماء ہند کے خلاف کام کر رہی تھی اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ جمعیۃ علماء ہند اس کی حریف تھی اور ہندوستان سے اس کا نام و نشان مٹانا چاہتی تھی۔

یہ مشنری پروپیگنڈے کی تمام طاقت دو باتوں پر صرف کر رہی تھی:

اول یہ کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آزادی کا مطالبہ ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان اس کے حامی نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ جمعیتہ علماء ہند اور قوم پرور مسلمان فریب خوردہ ہیں۔ یہ کوئی مثبت پالیسی نہیں رکھتے۔ صرف کانگریس کی ہمنوائی ان کا نصب العین ہے۔

جمعیتہ علماء ہند اور قوم پرور مسلمانوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ برطانوی پروپیگنڈے کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مسلمانوں کی اکثریت کو اس پروپیگنڈے نے نہ صرف متاثر بلکہ مسحور بنادیا تھا۔ لا محالہ جمعیتہ علماء ہند کی آواز "نقار خانہ میں طوطی کی صدا" بن کر ناکام ہوتی رہی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمعیتہ علماء ہند پاکستان کا بہترین بدل تلاش کر چکی تھی اور ایک ایسا فارمولا منظور کر چکی تھی کہ وہ کامیاب ہو جاتا تو ملک کی طاقت میں یہ رخنہ نہ پڑتا کہ ایک ہی ملک کے دو حصے جن کے متعلق اب یہ کہا جارہا ہے کہ کسی بھی حصہ کا کامیاب دفاع اور تحفظ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں کی فوجی کمان ایک نہ ہو۔ یہ دو حصے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیر و ترکش سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور مالیہ کا بڑا حصہ جو تعمیر و ترقی یا کسی بیرونی طاقت کے مقابلہ پر دفاعی طاقت کے مضبوط بنانے میں صرف ہوتا۔ اپنے ہی ہاتھ پاؤں کے بجائے پر صرف ہو رہا ہے۔ اور یہ صورت کہ بھارت کی مسلم اقلیت غضبناک اکثریت کے شکنجہ میں کسی ہوئی بے یارو مددگار واویلا کر رہی ہے۔ یہ افسوسناک صورت بھی پیش نہ آتی۔ غور فرمایئے جمعیتہ علمائے ہند کے فارمولے کے اہم اجزاء یہ تھے:

۱۔ صوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لیے کر دی گئی ہو باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو:

اقلیتیں

۵۔ جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے۔

اس فارمولے کا مفاد یہ ہوتا۔

الف:۔ اہم پورٹ فولیو (قلم دان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوتی۔

ب:۔ صوبۂ سرحد، صوبہ سندھ، صوبۂ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جاتی تو صوبے بشمول کشمیر، مذہبی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی امور میں قطعًا خود مختار رہوتے۔

ج:۔ پورا صوبہ پنجاب راولپنڈی سے لے کر ضلع سہارنپور کی سرحد تک۔

د:۔ پورا صوبۂ بنگال، جس کا دارالحکومت کلکتہ کا عظیم شہر ہوتا۔ مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا۔

ھ:۔ صوبۂ دہلی اور صوبۂ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا تقریبًا مساوی حصہ ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۴۴، ۳۵ فی صدی تھے۔

و:۔ ہندوستان کے باقی صوبوں میں مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے کیونکہ

۱۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق ۳۰ یا ۳۳ فی صدی ہوتا۔

۲۔ وزارتوں میں ان کی مؤثر شمولیت ہوتی۔

۳۔ مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور میں ان کو حق استرداد ہوتا۔

۴۔ وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جس میں ان کی تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۴۲ فی صدی ہوتی اور تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہوتی۔ کیونکہ اسمبلی، پارلیمنٹ، یا کیبنٹ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہ کر سکتی۔

اس فارمولے کو اس پر آشوب دور میں مسلمانوں کی اکثریت نے یا تو سنا ہی نہیں اور اگر سنا تو جذبات میں اس درجہ وارفتہ تھے کہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بہر حال "مضی ما مضٰی" اب اس داستانِ پارینہ سے کیا فائدہ؟ مگر مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے تذکرہ میں اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ تاکہ کل نہیں تو آج اندازہ ہو سکے

کہ مخالفت کرنے والے کہاں تک حق پر تھے۔ اور مجاہد ملت کی سرفروشانہ جان فشانی کس مقصد کے لیے تھی۔

جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا ایک ثبت فارمولا تھا۔ اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان کو اس پر اتنا وثوق اور یقین تھا۔ کہ وہ ہر ایک کے سامنے اس کو پیش کر سکتے تھے چنانچہ وزارتی مشن آیا تو جمعیۃ علماء ہند کے نمائندہ حضرات نے اس کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا۔ بلکہ اس پر مشن کی پسندیدگی بھی حاصل کی۔

مولانا آزاد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں واضح کر دیا ہے کہ ان کا پلیں کردہ فارمولا "وزارتی مشن" نے منظور کر لیا تھا۔

یہی وہ فارمولا ہے جس کو مولانا آزاد نے پیش فرمایا تھا۔ مزید تفصیل چند سطروں کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

وزارتی مشن کی آمد اور جمعیۃ علماء ہند کی نمائندگی

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے۔ کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن کراچی پہنچ گیا۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر وفد کے ارکان تھے۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد یا تازہ حالات کے پورے مطالعہ کے بعد یکم اپریل سے مشن نے ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات شروع کی۔

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی گئی تھی۔ اور چونکہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی اشتراک عمل کیے ہوئے تھیں۔ لہٰذا جناب صدر کو اجازت دی گئی تھی۔ کہ وہ مزید تین افراد کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ چنانچہ عبدالمجید صاحب خواجہ مرحوم (صدر آل انڈیا مسلم مجلس)، شیخ حسام الدین صاحب صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلام، شیخ ظہیر صاحب، صدر آل انڈیا مومن کانفرنس۔ ان تینوں جماعتوں کے سربراہوں کی حیثیت سے اور جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب (مرکزی وزیر برقیات)

ترجمان کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔

اس نمایندہ جماعت کو ایک ایسے صاحب بصیرت سیاسی کھلاڑی کی بھی ضرورت تھی جو نمایندگان پریس کی شوخیوں کا جواب بھی دے سکے۔ اس کی حاضر جوابی دوسری پارٹیوں کے نکتہ چینوں کو خاموش کر سکے۔ پُر مغز و مدلل خطابت ہر ایک دل کو مٹھی میں لے سکے۔ ایسی شخصیت جو ان اوصاف کی حامل ہو، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت تھی لہٰذا آپ کو بھی اس نمایندہ وفد میں شریک کیا گیا۔

۱۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک مشن سے ملاقات ہوئی جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ وزارتی مشن نے اس فارمولے سے یہاں تک دلچسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی (نصف گھنٹہ) سے زائد ۴۵ منٹ فارمولے کے مضمرات اور اس کے مفادات کو سمجھنے سمجھانے پر صرف کر دیے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے جس کو وزارتی مشن نے خاص طور پر پسند کیا تھا۔ اور اسی کی بنیادوں پر اپنا اعلان مرتب کیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس کتاب میں اس فارمولے کو اگر منسوب کیا ہے تو صرف اپنی جانب۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا تھا۔ جو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور (مارچ ۱۹۴۲ء) میں مرتب کیا گیا اور اجلاس سہارنپور (مئی ۱۹۴۵ء) میں اس کی مزید توثیق اور تشریح کی گئی تھی۔

سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اخبار بین طبقہ کو تقریباً ۱۶ سال پہلے کی یہ بات فراموش نہیں ہوئی ہوگی کہ مذکورہ بالا ملاقات سے ایک ماہ بعد ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ انہی لائنوں اور انہیں خطوط پر تھیں جن کی طرف جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا اشارہ کر رہا تھا۔

وزارتی مشن نے پاکستان کی تردید کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان کو ہندوستان کے لیے مضرت رساں قرار دیا تھا۔

ان سفارشات کی بنیاد پر ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے۔ یعنی ۱/۳ سے کچھ زیادہ اور یہ بالیات

کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔

مگر سخت واٹرگوں نے پھر پلٹا کھایا۔ لیگ کی طرف سے ردِ عمل تو لازمی تھا۔ لیکن برطانوی ایجنٹوں کی دورخی پالیسی نے اس کی نوعیت میں خونریزی بھی شامل کردی۔ انتہا یہ کہ تقسیم کا سوال پھر شدت سے سامنے آیا اور اس مرتبہ کانگریس کی غیر معمولی اکثریت بھی تقسیم کی حامی بن گئی۔

سیاست کا یہ دور بھی نہایت پرپیچ تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے متوقع نتائج کسی ایک فیصلے پر متحد کرنے کے بجائے ہر ایک فریق کے لیے متضاد دلائل مہیا کر رہے تھے۔

مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ سردار پٹیل جو اس عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے۔ ان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے اختیارات سے ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ چپراسی کے لیے بھی وزیر مال نواب زادہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے محتاج ہیں (جنہوں نے پارلیمنٹ سے ایک ایسا میزانیہ منظور کرا لیا تھا۔ جس نے ہندوستان کے سرمایہ داروں کو سراسیمہ کر دیا تھا)

اس ایک واقعہ سے قوم پرور مسلمانوں کی یہ دلیل مضبوط ہو رہی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک فیصلہ کن پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں۔ بلکہ ایسی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔ کہ اکثریت ان کی دستِ نگر بن جائے۔

اور اسی ایک واقعہ نے سردار پٹیل جیسے ہندو وازم کے حامیوں کو یہ سبق دیدیا تھا کہ تقسیم ضروری ہے۔ کیونکہ سیاسی اقتدار میں اگر مسلمانوں کی شرکت رہی تو ان کو ہندو وازم کے چمکانے اور من مانی کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی نہیں مل سکے گی۔

فرقہ پرستی کہاں کہاں تھی: کہا جاتا ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی مسلم رہنماؤں کی ذہنیت فرقہ پرست تھی بلکہ سردار پٹیل جیسے قوم پرست نے جس ذہنیت کا ثبوت پیش کیا اس کے لیے بھی فرقہ پرستی کے علاوہ کوئی اور عنوان نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں اگر تبدیلی کی جائے تو سردار پٹیل کی ذہنیت کے لیے "زہریلا سانپ پرداکیتا" کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔

بہر حال سیاست کا یہ وہ نازک موڑ تھا۔ جس کی نظیر شاید ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے۔

انڈین نیشنل کانگریس کو عام طور پہ کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ بے شک وہ ہر لحاظ سے کامیاب رہی کہ انگریز کو ہندوستان بدر کر کے سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اگر کسی بااصول جماعت کی کامیابی کا مدار اصول کی کامیابی پہ رکھا جائے تو صحیح بات یہ ہے کہ کانگریس ناکام رہی، کیونکہ اس کے دونوں اصول یعنی پورے ہندوستان کا اتحاد اور بلا تفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانیوں کی قومیت کا اتحاد، یہ دونوں اصول پاش پاش ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں کانگریس کا عذر یہ تھا:

"حالات نے ہر ایک دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ الجھاؤ کو ختم کر سکتا ہو۔ اس کو تسلیم کر لے، کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کونسا منصوبہ منظور کیا جائے، بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگو اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے۔ یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے۔ کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریہ سے جدا نہیں ہوئی لیکن وہ حق خودارادیت کو بھی تسلیم کر چکی تھی کہ جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں۔ انھیں مجبور کرنے کے خلاف ہے"

یہ دماغوں کی مجبوری کیا تھی، یہ وہی فرقہ واریت تھی جو دونوں پلیٹ فارموں پہ رقص کر رہی تھی۔ جس کا افسوسناک اثر یہ تھا کہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کی اسکیم کا اعلان ہوا۔ اور ۱۶ر جون تک کانگریس اور مسلم لیگ (ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں نے) اس کے حق میں منظوری صادر کر دی[۱]

آپ نے یہاں تک پڑھ کر یہ معلوم کر لیا ہوگا کہ جمعیت علماء ہند کا اپنا الگ فارمولا اور موقف تھا۔ جیسے کانگریس اور مسلم لیگ کے جدا جدا فارمولے

---

[۱] الجمعیۃ دہلی، مجاہد ملت نمبر، ۵ر مارچ ۶۲ء ۱۹ ص ۸ د ۶۱

تھے مسلم لیگ اور جمعیۃ کے فارمولوں کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے کونسا فارمولا بہتر رہے گا اور یہ حضرات اپیلیں کرتے رہے ہیں کہ جمع ہوکر بیٹھیں اور ہر فارمولے کے روشن و تاریک پہلو پہ غور کر کے دو میں سے ایک پہ اتفاق کر لیں اس میں کانگریس کی ہمنوائی کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ بات بہت ہی غلط مشہور کی جا رہی ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ایسی بدگمانیوں سے پرہیز کرنا اور تائب ہونا ضروری ہے۔

علامّہ شبیر احمد عثمانیؒ اور پاکستان

علامہ عثمانیؒ کے ذہن میں پاکستان کا یہ خاکہ تھا کہ پورا آسام پورا بنگال۔ پورا پنجاب اور کشمیر کے کافی حصّہ پہ مشتمل ایک مضبوط مملکت ہوگی۔ جہاں اسلامی نظام نافذ ہوگا۔ ان کے خیال کے مطابق پاکستان ہندوستان کا نقشہ یہ ہوگا۔

لیکن پاکستان جب معرض وجود میں آیا تو وہ علاّمہ عثمانیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے تصوّر کردہ خاکہ سے بہت چھوٹا بنا۔ تقریباً پورا آسام، نصف بنگال ہندوستان میں رہ گیا پنجاب پورا ہوتا تو دہلی پاکستان میں ہوتی کیونکہ دہلی جمنا پار نہیں ہے۔ دہلی سے آگے دریائے جمنا ہے اور بنگال پورا ہوتا تو ٹاٹا کے کارخانے اور کلکتہ کا عظیم شہر اور بندرگاہ پاکستان میں ہوتیں یہ علاّمہ عثمانیؒ کا خیال تھا جو پورا نہ ہو سکا ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ علامہ عثمانی اور حضرت مدنی کے مناظرہ کا قصہ فرضی ہے۔ جب یہ قصہ وضع ہوا تو حضرت مدنی نے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ جس کا نام "کشف حقیقت" ہے۔ اس کے کچھ حوالے ابھی آپ نے پڑھے ہیں۔

۴۔ سیٹھی صاحب نے سوال کیا ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ کا ذریعہ معاش کیا تھا۔ بھائی وہ دارالعلوم دیوبند کے مدرس تھے۔ تنخواہ لیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں تنخواہ اور اس کے لینے میں احتیاط کہ اگر وہ غیر حاضر ہوتے تھے تو اپنی تنخواہ میں سے غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ خود دفتر محاسبی دارالعلوم کو واپس کر دیتے

تھے۔ یہ سب کچھ آپ کو دارالعلوم میں مل جائے گا۔ وہاں خط لکھ کر دریافت کر لیں۔

ایک مسلمان جو قرآن پاک پڑھتا ہو۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ رزق رسانی خدا کا کام ہے۔ بارھواں پارہ اسی آیت سے شروع ہوا ہے۔ ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقہا۔ اور اٹھائیسویں پارہ میں خدا کا وعدہ ہے۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہٗ:۔ جو خدا پر بھروسہ کرے خدا اس کے لیے کافی ہے۔ پھر ایسا سوال اٹھانا ایک کامل مسلمان سے تو بعید ہے۔

تقسیم ہند کے بعد:

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ تقسیم ہند کے بعد ان حضرات نے مشرقی پنجاب میں لاکھوں مسلمان برآمد کیے جو وہیں رہ گئے تھے۔ انھوں نے بظاہر ترکِ اسلام کر کے ہندوانہ وضع اختیار کر لی تھی۔ ان کو سہارا دیا، حوصلے بلند کیے۔ ان کے لیے شبینہ مدارس قائم کیے۔ اسی طرح وہاں جابجا تبلیغی جماعت پہنچی اور یہ کام سر ہتھیلی پہ رکھ کر انجام دیا۔ جزاھم اللہ خیرا لجزاء

حضرت مدنی نے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہما کو بھی اس زمانہ میں اپنے وطن سرگودھا آنے سے روکے رکھا۔ حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی یو، پی پنجاب سرحد پہ واقع شہر سہارنپور ہی میں قیام فرما رہے یہ حضرات پورے مسلمانان ہند کو آباد رکھنے کا ذریعہ بنے جو بلا شبہ بڑا جہاد ہے۔ دنیائے اسلام کے نامور عالم مولانا السید ابوالحسن علی ندوی نے ان ہی کارناموں پہ روشنی ڈالتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے۔ میں ان کی اس تحریر پہ مضمون ختم کرتا ہوں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ایک بہت بڑا کارنامہ:

مولانا کا ایک بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمان کی بقا و قیام کا ایک بڑا ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ بڑے بڑے کوہ استقامت جنبش میں آ گئے سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان مسلمانوں کا کوئی مستقبل

نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں دو ہی چار دور ایسے گزرے ہیں جب مسلمان اور اسلام کی بقا کا سوال آ گیا۔ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان میں کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا۔ اصل مسئلہ سہارنپور کے مسلمانوں کا تھا اور سارا دارومداران پر تھا۔ یہ اپنی جگہ چھوڑتے تو یو پی کے مسلمانوں کے قدم لغزش میں آ جاتے۔ بہارنپور کے مسلمانوں کا انحصار سارا کا سارا دو ہستیوں، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری اور حضرت مولانا مدنی پر تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ جمنا کے کنارے ہو ناتھا۔ لیکن یہ دو صاحب عزم مجاہد بندے وہاں جمے رہے۔ ایک رائے پور کی نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور ایک دیوبند میں۔ آپ کو معلوم ہو گا یہ رائے پور اور دیوبند مشرقی پنجاب کے ان اضلاع سے متصل ہیں۔ جہاں کشت و خون کا ہنگامہ گرم تھا۔ لیکن یہ اللہ کے بندے پورے عزم و استقلال کے ساتھ جمے رہے اور انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اسلام کو یہاں رہنا ہے اور رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہاں سے نکلنا صحیح نہیں اگر تم مشورہ چاہتے ہو تو ہم مشورہ دیتے ہیں۔ اگر فتوے کی ضرورت ہو تو ہم فتوے دینے کو تیار ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں جو مسجدیں قائم ہیں۔ اور ان میں جو نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اور پڑھی جاتی رہیں گی یہ ان کا طفیل ہے۔ ہندوستان میں جتنے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں اور جو فیوض و برکات ان سے صادر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ انہی کے مرہون منت ہوں گے اور ان سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا ہے گا۔

اس سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنی رحمہ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا ایمان آفریں اور ولولہ انگیز تقریریں بھی کیں اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ اپنی تقریروں اور خود اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے اور اپنے ملک کو اپنا سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔[1]

---

[1] شیخ الاسلام کے حیرت انگیز واقعات۔ مرتبہ ابوالحسن بارہ بنکوی، ناشر مکتبہ رشیدیہ کراچی ص ۲۲۲

جمعیۃ علماء ہند کے دو فارمولے

(۱) سہارنپور کا فارمولا ۱۹۳۱ عیسوی

مندرجہ ذیل تجاویز اجلاس مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند منعقدہ ۳؍اگست ۳۱ء میں بمقام سہارنپور منظور کی گئی ہیں۔ چونکہ جمعیۃ علماء کیا ہے ۱ میں ایک مقام پر اس کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی شامل ضمیمہ کردیا جائے۔

محمد میاں عفی عنہ

چونکہ ہندوستان کی مختلف ملتوں نے اس نازک ترین موقعہ پر اس وقت تک کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کیا تھا جس کو کانگریس ہندوستان کے متحدہ فیصلہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں پیش کرسکتی۔ اسلئے کانگریس کی مجلس عاملہ نے وقت کی انتہائی نزاکت کے لحاظ سے مختلف ملتوں کے غور و فکر کے لئے ایک فارمولا پیش کیا ہے اور اس کی تصریح کردی ہے کہ یہ آخری فیصلہ نہیں ہے۔ بلکہ اگر اس سے بہتر کوئی اسکیم مختلف ملتوں کے اطمینان کے ساتھ کانگریس کے سامنے آئے تو اسے کانگریس بخوشی منظور کرلے گی۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت خود اختیاری کے دستور اساسی کی بنیاد آزادی کے ایسے اصول پر ہونی چاہئے جس میں تمام ملتوں کے جائز حقوق اور مفاد محفوظ ہو جائیں۔ اور اقلیتوں کو اکثریتوں کی جانب سے کسی

لہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے جو اس وقت جمعیۃ علماء ہند کے ناظم تھے۔ اس فارمولا کو انگریزی اور اردو میں طبع کراکر ہندوستان کی تمام جماعتوں اور سربرآوردہ حضرات کے پاس بھیجا۔ محمد میاں عفی عنہ

قسم کا خوف و خطرہ نہ رہے اور ہندوستان کے لئے ترقی اور خوش حالی اور امن و اطمینان کا راستہ کھل جائے۔ نیز اس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ موجودہ حالت میں قومیت کے اعلیٰ تخیل پر دستور کی بنیاد رکھنی ناممکن ہے۔ جیسا کہ کانگریس نے ابھی اسے تسلیم کیا ہے۔ تاہم قومیت متحدہ کے لئے جہاں تک ممکن ہو راستہ صاف کیا جائے۔

مجلس عاملہ نے کانگریس کے فارمولا پر غور کیا۔ مجلس عاملہ کی رائے میں کانگریس فارمولا کی دفعہ ۱ کا ضمن (ج) اور دفعہ ۲ کے ماتحت نوٹ کی عبارت کا ابہام اور دفعہ ۳ کا ضمن (ب) اور ۴ کی محتمل المعنیین عبارت اور دفعہ ۷ لفظ بشرطیکہ سے آخر تک اور دفعہ ۸ اول سے آخر تک موجودہ صورت میں ناقابل قبول ہے۔

اس جلسہ کی رائے میں مسلمانوں کے اطمینان اور تمام ملتوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے حسب ذیل فارمولا کی منظوری ضروری ہے۔

یہ فارمولا دستور اساسی میں بنیادی دفعات کے طور پر درج کیا جائے گا اور دستور اساسی کا لازمی جزو ہوگا۔

فارمولا

(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر۔ زبان۔ رسم الخط۔ پیشہ۔ مذہبی تعلیم۔ مذہبی تبلیغ۔ مذہبی آزادی۔ مذہبی عقائد۔ مذہبی اعمال۔ عبادت گاہیں۔ اوقاف آزاد ہونگے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لاء کی حفاظت کے لئے خاص دفعہ رکھی جائیگی جس میں تصریح ہوگی کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائیگی اور پرسنل لاء کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائینگی (مثلاً) احکام نکاح۔ طلاق۔ رجعت۔ عدت۔ خیار بلوغ۔ تفریق زوجین۔ خلع عنین و مفقود۔ نفقہ زوجیت۔ حضانت۔ ولایت نکاح و مال۔ وصیت۔ وقف۔ وراثت۔ تکفین۔ تدفین۔ قربانی وغیرہ

(۳) مسلمانوں کیلئے ایسے مقدمات فیصل کرنے کیلئے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کئے جائیں گے۔

(۴) صوبوں اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کی حفاظت کے متعلق شکایات سننے اور فیصلہ کرنے کیلئے سپریم کورٹ قائم کیا جائیگا جو مختلف ملتوں کے ارکان پر مشتمل ہوگا۔ اسکے فیصلوں کی تنفیذ فیڈرل حکومت کرے گی۔

(۵) صوبہ سرحد اور بلوچستان اور ان صوبوں میں جو نئے قائم کئے جائیں طرز حکومت وہی ہوگا جو دیگر صوبوں میں قرار دیا جائے گا۔

(۶) سندھ کو علیحدہ مستقل صوبہ بنا دیا جائیگا اور اس کا نظم اس طرح قائم کیا جائیگا کہ اس کی آمدنی اس کے مصارف کو کافی ہو جائے۔

(۷) حق رائے دہی تمام بالغوں کو دیا جائیگا اور کسی صورت میں کوئی ایسا طریقہ قبول نہ کیا جائیگا جس سے کوئی ملت اپنے تناسب آبادی کے مطابق برائے دہندگی کے حق سے محروم رہ جائے۔

(۸) طریقہ انتخاب مخلوط ہوگا۔

(۹) پنجاب اور بنگال میں کسی ملت کیلئے ریزرویشن[1] (تحفظ) نہیں کیا جائیگا۔ اور اگر کوئی اقلیت ریزرویشن کے لئے اصرار کرے تو تمام ملتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے اعتبار سے ریزرو کر دی جائیں گی۔ باقی صوبوں کی انتخابی مجالس اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے مطابق ریزرو کر دی جائینگی۔ اور مزید نشستوں کے لئے مقابلہ کرنے کا حق بھی حاصل ہوگا۔

(۱۰) طرز حکومت وفاقی ہوگا۔ تمام صوبے کامل خود مختار ہونگے۔ فیڈرل اسمبلی کو صرف وہی اختیارات دیئے جائیں گے جن کا تعلق تمام ہندوستان کے ساتھ یکساں ہوگا۔ غیر مفوضہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہونگے۔ الا یہ کہ تمام صوبے بالاتفاق فیصلہ کریں کہ غیر مفوضہ اختیارات

---

[1] یعنی نشستوں کا تعین۔

نیابت نسبی کو دیئے جائیں۔

(۱۱) ملازمتوں پر تقرر ایک غیر جانبدار پبلک سروسز کمیشن کی طرف سے کیا جائیگا جو لیاقت کا کم از کم معیار مقرر کر کے اس امر کا لحاظ رکھیگا کہ اس معیار کے ماتحت ہر ملت اپنے تناسب آبادی کے موافق حصہ پانے سے محروم نہ رہے۔ نیز ماتحت ملازمتوں میں بھی کسی خاص فرقہ کی اجارہ داری نہ ہو گی۔ تمام فرقوں کو ان کا واجبی حصہ ملے گا۔

(۱۲) وفاقی اور صوبجاتی حکومتوں کی وزارتوں میں اقلیتوں کی نمائندگی باہمی تدابیر کے ذریعہ قائم کر دی جائے گی۔

(۱۳) دستور اساسی کی بنیادی دفعات میں کوئی تغیر، ترمیم، اضافہ اس وقت تک نہ ہو سکے گا جبتک تمام وفاقی اجزاء اسے منظور نہ کریں۔

(۱۴) یہ تمام دفعات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک دفعہ بھی منظور نہ ہوئی تو تمام فارمولا کالعدم ہو جائے گا۔

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا فارمولا (۱۹۴۵ء)

جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس بصدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ صدر جمعیۃ علماء ہند ۳۱ جنوری۔ یکم۔ ۲ فروری ۱۹۴۵ء کو دفتر جمعیۃ علماء ہند میں منعقد ہوا۔ مجلس عاملہ نے تین دن کی بحث و تمحیص کے بعد ہندوستان کے موجودہ جمود و تعطل کو دور کرنے اور مسلمانان ہند کے آئینی درجہ کو واضح کرنے کیلئے حسب ذیل فیصلہ کیا ہے:۔

جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس اس جمود و تعطل کی حالت کو ملک و قوم کیلئے نہایت مضر اور اس کی حیات و ترقی کیلئے مہلک سمجھتا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کی تمام متعدد جماعتیں اور عام پبلک حصول آزادی کیلئے بے چین و مضطرب ہے اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اور تمام افراد مختلف خیالات اور فارمولے تجویز کر رہے ہیں اور شائع کر رہے ہیں۔ مجلس عاملہ اپنی رائے اجلاس لاہور منعقدہ وقت کی تجویز نمبر ۲ میں ظاہر کر چکی ہے۔ آج پھر اسکی تجدید کرتی ہے اور اسکے آخری حصہ کی

رفع اجمال کی غرض سے قدرے توضیح کردینی مناسب سمجھتی ہے۔ یہ بات بدیہی اور مسلمات بین سے ہے کہ ہندوستان آزادی کی نعمت سے اس وقت تک متمتع نہیں ہو سکتا۔ جبتک ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ اور متحدہ محاذ قائم نہ کیا جائے اور ہندوستانی کسی متفقہ مطالبہ کی تشکیل اور متحدہ محاذ قائم کرنے میں جتنی دیر لگائینگے اسی قدر غلامی کی مدت طویل ہوتی جائیگی۔ جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک تمام ہندوستانیوں کیلئے عموماً اور مسلمانوں کیلئے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ حسب ذیل نکات پر اتفاق کرلیں اور اسی بنیاد پر حکومت برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کردیں۔

(الف) ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہونگے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کرینگے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہونگے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملینگے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالہ کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کیلئے بھی گوارا نہ ہوگی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

تشریح:- اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیۃ علماء مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں وہ بیشک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور مرکز پسند کرتی ہے۔ کیونکہ اسکے خیال میں مجموعہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کیلئے یہ مفید ہے مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کیلئے

حق خود ارادیت تسلیم کرلیا جائے اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی/سیاسی/تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے باہمی افہام وتفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم وغیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے ممکن ہے۔

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵، مسلم ۴۵۔ دیگر اقلیتیں ۱۰

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ⅔ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت پر مخالفانہ اثرانداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکیگی۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم وغیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم وغیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کریگا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی ⅔ اکثریت کے فیصلہ سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائیگا

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔

(نوٹ) تشریح کے ماسوا باقی فارمولہ اجلاس لاہور ۱۹۴۲ء میں منظور ہو گیا تھا مجلس عاملہ منعقدہ ۳۱ جنوری یکم و ۲ فروری ۱۹۴۵ء کے اجلاس میں تشریح کا اضافہ کیا پھر جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس عام منعقدہ ۴، ۵، ۶، ۷ مئی ۱۹۴۵ء میں یہ فارمولا دوبارہ پیش کیا گیا تاکہ اجلاس لاہور کے فارمولے کی تشریح جو مجلس عاملہ نے ۳۱ جنوری اور یکم فروری ۱۹۴۵ء کے اجلاس میں کی تھی اسکے متعلق اجلاس عام کی رائے حاصل کی جائے۔ چنانچہ بہت کافی بحث وتمحیص کے بعد (جس میں تقریباً ڈیڑھ دن صرف ہو گیا۔ جسکے باعث اجلاس کو مزید ایک دن کی وسعت دینی پڑی۔) یہ فارمولا منظور ہو گیا۔

محمد میاں عفی عنہ ناظم جمعیۃ علماء ہند

بابِ چہارم

اب انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لیکر

مسئلہ قومیت، اقبال و سلیمان

" ڈاکٹر (اقبال) صاحب کے پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں

" اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر اس ملک کی کوئی مشترک سیاسی یا وطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نقطہ میں بھی یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں۔ اقبال کا ہندی ترانہ جب تک موجود ہے، ان کے وطنی جذبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں جنھوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں، وہ ڈاکٹر اقبال ہی ہیں جنھوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے:

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انہی کا بخشا ہوا ہے:

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

(علامہ سید سلیمان ندوی۔ اخبار مدینہ۔ بجنور، ۱۳۔ اپریل ۱۹۳۸ء)

شیخ الاسلام مولانا مدنی:
روحانی مقام پر ایک نظر،

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

یہ بات مسلمانوں کی قومی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ میری یہ تنقید تلخ تو ہے مگر غلط نہیں ہے۔ جن لوگوں نے سلاطین وقت سے اختلاف کیا تو انہوں نے طاقت کے نشے میں مست ہو کر یا قتل کر دیا یا محبوس کر دیا اور جن افراد نے علماء سے اختلاف کیا انہوں نے اپنے مخالفین کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

۱۔ امام احمد بن حنبلؒ متوفی سنہ ۲۴۱ھ نے مسئلہ خلق قرآن میں مامون سے اختلاف کیا تو اس ظالم بادشاہ نے ان کو بے دریغ اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

۲۔ حارث المحاسبیؒ نے امام ابن حنبلؒ سے اختلاف کیا (علم کلام کی تعلیم کو جائز قرار دیا) تو امام صاحب نے انہیں فاسق اور گمراہ قرار دے دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سنہ ۲۴۳ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے جنازے کے ساتھ ایک آدمی بھی قبرستان تک نہیں گیا۔

۳۔ القادر باللہ عباسی حکمران متوفی سنہ ۴۲۲ھ کے عہد حکومت میں معتزلہ مورد عتاب رہے۔

۴۔ سنہ ۴۵۰ھ میں اشاعرہ پر حکومت کی طرف سے مصائب کا نزول ہوا۔ ابن حزم ظاہری متوفی سنہ ۴۵۶ھ نے انہیں گمراہ قرار دیا۔

۵۔ شیخ شہاب الدین سہروردی صاحب "حکمت الاشراق" کو محض اختلاف رائے کی بنا پر علما نے واجب القتل قرار دیا۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے حکم سے مجبور ہو کر سلطان کے فرزند ملک الظاہر نے سنہ ۵۸۷ھ میں انہیں قتل کر دیا۔ چنانچہ تاریخ میں ان کا لقب

شیخ مقتول ہے۔

۶۔ امام ابن رشد متوفی ۵۹۵ھ پر کفر کا فتویٰ عاید کیا گیا۔

۷۔ امام ابن تیمیہ نے شیخ اکبرؒ متوفی ۶۳۸ھ کو کافر قرار دیا۔

۸۔ امام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کو علما نے کافر قرار دیا اور انھوں نے قید خانے میں وفات پائی۔

۹۔ شیخ علائی کو علما نے کافر قرار دیا اور اُن کے ایما سے سلیم شاہ سوری نے اس بے گناہ کو بڑی اذیت دے کر قتل کرا دیا، یہ واقعہ غالباً ۹۵۵ھ یا ۹۵۶ھ میں رونما ہوا۔

۱۰۔ محمد ابن عبدالوہاب نجدی متوفی ۱۲۰۱ھ نے اپنے مخالفوں کو کافر قرار دیا۔ اس کے جواب میں ترکی شام اور ہندوستان کے علماء نے ان کو اسی لقب سے نوازا (بعض کے نزدیک لفظ وہابی لفظ کافر سے بھی بدتر ہے)

۱۱۔ ہمارے زمانے میں بریلی کے ایک بزرگ[1] نے بیک جنبش قلم تمام علماء دیوبند کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا کیونکہ یہ حضرات مشرکانہ عقائد اور مبتدعانہ اعمال میں خاں صاحب سے متفق نہیں تھے۔

۱۲۔ ان مثالوں میں ایک مثال کا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ نے بادشاہِ وقت سے اختلاف کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے قید خانے میں وفات پائی۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری سے لے کر عصر حاضر تک کسی زمانے میں بھی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا۔ یہ متعصبانہ روش اور یہ تنگ نظری صرف عقاید تک محدود رہتی تو بھی ایک بات تھی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ ہماری سیاست کی دنیا میں بھی داخل ہو گئی۔ جن لوگوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کا پرآشوب دور دیکھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حامیانِ مسلم لیگ اُن تمام مسلمانوں کے اسلام کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو ان سے دلائل واضحہ اور براہین نیرہ کی بنا پر اختلاف کرتے تھے۔ نیز بلا استثنا ان تمام مسلمانوں کو غدارِ قوم، ضمیر فروش اور ہندوؤں کے زر خرید کہا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی رعب ہوش رخصت ہو جاتا ہے اور

---

[1] ان کی وفات ۱۹۲۱ء ۱۳۴۰ھ میں ہوئی۔

صرف جوش کارفرما ہوتا ہے تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے) کہ مسلم لیگ کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیا گیا تھا۔ چنانچہ ہر شخص ببانگ دہل یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"، حالانکہ کفر و اسلام کا معیار کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں ہے۔ بلکہ اتباع شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے اور طرفہ تماشہ یہ ہے جس پر آج میری عقل بھی حیران ہے کہ مسلم لیگ۔ تو وہ جماعت تھی جس میں داخلے کے لیے نہ مسلمانوں کی سی صورت شرط تھی نہ ان کی سی سیرت۔ نہ نماز روزے کی پابندی کی شرط تھی نہ دین سے واقفیت۔ اہل قرآن اور اہل حدیث، اہل فقہ اور اہل تصوف، بریلوی اور دیوبندی، سنّی اور شیعہ[1]، احمدی اور کمیونسٹ سب اس کے رکن بن سکتے تھے اور ۱۹۴۷ء میں اس کا صدر وہ شخص[2] تھا جس کے ہم خیالوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے ۱۹۵۳ء میں کراچی سے لاہور تک ندبر دست ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم دین کیوں نہ ہو یہ تصور کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ ہندوؤں کا غلام ہے، ضمیر فروش ہے، غدار قوم ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، خواص کے دماغوں پر بھی مسلط ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہی مولانا ظفر علی خاں جنہوں نے حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا ۔

گرمی ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے
جس سے ہے پرچم روایاتِ سلف کا سربلند

جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہو گیا کہ انہوں نے اسی حسین احمد سے یوں خطاب کیا اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ میں کس عظیم المرتبت ہستی کو مخاطب بنا رہا ہوں :۔

حسین احمد سے کہتے ہیں مدینے کے خزف ریزے
کہ لٹو ہو گئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پہ

اس شعر سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے شیخ الاسلام مجاہد اعظم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز کا علمی اخلاقی اور روحانی

---

[1] یہ شمول اسمٰعیلی آغا خانی [2] اشارہ ظفر اللہ خاں (قادیانی) کی طرف ہے۔

مقامِ خانِ مرحوم کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے لیگ سے اختلاف کیا تھا خصوصاً ارکان جمعیۃ العلماءِ ہند ان کی نیت نیک تھی۔ وہ ہرگز ضمیر فروش یا غدارِ قوم یا ہندوؤں کے زرخرید نہیں تھے۔ چنانچہ (سابق صدر) صدر مملکت پاکستان (محمد ایوب خان) نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "FRIENDS NOT MASTERS" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں: "سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سے علماء نے قائد اعظم سے علی الاعلان اختلاف کیا تھا اور پاکستان کے تصور کی تردید کی تھی۔ لیکن میرے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن علماء نے تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ سب ضمیر فروش تھے۔ ان میں قابل اور مخلص لوگ بھی تھے۔ ہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی تشکیل سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔"[1]

فی الجملہ حقیقت یہی ہے کہ جمعیۃ العلماء کے ارکان نہ قوم کے بدخواہ تھے نہ ضمیر فروش، بلکہ وہ علیٰ وجہِ البصیرت یہ سمجھتے تھے کہ نہ تو تقسیم ہند سے ہندی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا کیونکہ ان کی بڑی آبادی ہندوستان میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی اور وہ انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں گے اور نہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو سکے گی کیونکہ لیگ کے ارباب حل و عقد کی غالب اکثریت نہ دین سے واقف ہے اور نہ اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ لیکن حامیانِ لیگ نے مخالفت کے جوش میں اسلامی تہذیب اور علمائے دین کے احترام دونوں باتوں کو طاق پر رکھ دیا اور اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھی بلکہ اس پر فخر کیا۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں:

۱۔ جب وہ ٹرین جس میں لیگ کے مخالف مسلمان قائدین سفر کر رہے تھے علی گڑھ پہنچی تو یونیورسٹی کے مسلمان طلباء نے ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی

---

[1] اس خیال سے مجھے کلیتہً اتفاق نہیں (سلیم چشتی)

ناز یبا اور خلاف تہذیب حرکات کیں جن کی وضاحت بذات خود خلاف تہذیب ہے اور اگر وضاحت بھی کی جائے تو کوئی شخص یقین نہیں کرے گا کہ کوئی شریف آدمی ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

۲۔ جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سید پور ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو حامیان لیگ کا ایک انبوہِ کثیر پلیٹ فارم پر جمع ہو گیا۔ ان لوگوں نے حضرت اقدس کو گالیاں دیں اور جب حضرت موصوف پلیٹ فارم پر اترے تو مخالفین نے حضرتؒ کو زمین پر گرانے کی کوشش کی اور گریبان پھاڑ دیا اور ایک شخص نے عمامہ سر سے اتار لیا اور پہلے اسے پاؤں سے روندا پھر نذرِ آتش کر دیا (حیات شیخ الاسلام صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۳)

میں نے دل پر جبر کر کے صرف دو واقعات درج کر دیے ہیں۔ تفصیل سے عمداً اجتناب کیا ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اُس زمانہ میں حامیانِ لیگ کی ذہنیت ایسی ہو گئی تھی کہ جو شخص اُن سے سیاسی اعتبار سے اختلاف کرتا تھا اس کے ساتھ ہر بدسلوکی اور بے ادبی روا رکھی جاتی تھی بلکہ اُسے کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔

آج جب بیس سال کے بعد ایک طرف ہمارے جوش اور ہیجان میں سکون کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور دوسری طرف زندگی کے تلخ تر حقائق نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں تو ہم پرانے مسلم لیگی ان لوگوں کو رواداری کا اپدیش دے رہے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے نامور صحافی میم شین نے (جسے میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں) اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت مورخہ ۱۴/ نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا، مسلمانانِ پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا:

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم صیہونیت کے پروپیگنڈے کے زیر اثر انہیں (جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ مصر) فرعون کی نسل کا علمبردار اور بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا نقاد بنا کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ صدر ناصر عقائد کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیے۔"

سبحان اللہ! آج اس درسِ اخوت کی صداقت میں کس پاکستانی کو شک ہو سکتا ہے لیکن میں بڑے بھائی کی حیثیت[1] سے، اپنے پیارے تمیم شین سے پوچھتا ہوں کہ جب قوم پرور مسلمان (کانگرسی، جمعیتی اور احراری)، نہ عملئے مسلم لیگ کی خدمت میں یہی حقیقت ثابتہ (یہی درسِ اخوت و انسانیت) بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے کہ

"یہ سچ ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کے ارکان تقسیم ہند کے حامی نہیں ہیں کیوں کہ وہ اس کو اپنی فراست مومنانہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے بہت مضر سمجھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم لیگ کے پروپیگنڈا کے زیر اثر انھیں ہندوؤں کا حاشیہ بردار اور کفر کا علمبردار اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا حامی بنا کر اپنے (مسلمان) لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور اُن کے ہم خیال حضرات عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمان ہی رہنے دینا چاہیے"۔

تو کون سا مسلم لیگی ان کی اس معقول بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتا تھا؟ یا ہو سکتا

---

[1] میں نے اپنی اس حیثیت کو بطور سپر استعمال کیا ہے کیونکہ اس ملک میں یہ خیال روز بروز پختہ تر ہوتا جا رہا ہے کہ ہم کو کامل آزادی ـــ ہر بات کی آزادی ـــ حاصل ہو چکی ہے، اس لیے کسی شخص کو ہمیں نصیحت کرنے کا حق نہیں ہے۔ چنانچہ آج فجر کی نماز کے علاوہ ہر نماز کے وقت مسلمان پوری آواز کے ساتھ مسجد سے ملحق ہر ہوٹل میں فلمی گانوں کے ریکارڈ بجاتا رہتا ہے اور کراچی شریف سے لے کر لاہور شریف تک کسی مسلمان میں یہ جرأت نہیں ہے کہ اس مسلمان سے یہ کہہ سکے کہ اس شور و غل سے نمازیوں کی نماز میں اور مریضوں کے آرام میں خلل پڑ رہا ہے۔ اس عاجز نے اس مسئلے پر بہت غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں ہندو، مسجد کے پاس باجا بجاتے ہوئے گزر جاتے تھے تو مسلمانوں کی نماز میں شدید خلل رونما ہو جاتا تھا لیکن پاکستان میں ۲۴ گھنٹے مسجدوں کے پہلو میں فلمی گانے سمع خراشی کرتے رہتے ہیں۔ مگر کسی کی نماز میں خلل نہیں پڑتا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ باجہ مشرف با سلام ہو گیا ہے۔ بینوا و توجروا

تھا؛ اس زمانے میں تو سیاسی اعتبار سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کا یہ عالم تھا کہ جب الجمعیۃ نے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پہ طلبہ کی گستاخی اور بدتہذیبی پہ صدائے احتجاج بلند کی تو ڈان نے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھا تھا۔

"گل دستوں کے بجائے ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے۔"

میرا مطلب اس تلخ نوائی سے صرف اس قدر ہے کہ اُس زمانے میں ذہنیت ہی اس قسم کی ہوگئی تھی کہ ہم نے حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور یہ راقم سیہ کار بھی اسی کشتی میں سوار اور اسی غلطی کا شکار تھا یعنی میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو علماء لیگ میں نہیں تھے ان کی عظمت و قعت، عزت اور منزلت میرے دل سے بالکل نکل گئی تھی حالانکہ اب بیس سال کے بعد جب اس حماقت پہ غور کرتا ہوں تو عرقِ ندامت میں غرق ہو ہو جاتا ہوں مثلاً[1] صرف ایک واقعہ ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

اپریل ۱۹۴۱ء میں مجھے انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ ضلع سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں تقریر کی دعوت موصول ہوئی چونکہ یہ انجمن غیر سیاسی تھی اس کے جلسوں میں لیگی اور غیر لیگی ہر مکتبِ خیال کے مقررین مدعو کیے جاتے تھے چنانچہ دیوبند سے حضرت اقدسؒ اور شجاع آباد سے قاضی احسان احمد مرحوم بھی تشریف لائے تھے۔

اس زمانے میں ذہنی کیفیت یہ تھی کہ میں غیر سیاسی جلسوں میں بھی ایسا موضوع اختیار کیا کرتا تھا جس کی تان بالآخر سیاست پہ ٹوٹ سکے تاکہ میں لیگ کا پروپیگنڈا کر سکوں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی کیا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد میرے دوست قاضی احسان احمد مرحوم میرے کمرے میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ

"حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی جو آپ کی تقریر کے وقت اسٹیج پہ

---

[1] مثلاً انجمن مدرسۃ البنات جالندھر ایک غیر سیاسی انجمن تھی مگر میں نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک ہر سال اس انجمن کے پلیٹ فارم سے لیگ ہی کا پروپیگنڈا کیا، جس کی یاد اس زمانے کے سامعین کے دلوں سے ابھی تک محو نہیں ہوتی ہے۔

تشریف فرما تھے، آپ سے ملنا چاہتے ہیں. نیز یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ میرے پاس چل کر آنا پسند نہ کریں تو میں خود آپ سے ملنے آ سکتا ہوں۔"

یہ سنتا تھا کہ میں نے قاضی صاحب سے بلا تامل کہا کہ میرے اور مولانا کے سیاسی عقائد و افکار میں بُعد المشرقین ہے اس لیے اس ملاقات سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوگا. میرے محترم قاضی صاحب مرحوم یہ غیر متوقع جواب بے صواب سن کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے.

آج ستائیس سال کے بعد میں اس تلخ حقیقت کا اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ جس بات نے مجھے اس جواب پر آمادہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ علامہ اقبال مرحوم کا اعلان مندرجہ اخبار احسان مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء تو میرے دماغ سے محو ہو گیا تھا یہ مصرع ہنوز ذہن نشین تھا کہ

"ز چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است"

اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ حضرت اقدسؒ سے گفتگو یا ملاقات جیسی دونوں باتوں کو میں اپنے زعمِ باطل میں اپنے مرتبہ موہومہ سے فروتر سمجھتا تھا.

میں نے یہ وضاحت اس لیے کی ہے کہ پاکستان میں جن لوگوں سے حضرت اقدسؒ کا علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی مقام ابھی تک پوشیدہ ہے وہ سب اسی طرح شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس طرح میں اس زمانے میں مبتلا تھا. چونکہ اللہ کے فضل و کرم سے مجھ پر حضرت اقدس کا روحانی مقام منکشف ہو چکا ہے اس لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس زمانے کے مسلمانوں کو یاد دلاؤں کہ علامہ مرحوم نے اُن اشعار کو، جن کی وجہ سے حضرت اقدس کے روحانی مقام کے بارے میں مسلمانوں کو غلط فہمی ہوئی، کالعدم قرار دے دیا تھا. اگر ارمغان حجاز ان کی زندگی میں شائع ہوتی تو وہ یہ اشعار یقیناً حذف کر دیتے. اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی.

باز آمدم بر سر مطلب. دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا کہ قاضی صاحب مرحوم دوبارہ میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ حضرت اقدس فرماتے ہیں کہ

گفتگو سے میرا مقصد اسی بعد المشرقین کو دور کرنا ہے۔ آپ نے گذشتہ شب اپنی تقریر میں بڑے یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ پاکستان میں شرعی احکام کا نفاذ ہوگا، لیکن آپ نے اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں دی۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس دعوے پہ آپ کے پاس دلیل کیا ہے؟ قاضی صاحب مرحوم کی زبان سے حضرت اقدس کا یہ پیغام صداقت انجام سن کر میں مبہوت و ششدر ہو کر رہ گیا کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس اپنے دعوے پر کوئی دلیل معقول یا غیر معقول نہیں تھی میری حالت ۱۹۴۶ء سے ۱۹۳۶ء تک یہ رہی کہ میں خداوندان لیگ پہ ایمان بالغیب، رکھتا تھا جو اعلانات اور دعاوی وہ لوگ اپنی تقریروں اور اپنے بیانات میں قوم کے سامنے بلکہ دنیا کے سامنے کرتے رہتے تھے میں ان پہ آنکھ بند کر کے ایمان لے آتا تھا اور انہی دعاوی کو اقبال کے کلام بلاغت نظام سے مزین کر کے اور کانگرس پر طنز و مزاح سے چٹ پٹا کر کے اپنی تقریروں میں بیان کر دیا کرتا تھا اور جب کبھی میرا ذہن مجھ سے یہ کہتا تھا کہ جو کچھ تو کہتا ہے اس پہ تیرے پاس دلیل کیا ہے تو میں اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کرتا تھا کہ بھلا لیگ ہائی کمان کے سربرآوردہ ارکان جو قدوۃ القوم ہی نہیں بلکہ زبدۃ القوم بھی ہیں، جھوٹ بول سکتے ہیں یا اپنی بھولی بھالی اور نوتے فیصد جاہل قوم کو دھوکا دے سکتے ہیں؟ چونکہ یہ امر ممکن الوقوع نہیں اس لیے منطقی اعتبار سے اس کا عکس صحیح ہوگا یعنی یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ برہان نہیں ہے بلکہ سفسطہ اور مغالطہ ہے جو میں اس زمانے میں اپنے نفس کو دیا کرتا تھا لیکن جماعتی تعصب انسان کو ایسا اندھا کر دیتا ہے کہ وہ حسن اور قبح میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ سفسطہ کو برہان اور مغالطے کو دلیل سمجھنے لگتا ہے۔

چنانچہ میں نے یہ غیر معقول بات کہہ کر قاضی صاحب مرحوم سے اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ جس طرح انہیں (حضرت اقدس کو) یہ یقین ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہرگز قائم نہیں ہوگی اسی طرح مجھے یہ یقین ہے کہ ضرور قائم ہوگی۔ اس لیے

گفتگو بے کار ہے اور ملاقات بے سود[1]۔

جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں میں حضرت اقدسؒ کی طرف سے بدگمان تھا یعنی نفس امارہ کے پھندے میں گرفتار تھا اسی لیے میں نے حضرت اقدسؒ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا اب جبکہ حضرت اقدسؒ کی جلالت شان، للّٰہیت، بزرگی اور بارگاہِ رسالت میں ان کی قدر و منزلت مجھ پہ آشکار ہو چکی ہے اس لیے بصمیم قلب، انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے اپنی خطا اور گستاخی کی معافی طلب کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، اظہارِ ندامت کرتا ہوں اور اس اعتراف گناہ کو اس نیت سے شائع کرتا ہوں کہ قائین میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمالے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے دن مجھ سے اس گستاخی پہ مواخذہ نہ کرے جو میں نے اس کے مقرب بارگاہ بندے کی جناب میں روا رکھی تھی۔ رَبِّ اِنِّی ظلمت نفسی ظلمًا عظیمًا، لا غافر الذنوب الا انت فاغفرلی وارحمنی انك انت الغفور الرحیم۔ (آمین!)

اکتوبر ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں بی مارکیٹ کراچی میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

---

[1] کس کا قیاس صحیح نکلا اور کس کا غلط؟ اس کا کچھ اندازہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲ جون ۱۹۶۸ء کے لیڈر (اداریے) کے اس جملے سے بخوبی ہو سکتا ہے:

"پاکستان میں اگر شروع ہی سے اسلامی نظریات و شعائر، اسلامی ضابطۂ حیات اور اسلام کے نظامِ مالیات و قانون کو اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی تو آج حالات یقیناً مختلف ہوتے اور کسی کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی کہ ملک کے تمام دولت آفریں وسائل بلکہ تمام تر دولت پر مٹھی بھر افراد کا قبضہ ہے"

اس معصوم تمنا کے جواب میں نصیر دہلوی کا یہ شعر مدیرِ نوائے وقت کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے ؎

خیالِ زلف میں شب بھر نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

ایک کار میرے قریب آکر رکی اور اس میں سے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ باہر نکلے اور میری طرف بڑھے. میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا. حضرت نے حسب معمول مجھے معانقے سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہیں فرصت ہو تو میرے ساتھ چلو تم سے ایک ضروری گفتگو کرنی ہے. میں نے عرض کی بسروچشم۔ حضرتؒ نے ڈرائیور سے کہا کہ بزنس گارڈن چلو. وہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اس کے بعد حضرتؒ مجھے ساتھ لے کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میرے میزبان نے کل مجھ سے کہا کہ ایک صاحب نے جن کا نام پروفیسر یوسف سلیم چشتی ہے، ارمغان حجاز کی شرح میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی شان اقدس میں گستاخی بھی کی ہے اور اُن اشعار کی شرح میں جو اقبال نے حضرت مدنی کے بارے میں لکھے ہیں، اقبال کے اُس اعتراف کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس کے بعد ان اشعار کا وجود ہی کالعدم ہو چکا ہے" حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے اُن سے کہا کہ میں شارح کو بخوبی جانتا ہوں انشاء اللہ لاہور پہنچ کر ان سے اس معاملے میں گفتگو کروں گا لیکن حُسنِ اتفاق سے آج تم مجھے یہیں مل گئے. اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہاری توجہ اس طرف مبذول کروں اور تمہاری غلط فہمی کا ازالہ

لہ حضرت لاہوریؒ سے میرے تعلقات ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئے تھے. تقریب کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۹۲۹ء میں انجمن حمایت اسلام نے علامہ اقبال مرحوم اور سید غلام بھیک نیرنگ مرحوم کی نگرانی میں اشاعت اسلام کالج قائم کیا تھا اور کالج کمیٹی نے جس کے صدر محترم حضرت لاہوریؒ تھے، میرا تقرر بحیثیت پرنسپل کیا تھا۔ میں کالج کے نظم و نسق کے سلسلے میں مشورہ کرنے اور ہدایات حاصل کرنے کے لیے حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا. جب کبھی حاضر ہوتا تو حضرت لاہوریؒ اس عاجز سے کھڑے ہو کر معانقہ فرمایا کرتے تھے. حضرت موصوف نے اس وضع داری کو جسے میں اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں، تادمِ حیات نبھایا۔ کالج تو ۱۹۴۲ء میں اس لیے بند ہو گیا کہ جب جنگ عظیم کی بدولت میٹرک پاس کو سو روپے تنخواہ ملنے لگی تو بیس روپے ماہوار وظیفے پر کون نوجوان کالج میں داخل ہونا پسند کرتا لیکن حضرتؒ سے میرے نیازمندانہ تعلقات آخر وقت تک قائم رہے۔

بھی کر دوں۔

یہ سن کر میں نے معذرت آمیز انداز میں نیچی نگاہ کر کے عرض کی کہ "حضرت بلاشبہ مجھ سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ شرح لکھتے وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہی نہیں ہوا کہ علامہ اقبال نے اپنی وفات سے تین ہفتے پیشتر اپنا بیان روزنامہ احسان میں شائع کر دیا تھا کہ حقیقت حال منکشف ہو جانے کے بعد اب مجھے مولانا حسین احمد صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تینوں اشعار کالمعدوم کا مصداق ہو گئے اور ارمغان حجاز میں ان کے اندراج کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

میرے اظہار ندامت اور اعتراف تقصیر کے بعد حضرت لاہوری نے مجھ سے دریافت کیا، "تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ حضرت میں آپ کو ۱۹۲۹ء سے جانتا ہوں اور آپ کو اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں میں شمار کرتا ہوں۔"

یہ سن کر فرمایا، "میری بات کا یقین کرو گے؟"

میں نے کہا، "ضرور یقین کروں گا کیونکہ اللہ والے جھوٹ نہیں بول سکتے۔

یہ سن کر فرمایا۔ تو سنو! میں تمہاری بدگمانی دور کرنے کے لیے تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں اور میرے علم کی رو سے اس وقت روئے زمین پر کوئی شخص روحانیت تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے اعتبار سے حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا، "آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟

فرمایا، "میں حج کے مواقع پر خاصان حق کے اجتماع میں برابر شریک ہوتا ہوں ان سبھوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس وقت روئے زمین پر حضرت موصوف کا جواب نہیں ہے۔" میں سراپا حیرت بنا ہوا حضرت لاہوریؒ کی زبان سے حضرت مدنیؒ کی عظمت کا اعتراف سن رہا تھا۔ اس کے بعد حضرت موصوفؒ نے فرمایا، "حضرت مدنیؒ کی جوتیوں کا تلا بھی میری داڑھی سے زیادہ محترم ہے۔ بلاشبہ وہ اس زمانے میں اللہ کی ہستی کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی ہیں۔ چونکہ میں تمہیں عزیز رکھتا ہوں اس لیے تمہیں مشورہ دیتا ہوں

کہ حضرت مدنیؒ کی شان میں تم سے جو گستاخیاں سرزد ہوئی ہیں ان سے رجوع کر لو اور اللہ سے التجا کرو کہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے۔ اگر تم حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ ہوتے تو ہرگز ایسی گستاخی کا ارتکاب نہ کرتے میں دعا کروں گا کہ اللہ تم پر حضرت اقدسؒ کا مقام واضح کر دے۔ تم اس بات پر غور کرو کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت اقدسؒ کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے اس کے باوجود ان کا نہایت احترام کرتے تھے اور اپنی مجالس میں ان کی روحانی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔‘‘......

اس گفتگو کے بعد حضرت لاہوریؒ مجھے میرے مکان پر پہنچا کر اپنے میزبان کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت کی اس تلقین کا اس سیہ کار پر ایسا اثر ہوا کہ دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ پردہ جو میرے اور حضرت مولانا مدنیؒ کے مابین حائل تھا۔ یک لخت ہٹ گیا۔ اور ان کی عظمت کا ایک نہ مٹنے والا نقش میرے دل پر قائم ہو گیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میں حضرت لاہوریؒ سے ۲۵، ۲۶ سال سے واقف تھا اور مجھے یقین تھا کہ جھوٹ ان کی زبان سے نہیں نکل سکتا اس لیے ان کی گواہی کے بعد پھر مجھے کسی دلیل کی حاجت باقی نہیں رہی۔

مارچ ۱۹۵۰ء میں کراچی سے نقل مکانی کر کے لاہور واپس آیا تو زندگی میں پہلا انقلاب یہ رونما ہوا کہ حضرت لاہوریؒ کی مجالس ذکر میں شرکت شروع کی۔ حضرت اس سیہ کار پر خصوصی توجہ فرماتے تھے یعنی مجلس ذکر میں اپنے بائیں جانب پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کبھی تنہائی میں ملاقات ہوتی تھی تو بالالتزام شیخ الاسلام حضرت اقدسؒ کے کمالات روحانی کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ان تذکروں کا میرے دل پر یہ اثر مرتب ہوا کہ چند ماہ کے بعد مجھے حضرت اقدسؒ سے وہ رابطہ قلبی پیدا ہو گیا جسے عشق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

چنانچہ جب ۶، ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء کو اخباروں سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت اقدسؒ کا وصال ہو گیا تو مجھ پر زندگی میں پہلی مرتبہ فراق کی کیفیت طاری ہوئی۔ میں اس زمانے میں مسجد شاہ چراغؒ میں ہر اتوار کو مثنوی کا درس دیا کرتا تھا اور اہل علم جانتے ہیں کہ مثنوی کا سارا تار و پود عشق اور فراق انہی دو چیزوں سے مرکب ہوا ہے اور کل مثنوی ان دو ابتدائی شعروں کی تفسیر ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند — از جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

یعنی روح انسانی جو ازل سے محبوب حقیقی کے عشق میں مبتلا تھی، جب دنیا میں آئی تو فراق کی کیفیت سے دوچار ہوگئی۔ قصہ مختصر عشق اور فراق یہ مثنوی کے دو بنیادی تصورات ہیں اور اس کا قصر رفیع انہی بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے محبوب سے جدا ہو گیا ہوں۔ اللہ اکبر یہ کتنا عظیم الشان انقلاب تھا جو میرے ضمیر کی گہرائیوں میں رونما ہوا وہ شخص جس سے مدتوں تک نفرت کرتا رہا وہی شخص اب میرا محبوب بن چکا تھا اور اسی لیے اس کی وفات کی خبر پڑھ کر مجھ پہ فراق کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

میں نے مثنوی کا درس ملتوی کر دیا اور مجلس میں یہ اعلان کیا کہ آیندہ مجالس میں حضرت اقدسؒ کے کمالات روحانی کا بیان کروں گا۔ چنانچہ یہ سلسلہ چار ماہ تک جاری رہا۔ عام قارئین کی آگاہی کے لیے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت لاہوریؒ کی تلقین کی بنا پر میں نے نقش حیات اور مکتوبات شیخ الاسلام کا مطالعہ کر لیا تھا۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک حضرت لاہوریؒ کی مجالس ذکر میں شرکت کا سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں حضرت موصوف نے اپنے ارشادات سے مجھے حضرت اقدسؒ کے مقام سے بڑی حد تک آگاہ کر دیا تھا ان ارشادات کی روشنی میں اگر ایک طرف مجھ پر حضرت اقدسؒ کے کمالات روحانی سے آگاہی حاصل ہوئی تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ حضرت اقدسؒ انگریز کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن یقین کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت اقدس سے تعلق کی بدولت میرے دل میں بھی انگریزی زبان، انگریزی لباس، انگریزی وضع قطع اور انگریزیت سے زندگی میں پہلی مرتبہ نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ حالانکہ میں اپنی زندگی کے ساٹھ سال اسی لعنت میں گزار چکا تھا اور اکبر کا یہ شعر مجھ پر ہو بہو صادق آتا تھا:

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے!!!

حضرت اقدس رحؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارا اصلی دشمن ہندو نہیں انگریز ہے۔ چنانچہ جب میں نے اس نگاہ سے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا تو اس ارشاد کی صداقت مجھ پر روزِ روشن کی طرح آشکار ہو گئی۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے اکبر الہ آبادی کو۔ انھوں نے ان شعروں میں کتنی سچی بات کہی ہے۔

زیادہ اُن سے رہو محترز کہ ہندو سے ۔۔۔ یہ خود ہی سوچ لو، دل میں اگر نہ کچھ گدھو

یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف ۔۔۔ وہ چاہتے ہیں مسلمانی ہی نادارد ہو

اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تشریح سے بلاغت کا خون ہو جائے گا تو ختنے اور مسلمانی کے مفہوم اور ان دونوں میں فرق کو بھی واضح کر دیتا۔

حضرت لاہوری رحؒ کے وصال کے بعد زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ ذکرِ حبیب سننے کو کان ترس گئے۔ بالآخر ۱۹۶۴ء میں محترمی قاضی زاہد الحسینی مدظلہ، کو اپنی باطنی کیفیت سے آگاہ کیا اور لکھا کہ تبریزیہ سے جدائی کے بعد دل کسی صلاح الدین کو ڈھونڈتا ہے۔ انھوں نے از راہِ لطف اس عاجز کو مشورہ دیا کہ خوش قسمتی سے حضرت اقدس رحؒ کے خلیفہ مجاز مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہ، لاہور میں سکونت پذیر ہیں وہ تمہارے حق میں صلاح الدین بھی ثابت ہوں گے اور حسام الدین بھی۔

چنانچہ ۱۹۶۵ء میں اس عاجز نے سیّد صاحب موصوف سے رشتۂ ارادت و عقیدت استوار کیا اور استواری کے بعد یہ محسوس ہوا کہ نظامی مرحوم نے یہ مصرع میرے ہی لیے کہا تھا:

شکر کہ جمازہ بمنزل رسید

جب میں نے اس بات کی اطلاع قاضی صاحب موصوف کو دی تو انھوں نے مجھے لکھا کہ اب جب کہ حضرت اقدس رحؒ کا مقام آپ پر واضح ہو چکا ہے اور آپ اُن کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ گذشتہ زمانے میں آپ کے قلم اور آپ کی زبان سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدس رحؒ کی شان میں سرزد ہو چکی ہیں ان کا صدقِ دل

سے اعتراف کیجیے اور توبہ نامہ شائع کیجیے تاکہ

۱۔ قیامت کے دن مواخذہ اور عتاب دونوں سے محفوظ ہو جائیں۔

۲۔ حضرت اقدسؒ کی توجہ اور ان کے روحانی فیض سے بہرہ ور ہو سکیں۔

۳۔ اور ان لوگوں کا بھلا ہو سکے جو عدم واقفیت کی وجہ سے آج بھی حضرت اقدسؒ کی طرف سے سوءِ ظن رکھتے ہیں جس طرح آپ خود عرصہ دراز تک اس غلطی میں مبتلا رہ چکے تھے۔

دوسری مرتبہ ۲۰ر جنوری ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا "میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اکثر اوقات لوگ اہل اللہ کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے ہیں.... اللہ نے آپ پہ خصوصی فضل فرمایا ہے اگر آپ صیانۃً للناس اس موضوع پر ایک مقالہ سپرد قلم فرمادیں جس میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ سے آپ کی نسبت کا ذکر بھی آجائے تو بڑا مفید رہیگا اور بہت سے لوگوں کا راہ نما ہوگا۔"

تیسری مرتبہ یکم اپریل ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا "آج ایک بہت پاکیزہ مجلس میں آپ کا ذکر خیر آگیا اس لیے بطور یاد دہانی عرض ہے کہ ضرور ایک جامع مضمون اپنی انابت پر تیار فرمادیں اس سے انشاء اللہ دوسروں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"

چوتھی مرتبہ ۱۲ر اپریل ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا "آپ کے اس مضمون سے انشاء اللہ کئی بھٹکے ہوئے اور گستاخ ذہن انسانوں کو نورِ ہدایت مل جائے گا اور وہ سوءِ خاتمہ سے محفوظ رہیں گے۔"

پانچویں مرتبہ اپنے ۲۴ر اپریل ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

"کلام اقبال کی شرح میں جہاں جہاں جناب کا قلم حدودِ ادب سے تجاوز کر گیا ہے اگر فی الحال بہت جلد ان عبارتوں سے رجوع فرمالیں تو یہ بھی صرف بہتر نہیں بلکہ ضروری ہے۔"

میں نے یہ اقتباسات قصداً درج کیے ہیں تاکہ قارئین پہ یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ اس قدر تاکید کے باوجود میر النفس اپنی گستاخیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ قارئین غور کریں کہ اپنی غلطی کا اعتراف نفس پر کس قدر

شاق گزرتا ہے۔ قاضی صاحب مسلسل متوجہ کر رہے ہیں مگر نفس ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا بلکہ مسلسل مجھ سے یہی کہتا رہا کہ اس اعتراف سے تیری کس قدر سبکی ہوگی دنیا کی نظروں میں تو کس قدر ذلیل ہو جائے گا۔ وغیر ذلک من الخوافات۔

اس عرصے میں ایک دفعہ بھی میں نفس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکا یعنی اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ جب قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے میرے مقرب بارگاہ بندے کی شان میں یہ گستاخی کس بنا پر کی تھی تو کیا جواب دوں گا؟ اور جب فرمائے گا کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد کیا چیز تجھ کو اعترافِ گناہ سے روکتی رہی؟ تو کیا عذر پیش کر دوں گا؟ اور جب بھری محفل میں یعنی اللہ کی بارگاہ میں میری رسوائی ہوگی تو کیا وہ رسوائی اس دنیا کی سبکی یا تحقیر سے بدرجہا زیادہ نہ ہوگی!

سچ ہے ریت سے تیل نکال لینا آسان ہے مگر نفس امارہ کے پھندے سے اپنے آپ کو نکال لینا بہت مشکل ہے۔ انسان ضعیف الایمان جتنا دنیا والوں سے ڈرتا ہے اگر خدا سے اتنا ڈرنے لگے تو بلاشبہ فرشتہ بن جائے۔ سچ کہا ہے شیخ سعدی نے:

گر وزیر از خدا بترسیدے
ہم چناں کز ملک، ملک بودے

جب قاضی صاحب نے دیکھا کہ میں مسلسل لیت و لعل سے کام لے رہا ہوں اور وعدوں کے باوجود ایفائے وعدہ نہیں کرتا تو انھوں نے میری عاقبت سنوارنے کے لیے اپنے دینی ترکش سے آخری تیر نکالا۔ یعنی ۲۲ رمئی ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

"بہر حال آپ کی طرف سے فی الحال اگر چند سطور ہی خدام الدین میں آ جائیں تو بہتر ہیں مثلاً "شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی شان گرامی میں میرے قلم اور میری زبان سے جو کلمات ناشائستہ صادر ہو چکے ہیں میں ان پر صدق دل سے نادم ہو کر رجوع کرتا ہوں اس پر تفصیلی مقالے کا انتظار فرمائیں۔"

یہ بھی فاستبقوا الخیرات کا مصداق ہو جائے گا، میں آپ سے بار بار اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ سالک کے اکثر مقامات شیخ کی شان میں بے ادبی سے نہ صرف رک جاتے

ہیں بلکہ لطائف بجھ جاتے ہیں،

جس وقت میں نے یہ آخری جملہ پڑھا تو مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی اسے اس مصرع سے واضح کیا جا سکتا ہے ؂

تنزلزل در الٰہ ان شیطاں فتاد

دوسرے لفظوں میں اس فقرے نے میری خودی کو بیدار کر دیا۔ چنانچہ میں نے اپنی ہمت اور اپنے اختیار دونوں ہتھیاروں سے بیک وقت کام لے کر نفس سے کہا "میری ہستی عبارت ہے لطائف سے نہ کہ تجرد سے: اگر لطائف ہی بجھ گئے یعنی دل ہی مر گیا تو پھر وجودِ یوسف اور عدمِ یوسف دونوں یکساں ہو گئے! کیا تو نے اقبال کا یہ شعر نہیں پڑھا

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اے نفس! اگر میرا دل مر گیا تو پھر مجھ میں اور حمار میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ میں نے برسوں تیرا کہنا مانا، اور حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے باوجود اعترافِ گناہ نہیں کیا۔ لیکن اب میرے سامنے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہے اس لیے تیرا کہنا ہرگز نہیں مانوں گا کہ چونکہ میں اندھا تھا یعنی حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ نہ تھا اس لیے میں نے واقعی حضرت موصوفؒ کی اپنے قلم اور اپنی زبان سے ان کی شان میں گستاخیاں کی ہیں۔ میں غلط پروپاگنڈے کے سحر سے مسحور ہو گیا تھا۔ حق اور باطل میں تمیز کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ الحمد للہ کہ اس نے مجھے قبلِ وفات توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی۔

ان تفصیلات کے بعد اب میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے وفات سے پہلے مجھے توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحب کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ فرمایا اور اس کے بعد محترم قاضی زاہد صاحب الحسینی کا شکریہ

ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کارِ خیر پہ آمادہ کیا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ اے اللہ! اے غافر الذنب وقابل التوب! اے غفور الرحیم۔ لا الہ الا انت ولا قاضی الحاجات الا انت ولا غافر الذنوب الا انت ولا فاعل فی الحقیقت الا انت ولا موجود فی الحقیقت الا انت!

اے رحیم وکریم! میں اپنے گناہوں کا صدق دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ میری ساری زندگی نافرمانیوں میں بسر ہوئی ہے۔

واپس آمد بندۂ بگریختہ — آبروئے خود زعصیاں ریختہ
بے گنہ نگذشت بر من ساعتے — با حضورِ دل نکردم طاعتے

اے ستار العیوب! میں بصمیم قلب اقرار کرتا ہوں کہ میں نے تیرے مقبول بارگاہ اور برگزیدہ بندے شیخ الاسلام، مجاہد اعظم، قدوۃ العارفین، زبدۃ الکاملین، سیدی و شیخی وسندی ووسیلتی فی الدارین سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ العزیز کی شان اقدس میں اپنے قلم اور اپنی زبان سے بڑی گستاخیاں کیں۔ میں اپنی اس نالائقی اور حماقت کو کسی پردے میں نہیں چھپانا چاہتا۔ علانیہ صاف لفظوں میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں۔

اے اللہ! میں اندھا اور جاہل اور ظالم اور احمق اور عقل وخرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے حرم نبوی میں بیٹھ کر چودہ سال تک دین کی تعلیم و تبلیغ کی اور ساری عمر اتباع رسول صلی اللہ علیہ میں بسر کر دی تھی اُسے مقام رسول سے بے خبر قرار دیتا رہا بلکہ اس کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان گستاخیوں پہ فخر کرتا رہا.....

اے اللہ میں ڈرتا ہوں اور سخت لرزہ براندام ہوں اس بات سے کہ قیامت میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مجھ پر پڑے گی تو کہیں آنحضورؐ مجھ سے اس انداز میں خطاب نہ فرمائیں ”اچھا تو تم ہو وہ گستاخ اور دریدہ دہن جس نے میرے اس عاشق صادق کی شان میں بے ادبی کی تھی جس نے میرے دین کی سربلندی کی خاطر اور میری محبت میں ساری عمر قید و بند کو دعوت دی اور طوق وسلاسل کو لبیک کہا! جس نے میری محبت میں میرے

دین کے دشمنوں کے خلاف جہاد کیا اور تادمِ آخر کلمۂ حق کہا، جس نے میری خاطر مالٹا میں مصائب جھیلے۔ جس نے میری محبت میں کراچی کا جیل کاٹا، جس نے اعلاءِ کلمۃُ الحق کے لیے انگریز (علیہ ما علیہ) سے ٹکر لی۔ جس نے میری امت کی بہبود کے لیے دن میں قرآن و حدیث کا درس دیا اور رات میں دشمنانِ اسلام کے خلاف لسانی جہاد کیا۔

جس نے اسلام کی خاطر غیروں کے طعنے سنے اور اپنوں سے گالیاں کھائیں اور گالیاں کھا کے بے مزہ ہونا درکنار ان گالیاں دینے والوں کے حق میں دعائیں کیں۔ جس نے اپنی تمام متاعِ حیات تجھ پہ نثار کر دی تو اس وقت میرا کیا حال ہو گا؟ کون سا آسمان مجھے پناہ دے گا اور کون سی زمین مجھے ٹھکانا دے گی؟

اے اللہ! حضورؐ کی ایک نگاہِ عتاب میری عاقبت کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے

اے اللہ! حضورؐ کی اس نگاہِ عتاب سے بچنے کے لیے میں اس دنیا میں ہر قسم کی ذلت اور رسوائی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

اے اللہ! میں صدقِ دل سے توبہ کرتا ہوں میری لغزشوں، خطاؤں اور گستاخیوں کو معاف کر دے جو میں نے اپنے شیخِ طریقت مخدومِ ملت، محرمِ رازِ نبوت، واقفِ اسرارِ رسالت اور آشنائے مقامِ محمدی (علیہ افضل التحیۃ والثنا) کی شان میں روا رکھیں۔

اے اللہ! اپنے مقبولِ بارگاہ بندوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ میرے حق میں معافی کے لیے دعا کریں مجھے یقین ہے کہ تو اُن کے وسیلے سے مجھ پہ کرم کرے گا اور مجھے میرے شیخ بلکہ شیخ العرب حضرت مدنیؒ کی نسبتِ عالیہ سے حصہ وافر عطا فرمائے گا اور مجھے اُن کے نقشِ قدم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

ربنا تقبل منی انک انت السمیع العلیم۔ وتب علی انک انت التواب الرحیم وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ وعبدہ ورسولہ الکریم

حضرت شیخ الاسلام کے اندیشے

اور موجودہ حالات

مولانا سمیع الحق

ایک المناک صورت حال نے ملک کا شیرازہ جس بے دردی سے بکھیر دیا ہے۔ اس پر نقد و احتساب کے ضمن میں پاکستان کے نقطۂ آغاز اور تشکیل سے لے کر اب تک کے حالات پر مختلف زاویوں سے گفتگو ہو رہی ہے جن خطوط اور بنیادوں پر ملک کی تقسیم یا تشکیل ہوئی، اسے بھی زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ برصغیر کی تاریخ اپنی حقیقت کی طرف لوٹ رہی ہے، کچھ کنفیڈریشن کی باتیں کرتے ہیں اور کچھ لوگ دبی زبان سے سہی مگر دل کے اندر سے اٹھنے والے ان خیالات کو دبائے نہیں رہ سکے کہ پاکستان کی موجودہ شکل میں قیام بالخصوص بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی نہایت شد و مد سے مخالفت کرنے میں شاید مسلمانوں کے بعض عظیم رہنما بالخصوص شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی مرحوم کا نقطۂ نظر غلط نہ تھا۔ اس سلسلہ میں اگر سیاسی اور گروہی تصورات سے الگ ہو کر حضرت شیخ الاسلامؒ کے اندیشوں پر ایک نگاہ باز گشت ڈالی جائے تو کیا حرج ہے۔ شاید ان کی نگاہ قلندرانہ کی دور رسی کا کچھ احساس تو ہو جائے خواہ اس موقف کی تصویب یا تغلیط کا کام حالات اور واقعات کے ذمہ کیوں نہ لگا دیا جائے مگر حال کے آئینہ میں ماضی کے کچھ نقوش تو سامنے آ ہی رہے ہیں پاکستان کی صورت میں خلافت اسلامیہ اور اسلامی نظام کے قیام کے مقدس اور حسین تصور میں کھو کر جن لوگوں نے اپنا سب کچھ اس راہ میں لٹا دیا ہے۔ بے شک ان کی قربانیاں صد ہزار تحسین اور بارگاہ ایزدی میں اجر کی مستحق ہیں کہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر کسی کی

نیتوں میں کھوٹ تھا۔ تو وبال اور بربادی بھی ان کے نامۂ اعمال ہی میں ڈالی جائے گی مگر اپنے وقت کے ان عظیم خدا رسیدہ اور حقیقت شناس بزرگوں کی فراست مومنانہ اور مسلسل و پیہم آلام ومصائب اور شدائد کا تحمل اس بات کی منہ بولتی شہادت رہی کہ وہ مسلمانوں کے بدخواہ نہ تھے نہ یہ لوگ ضمیر فروش اور خود غرض تھے اور نہ مسلمانوں کے دشمن۔ ان کی اخلاص وللہیت ان کی پاکیزہ زندگی کی طرح تاریخ کے بے رحم ہاتھوں کی دسترس سے ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

ان کا ناقابل معافی جرم یہی تھا کہ وہ پاکستان میں خلافت اسلامیہ کے بلند بانگ دعوؤں کو ایک فریب اور دھوکا سمجھ کر تقسیم ہند کو مسلمانوں کے مسائل کا صحیح حل نہیں سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کی ایک تہائی جنہیں کوئی زمین ٹھکانہ نہیں دے سکے گی۔ ہندوستان میں تعلیمی اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے ان کی حالت نہایت پسماندہ اور قابلِ رحم ہو جائیگی اسلام پورے برصغیر سے ایک گوشہ میں سمٹ کر رہ جائے گا۔ جبکہ ان کے خیال میں ان کے پیش کردہ فارمولا سے پاکستان ہندوستان کے چند گوشوں میں سمٹ جانے کی بجائے پورا ہندوستان ایسا پاکستان بن سکتا۔ جس میں شرعی احکام کا نفاذ مسلمانوں کے کامل اور آزاد اختیارات کے ذریعہ پورے ہندوستان میں ہو سکتا اجلاس جمعیۃ العلماء لاہور ۱۹۴۲ء کی قرارداد) پاکستان کی مجوزہ اسکیم پر ان بزرگوں نے نہایت خلوص سے ہر پہلو پر اپنے تنقیدی پہ غور کیا اور اس کے سیاسی، اقتصادی، لسانی، ملکی، قومی، تبلیغی خارجہ پالیسی، غرض ہر گوشے پر اپنے تنقیدی خیالات پیش کیے، اور اپنے خیال کے مطابق مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور تحفظ و بقا کا ضامن فارمولا پیش کیا۔

ان حضرات نے واضح طور پر کہا کہ پاکستان کو مختلف ٹکڑوں میں جو ریاست مل جائے گی، وہ خطرناک جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گی چنانچہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم اور ان صوبوں کی جنگی اہمیت کے حصّوں کا بھارت میں چلے جانے

اور پنجاب کی تحصیل گورداس پور کی وجہ سے کشمیر پر بھارت کے تسلط وغیرہ پر ان حضرات نے سختی سے تنقید کی اور اسے پورے برصغیر کے مسلمانوں کے غیر یقینی مستقبل کا پیش خیمہ قرار دیا۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ اس جغرافیائی اتحاد کو ختم کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہے گی۔ اس سلسلہ میں لارڈ لنگھتکو اور لارڈ ڈیول کے واضح الفاظ ان کے سامنے رہے۔ اور آج سقوط ڈھاکہ پر ماؤنٹ بیٹن کے ___ تاثرات نے ان خیالات کی حرف بحرف تائید کی کہ انگریزی سامراج اپنے عیارانہ منصوبوں کے ذریعہ برصغیر کے مسلمانوں سے ایک نہ ختم ہونے والا انتقام لینا چاہتے تھے۔

ان حضرات کے تمام خدشات اور اندیشوں کو غلط ثابت کر دکھانے اور تمام غلطیوں کی تلافی صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ پاکستان قائم ہوتے ہی ہم یہاں اسلام کی مکمل حاکمیت قائم کر دیتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا، اور ہم نے ان تمام بلند بانگ دعووں ہی سے انکار کر دیا جو برصغیر کے مسلمانوں میں بے مثال دینی جوش وخروش کا سبب بن کر انہیں خاک وخون کی گھاٹیوں میں اتارنے کا سبب بنے تھے یہ ایک طویل اور شرمناک کہانی ہے۔ جو ۱۹۴۷ء سے لے کر دسمبر ۱۹۷۱ء بلکہ آج تک کے عرصہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئی ہے۔ حضرت مدنیؒ اور ان حضرات کے اخلاص اور للّٰہیت کے لیے یہی کافی ہے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت مخالفت کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے خطوط بیانات مکاتیب اور نجی پیغامات کے ذریعہ نہ صرف اسے تسلیم کرنے پر زور دیا بلکہ یہاں رہنے والے تمام متعلقین کو حکم دیا کہ اب اپنی مساعی اس ملک کی حفاظت، سالمیت اور یہاں اسلام کے غلبہ پر مرکوز کر دیں۔ اور آج حضرت مدنیؒ سے وابستہ لاکھوں علماء اور مشائخ کی جماعت اور بے شمار معتقدین ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر اپنا تن من دھن اس ملک کی ترقی اور یہاں اسلام کے غلبہ و نفاذ میں لگے ہوئے ہیں۔ مخالفت جو بھی کہیں مگر علماء کلمۃ الحق منکرات کی مخالفت اور معروفات کی اشاعت میں

لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم۔ کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان جس کی تشریح لا الہ الا اللہ سے کی جاتی تھی کیا شیخ الاسلام جیسے عارف باللہ اور عبد کامل کو اللہ کی حاکمیت گوارا نہ تھی؟ کہ وہ اس شد و مد سے اس کی مخالفت کرتے رہے۔ مگر وہ جس کی مومنانہ فراست ان دعوؤں کی حقیقت دیکھ رہی تھی اس تعجب کو انہوں نے اس طرح دور فرمایا:

"بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو یہ دھوکا دیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت بطرز خلفائے راشدین قائم کی جائے گی۔ یہ خواب تو نہایت شیریں ہے۔ کاش! ایسا ہو اگر اس کا ذمہ داران لیگ اطمنان دلا دیں تو ہم ارکین جمعیتہ سب سے پہلے اس آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ لوگ جن کو دین اور مذہب اسلام اور شعائر اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں نہ صورت اسلامی ہے نہ سیرت وہ اسلامی حکومت قائم کریں اور مذہب کے اصول و ضوابط پر بطرز خلفاء راشدین چلائیں وہ حضرات جن میں اور دین و مذہب میں وہ تعلق ہو جو اندھیرے کو روشنی سے ہے اور آگ کو پانی سے ہے وہ دین و مذہب کا احیا کریں ـــــ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو کیا وہ اقلیت پنجاب اور بنگال کی (جس کی تباہی میں اسی اقلیت نے بنیادی کردار ادا کیا۔ سمیع) جو کہ معمولی اقلیت ہے، یعنی صرف پانچ یا سات عدد سے وہ ایسا ہونے دے گی۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو کیا مسلم اقلیت والے صوبوں میں اس کا ایسا ردعمل نہ ہوگا کہ وہاں خالص ہندو راج اور رام راج قائم کیا جائے الخ۔ (خطبہ صدارت اجلاس سہارنپوری ص۱۸)

اور جب ایسے اندیشوں کے اظہار کی پاداش میں اپنے دور کے سب سے بڑے ولی اور اللہ کی مقرب شخصیت کو اس وقت کی ہر گالی دشنام ایذا رسانی اور توہین سے مسلم قوم نے

نوزائیدہ پاکستان کے ایک جان نثار معاصر مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم چلا اٹھے اور کہا:

"پاکستان ایسا ہی ہوگا جہاں مذہب اور اہل مذہب کے ساتھ اس قسم کا وحشیانہ سلوک کیا جائے گا اس پاکستان میں علما حق کو رائے کی آزادی میسر نہ ہو گی، ہس پاکستان میں کیا آپ نماز روزے اور شعائر اسلامیہ کی چہل پہل دیکھ سکیں گے بلکہ وہ پاکستانی تو فسق و فجور کی منڈیاں ہوں گی جہاں سب کچھ ہوگا اور نہیں ہوگا تو دین الٰہی کا تذکرہ کہیں نہیں ہوگا (تقریر سحبان الہند ص؟)

ایک طرف یہ کہا جا رہا تھا، دوسری طرف اسلام کے مقدس نام پر ان اندیشوں کی تضحیک کی جا رہی تھی۔ کس کا قیاس صحیح نکلا ۔؟ اس کا جواب اپنی قومی زندگی کی چوبیس سالہ تاریخ کے اوراق میں ڈھونڈیے، اگر شروع ہی سے اسلامی نظریات، شعائر اللہ دینی اقدار اور اسلام کے نظام حکومت و معاش کو پنپنے دیا گیا ہوتا تو شاید یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ مگر ہائے رے معصوم تمنا!

یہ تو رہا پاکستان میں شریعت الٰہیہ کے اجراء اور نفاذ کا مسئلہ جس انداز میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فارمولا بنایا گیا۔ حضرت شیخ الاسلام اپنی فراست باطنی کی وجہ سے اس میں آنے والے پر خطرات ہجوم کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور اسے مسلمانوں کے اس برصغیر میں تباہی کا واشگاف الفاظ میں پیش خیمہ قرار دینے لگے فرمایا:

"یہ صحیح ہے کہ پاکستان اور اسلامی حکومت کے نعرے بڑے دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ دو اسلامی حکومتوں کے قیام کا تخیل عام مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا سرور اور جوش پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی سچ سہی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کافی اختلافات ہیں مگر اس کے باوجود بھی یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ محض ہندوؤں کی تنگ دلی سے شاکی ہو کر ہم ایسی غلطی کر بیٹھیں جو مستقبل میں ہمارے لیے تباہ کن اور ملت کے لیے باعث بربادی بنے۔ یہ بالکل واضح

ہے کہ بنگال اور پنجاب کی حکومتیں اتنی طاقتور نہیں ہوں گی کہ وہ بیرونی حکومتوں کے ساز باز اور ان کی دراز دستیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ہندوؤں سے تو مفروضہ آزادی حاصل کر لیں۔ مگر اس مفروضہ آزادی کے بدلہ میں غیر ملکی حکومتوں کی ویسی ہی غلامی میں مبتلا ہو جائیں جیسی کہ آج ہمارے سروں پہ نافذ ہے۔ اگر ایسا ہوا۔ تو یہ بدترین بدقسمتی ہو گی۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم معاملات کو محض ہندو دشمنی کی عینک سے نہ دیکھیں، بلکہ پاکستان کے سوال پر سنجیدگی سے غور کر کے یہ فیصلہ کریں کہ آیا یہ پاکستانی حکومتیں خود ہمارے لیے باعثِ رحمت ثابت ہو سکیں گی۔ یا نہیں! آیا یہ اپنے تحفظ کا مناسب بندوبست کر سکیں گی یا نہیں! آیا یہ اتنی طاقتور ہوں گی یا نہیں کہ بین الاقوامی سیاست میں اپنا وقار قائم رکھ سکیں۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو دانائی کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے لیے مابقی اختیارات حاصل کر کے متحدہ ہندوستانی وفاق میں شامل رکھا جائے۔ اور بجائے علیحدہ ہو کر دوسروں کے غلام بننے کے ہندوؤں سے مل کر نہ صرف اپنی آزادی باقی رکھی جائے۔ بلکہ متحدہ ہندوستان کے وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود ملتِ اسلامیہ کی اس طرح اندرونی اصلاح کی جائے۔ کہ وہ زندہ اور طاقتور قوم محسوس ہونے لگے۔ "مارننگ نیوز" کا یہ بیان صحیح ہے کہ اب دنیا تقسیم اور علیحدگی کی مہمل سیاسی پالیسی کو چھوڑتی جا رہی ہے۔ اس لیے مسلسل تجربات نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ اس تنازع اللبقاء کی دنیا میں صرف طاقتور زندہ رہ سکتے ہیں۔ کمزور خواہ وہ کتنے ہی حق پرور کیوں نہ ہوں، زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

مان لیجیے کہ قیام پاکستان کے لیے اچھے دلائل موجود ہیں۔ مگر یہ اچھے اور خوبصورت دلائل جاپان کو بنگال پر اور روس کو پنجاب و سرحد پر حریصانہ نگاہیں ڈالنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ کیا آزادی وانصاف کے تمام الفاظ ملک گیری کے آرزومندوں کو پاکستان کے کمزور ممالک کی تسخیر کے ارادوں سے باز رکھ سکتے ہیں؟ اگر کوئی اس معاملہ میں دیانتداری کا ذرا بھی شبہ رکھتا ہے۔ تو وہ بیوقوفوں کی جنت کا ساکن ہے۔ اس دنیا میں جہاں حق کے مقابلہ میں طاقت کا راج ہے۔ پاکستانی حکومتیں محض اس بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتیں کہ مسلمانوں کو آزاد رہنے کا حق ہے۔ اور بحیثیت ایک علیحدہ قوم کے ان کو ضرور آزاد رہنا چاہیے۔ (نئی زندگی، کتاب دوم۔ ص۱۹ از مولانا مدنی رح)

بیرونی حکومتوں سے ساز باز ــــ یا ان کی دراز دستیوں کا مقابلہ، غیر ملکی حکومتوں کی غلامی ــــ اپنے تحفظ کا مناسب بندوبست کر سکیں گی یا نہیں ــــ روس کی پنجاب و سرحد پر حریصانہ نگاہیں ــــ ملک گیری کے آرزومندوں کے پاکستان کے کمزور حصوں پر تسخیر کے ارادے اور اس قسم کے دیگر جملوں پر غور کیجیے تو آج کے بدترین سانحہ "سقوطِ مشرقی پاکستان" کے خطوط پر اس کی تفسیر تشریح آپ کو مل سکے گی۔

حضرت رح اور ان کی جماعت کا شائع کردہ لٹریچر آپ کو ایسی باتوں سے بھرا ملے گا۔ ذہن سیاسی آلائشوں سے صاف رکھ کر بھی تو کوئی طالب العلم ماضی اور تاریخ پر نگاہِ باز رفت ڈال سکتا ہے۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر یہ حضرات ایک لمحہ کے لیے بھی آمادہ نہیں ہو رہے تھے اور اس لیے کہ :

پس پاکستان قائم ہوتے ہی آدھا بنگال اور آدھا پنجاب مسلمان کھو دیں گے اب رہا آسام وہ پورا کھو دیں گے۔ سوائے ضلع سلہٹ کے۔ بس مسلم لیگ کے پاکستان کا یہ کیا نتیجہ ہوگا۔ بنگال میں ایک کوٹھری ملے گی جس کے پورب ہندو راج،

تقسیم ہندوراج اور اترہندوراج، آسام بالکل اور آدھا پنجاب نکل جائے گا۔

نتیجہ یہ ہے، مسلم لیگ کا پاکستان مسلمانوں کے لیے خودکشی سے کم نہیں ہم بھی ہندوراج میں جاکر تباہ ہوئے اور اکثریت صوبے والے بھی تباہ ہوئے۔

(قومی کارکنوں کے نام ہدایات ص۱۱۶)

تقسیم پنجاب اور پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی کو حضرت مدنی "قسمۂ ضیزی اور نامراد بٹوارہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"جمعیۃ العلماء ہند ان تاریک پہلوؤں کی بنا پر کانگریس کی حالیہ تجویز تقسیم پنجاب یعنی تقسیم در تقسیم کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کرسکتی ـــ اور تقسیم برطانوی سامراج کا آخری ہتھیار ہے (خطبہ صدارت اجلاس لکھنؤ ۱۹۴۷ء)

اس وقت ان تاریک پہلوؤں کو ہر حیثیت سے واضح کرتے ہوئے کہا گیا کہ دونوں حصوں کو الگ الگ بری بحری اور ہوائی فوج رکھنا پڑے گی اور مشرقی حصہ خاص طور پر ایک جزیرہ بن جائے گا فرقہ وارانہ کشیدگی میں مزید تلخی بڑھے گی۔ مجموعی ہندوستان اور وفاقی حصوں میں مسلمان بے بس اقلیت ہو جائیں گے۔ پنجاب اور بنگال دونوں کے اہم حصے کاٹ دینے سے ان کی موجودہ اہمیت ختم ہو جائے گی مالی بحران پیدا ہو گا اور پاکستان اس حالت میں صحرا اور بنجر علاقوں کا چوکیدار رہ جائے گا۔ اور پھر مشرقی و مغربی پاکستان کو ایک دوسرے سے ملانے والے راستہ کا سوال کبھی پیدا ہی نہ ہو گا (ملخصاً از نئی زندگی خاص نمبر سنہ ۱۹۴۷ء)

اس نازک جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے آگے چل کر پاکستان جن داخلی مسائل سے دوچار ہو سکتا تھا، اور بعد کے حالات نے اس کی سو فی صد تصدیق کر دی اس سے آگاہ کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

بحیثیت مجموعی مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہمہ گیر اقتصادی پسماندگی، پانچ میں سے

تین صوبوں کا خود مکتفی نہ ہونا۔ ۴۰۰ء فی صد کی منظم اور مؤثر اقلیت کی مقاومت وغیرہ پاکستان کے وہ داخلی مسائل ہوں گے جن سے حکومت عہدہ برآ نہ ہوسکے گی۔ اور اپنی حالت سنبھالنے کے لیے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی جس کی وجہ سے اقتصادی زندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا (آج ہم میں سے ہر شخص غیر ملکی قرضوں کے سود میں دبا ہوا ہے۔ سمیع) مزید برآں یہ حکومت اپنے وسائل کی قلت اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پہ پورا نہ کر سکے گی۔ اس لیے ملک کے دفاع کو دولت مشترکہ برطانیہ (سیٹو، سنٹو، بغداد پیکٹ وغیرہ۔ سمیع) کے دفاع سے وابستہ کرنا ہوگا۔ (بعد میں برطانیہ کی جگہ امریکہ نے لے لی۔ سمیع) یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی اور اس طرح نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ (یا پھر امریکہ اور چین جو سب ملت واحدہ ہیں سمیع) کی سیاسی و اقتصادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گا۔ اپنی کمزوری اور تباہ حالی کی وجہ سے نہ اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہو سکے گی اور نہ یہ حکومت اسلامی ممالک کی کوئی مؤثر امداد کر سکے گی۔ بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گی۔ (اور اسی روس اور برطانیہ نے مشرقی پاکستان کے المیہ میں بنیادی کردار ادا کیا ع

"قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا۔ (مکتوبات ج ۲ ص ۔۔)

جغرافیائی صورتحال کی بناء پر یہی کھٹکا قیام پاکستان کے بعد بھی ان رہنماؤں کو

نگار رہا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے وفات سے کچھ عرصہ پیشتر اپنی کتاب "ہماری آزادی" میں واشگاف الفاظ میں آنے والے خطرہ کی نشاندہی کی اور فرمایا:

"مسٹر جناح اور ان کے ساتھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے۔ کہ جغرافیائی صورتحال ان کے لیے ناموافق ہے۔ مسلمان سارے برصغیر میں کچھ اس طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کہ ایک سمٹے ہوئے علاقے میں ان کی الگ ریاست بنانا ناممکن تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے شمال مشرق اور شمال مغرب میں تھے۔ یہ دونوں علاقے کسی مقام پر بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔ یہاں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ صورتِ حال اس وقت تھی اور اب بھی ہے۔ کون اس کی توقع کر سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اختلافات دور ہو جائیں گے۔ اور یہ دونوں علاقے ایک قوم بن جائیں گے۔ خود مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب اور سرحد اپنے اپنے جداگانہ مقاصد اور مفاد کے لیے کوشاں ہیں۔ بہرکیف اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے۔ اب دونوں ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں (ہماری آزادی ۱۹۵۹ء، ۲۲۵)"

سیدنا مولانا مدنیؒ نے تو ایک مکتوب میں پاکستان کے لیے جذبۂ نصح اور خیرخواہی کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہاں تک اپنے خطرات کا اظہار کیا کہ: "موجودہ شکل میں یہ نقشہ ۲۴،۲۲ سال بمشکل قائم رہ سکے گا۔ اور آہ! کہ یہی چوبیس سالہ عدد ہماری بربادی اور تباہی کا عنوان بالآخر بن گیا ہے۔ کاش! قیامِ پاکستان کے بعد ہی مگر ہم اللہ کے ایسے برگزیدہ بندوں کے اندیشوں کو درخورِ اعتنا سمجھ لیتے اور اس ملک میں اپنی تقدیر بنانے کی مخلصانہ سعی کرتے تو ان تمام خدشات اور اندیشوں کی تلافی کر لیتے اور یہ مختصر مگر پُرخطر خطہ نہ صرف اسلام کی

امیدوں کا مرکز بنا لیتے۔ اور اس طرح آج جان لیوا اور جان نثار سرفروشوں کے ارواح طیبہ کو مزید آسودگی نصیب ہوتی جنہوں نے اسلام کے نام پر اس ملک کے لیے اپنی جانیں اور عصمتیں نچھاور کر دیں۔ یا وہ لوگ جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انگریز کے خلاف جہاد مسلسل کے زرّیں ابواب اپنے خون سے رقم کیے۔ ان حالات کو دیکھ کر حضرت شیخ الاسلامؒ کے حساس قلب پہ کیا کچھ گزرا ہو گا۔ فرماتے ہیں:

"ہماری سنی جاتی تو آج وہ مشکلات درپیش نہ ہوتیں اس وقت مسلمان جمہوریہ ہند میں ۲۷ فیصد ہوتے جو کہ مؤثر اقلیت ہے مگر آج چار کروڑ ہیں جو دس یا گیارہ فی صد پڑتے ہیں۔ (مکتوبات ج ۲ صـ۲۲۲)

گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مسلم اکثریت کی حکومتیں ہوتیں جو تمام داخلی معاملات قانون سازی، نظام تعلیم، اقتصادی نظام کے قیام معاشرتی اور تمدنی مسائل، پرسنل لا وغیرہ میں پوری با اختیار ہوتیں، پورے ہند میں مسلمانوں کے مذہبی ادارے اوقاف، مساجد، مقابر اور ان کا کلچر اور تہذیب و تمدن وغیرہ محفوظ تھا (مکتوبات ج ۲ صـ۸۱)

معلوم نہیں ان مسلمانوں کے دلوں کی کیا کیفیت ہو گی، جو اُسی پاکستان کی سرزمین ڈھاکہ میں اس جرم کی پاداش میں لاکھوں بہاریوں اور غیر بنگالیوں کو خاک و خون میں تڑپتا اور ان کی مقدس عصمتوں کو لٹتا ہوا دیکھ کر بھی بے بس ہیں۔ ان بہاریوں کو جن کا نعرہ تھا کہ "ہم بہار کے مسلمان پاکستان کے لیے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ (ڈان ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء)

اجڑے اور شکستہ دل آزاد ہوتے ہیں کہ جیسے چاہیں اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کو تاثرات اور جذبات سے آباد کرالیں ۔۔ نہ ملت کی خیر خواہی کسی کا اجارہ ہے۔ تاریخ خود بے رحم کسوٹی ہے ۔۔ بہر حال جو کچھ ہونا تھا ہو چکا یہ سارے اندیشے پاکستان قائم نہ ہونے کی صورت میں لائق اعتنا تھے۔ اب جبکہ یہ اندیشے "صداقتیں" بن چکی ہیں تو ہماری نجات

اور تمام بربادیوں کی تلافی کی ایک ہی راہ رہ گئی ہے کہ اب اس رہے سہے ملک کو صحیح معنوں میں پاکستان بنا دیں۔ اللہ کے نام میں اتنی عظمت اور تاثیر ہے کہ اس کے سہارے سے ایک چھوٹا سا خطہ بھی پوری دنیائے کفر کو لرزہ براندام کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہم ہندوستان سے عظمت اسلام کا وہی سکہ ایک بار پھر منوا سکتے ہیں، جو تقریباً ہزار سال تک منوا چکے تھے ـــــ کاش! اسلامیانِ برصغیر اس سرزمین میں اپنی جانِ تمنا اور لیلائے امید ـــــ عروسِ خلافتِ اسلامیہ ـــــ سے ہمکنار ہو چکے ہوتے تو یہ ساری قربانیاں اس راہ میں ہیچ ہوتیں۔ مگر آج تو "اندیشے"، حقیقت بن کر ہمارا منہ چڑھا رہے ہیں۔ اور ؎

اندیشہ تھی جس بات کا اندیشۂ جاں تھا
آنکھوں سے اب اُس حال کو میں دیکھ رہا ہوں

"سقوطِ مشرقی پاکستان" کا یہ داھیۂ کبریٰ اگر کسی طالب العلم کی متجسسانہ اور بے چین طبیعت کو مداوائے زخمِ جگر کی تلاش میں ان قصہ ہائے پارینہ کی طرف لے گئی تو اس "جرأت گستاخانہ" کو قابلِ عفو سمجھ لیا جائے اور یہ اس لیے کہ ؎

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

(ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، مارچ ۱۹۷۲ء)

بابِ پنجم

نوادرِ علمیہ سیاسیہ

مسئلہ قومیت، مولانا مدنی اور سلیمان ندوی

"مولانا (سید حسین احمد مدنی) کا یہ ارشاد کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" قابل اعتراض نہیں، اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام، اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں، کیونکہ ہم سب کرہ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذالقیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔"

مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترکہ مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی "ملت" ہی کی خاطر! جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں انھوں نے فرمایا:

"آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بشانہ رہتے ہیں۔اس سے ہمارے ان کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت، بہرحال پیدا ہوتی ہے۔اس جامعیت کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کون سا لفظ ہے۔ملت و امت کے لفظ تو قطعاً نہیں ہیں اور اب قومیت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیے۔تو کیا اس کے لیے "جنسیت" کا لفظ بول سکتے ہیں۔"

(علامہ سید سلیمان ندوی۔اخبار مدینہ۔بجنور، اپریل ۱۹۳۸ء)

الف:

حضرت شیخ الاسلام کے چند
سیاسی تاریخی بیان و تقاریر

خود نوشت سوانح حیات کا ایک باب

۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے حضرت شیخ الاسلام گرفتار ہوئے اور مراد آباد کی عدالت میں آپ پہ مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے میں حضرت نے جو تحریری بیان دیا تھا، وہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اس کا ایک حصہ جو تحریک آزادی کے سلسلے میں حضرت کے بنیادی افکار سیاسی کا آئینہ دار ہے الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے۔

انسان کی طبعی بات ہے کہ اس کو اپنے وطن عزیز سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ دوسری جگہوں سے نہیں ہوتی۔ جس سرزمین میں وہ پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے خواہ کتنا ہی تکلیف دینے والا ہو مگر انسان کو اس کا کانٹا بھی دوسری جگہ کے پھولوں سے اچھا معلوم ہوتا ہے مشہور شعر ہے ؎

حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

مگر میں جب کہ اسکول میں پڑھتا تھا تو مجھ کو تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی اور ہندوستان کی پرانی تاریخی عظمتوں اور جغرافیائی قدرتی ہمہ گیر برکتوں

نے نہایت گہرا اثر کیا۔ اور پھر اہل ہند کی موجودہ بے کسیوں کا اثر روز افزوں ہوتا رہا۔ طالب علمی کے زمانہ میں اس احساس میں ترقی ہی ہوتی رہی۔ اس زمانہ کے ختم ہونے پر مجھ کو آزاد ممالک عرب، مصر، شام وغیرہ کی سیاحت اور قیام کی نوبت آئی آزاد ملکوں کے باشندوں سے میل جول اور ان کے اوطان کی حالتوں سے آگاہی حاصل ہوئی اس نے میری اپنے وطن سے محبت میں اور زیادتی پیدا کر دی اور اس احساس کو نہایت قوی کر دیا کہ آزادی کس قدر ضروری چیز ہے اور بغیر آزادی کے کسی ملک کے باشندے کس قدر بے بس اور اپنے وطن کی قدرتی فیاضیوں سے محروم ہوتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ یورپین ایشاٹک افریکن آزاد اقوام کس طرح اپنی آزادی کے گیت گاتی ہیں اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانیوں کو ضروری سمجھتی ہیں ان امور کے مشاہدہ کی بنا پر مجھ میں وہ قومی جذبات پیدا ہونے ضروری تھے۔ کہ جن کے ہوتے ہوئے میں ہندوستان کی محبت اور اس کی آزادی میں پیش از پیش سعی اور جد وجہد میں کسی کوتاہی کو روا نہ رکھوں۔ اس پر یہ طرہ ہوا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے مجھ کو میرے آقا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ العزیز کے ساتھ جو کہ مسلمانوں میں آزادی ہند کے سب سے بڑے علمبردار تھے گرفتار کر کے ایک مہینہ ایجپٹ (مصر) میں جیزہ کے سیاسی قید خانہ میں دیکھا۔ وہاں مصریوں کا آزادی پسند طبقہ مقید تھا اس کے بعد مجھ کو ہمراہیوں کے ساتھ مالٹا بھیجا گیا۔ جہاں پر آزاد ممالک یوروپیہ اور ایشاویہ کے چوٹی کے سیاستدان اور فوجی لوگ مقید تھے۔ ڈیڑھ ہزار جرمن اور ڈیڑھ ہزار آسٹرین، بلگیرین، ٹرکش، عرب تھے۔ اس کیمپ میں ہم کو بھی چار برس ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۹ء تک رکھا گیا۔ ہم آپس میں روزانہ ملتے تھے اور دنیا کے تمام حالات اور تمام ملکوں کا مطالعہ اور بحث کرتے تھے۔ ان امور کا قدرتی طور پر جو کچھ نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ اور ضروری تھا کہ ہو۔ ۲۰/۱۹/ جون میں پھر ہم کو ہندوستان لایا گیا جب ہم یہاں پہنچے تو خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ جلیان والا باغ کے واقعات، رولٹ ایکٹ اور مارشل لا وغیرہ کی مختلف جگہوں کی زیادتیوں نے ہندوستان کے تمام باشندوں میں کھلبلی ڈال رکھی تھی اور

با امن جنگ اور نان کو آپریشن کی تحریک زوروں پر تھی میں اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ میرا عقیدہ ہو گیا تھا کہ فرقہ واری کی تنگ دلیوں سے نکل کر تمام ہندوستانی قوم کو اور جملہ باشندگان ہند کو آزاد ہونا ازبس ضروری ہے۔ میں نے بیرونی ممالک میں مشاہدہ کیا تھا کہ دوسرے ممالک میں ہندوستانی خواہ مسلمان ہوں یا ہندو سکھ ہوں یا پارسی وغیرہ وغیرہ ایک ہی نظر حقارت سے دیکھے جاتے ہیں اور سب کو نہایت ذلیل غلام کہا جاتا ہے سب کو ایک ہی قوم دیکھا جاتا ہے اور با مخصوص سپید نسل والے ان سبھوں کو بہت ذلیل جانتے ہیں۔ اور بات بات پر ایسے طعنے اور ذلت آمیز کلمات کہتے اور معاملات کرتے ہیں کہ جن کا تحمل مشکل ہے۔

خلاصہ یہ کہ میں خلافت، کانگریس، جمعیۃ علماء میں داخل ہو گیا اور نان وائلنس کو سیاسی عقیدہ بنا کر تحریک ترک موالات (نان کو آپریشن) کو اپنا عملی پروگرام بنا لیا اسی بنا پر میں ۱۹۱۹ء سے آج تک کانگریس اور جمعیۃ العلماء کا ممبر ہوں، اور ان دونوں کے عقیدے میرے سیاسی عقیدے اور ان کے عملی پروگرام میرے دستور العمل ہیں۔ خلافت کی تحریک اگر آج موجود ہوتی تو میں اس کا بھی ممبر ہوتا۔ میرا قوی اور زوردار سیاسی عقیدہ ہے کہ جس طرح ہر انگریز ہر فرانسیسی، ہر جرمنی ہر امریکن، ہر جاپانی ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اپنے وطن کو آزاد رکھے اور اپنے آپ کو کبھی کسی دوسری قوم کا غلام نہ ہونے دے اور ہر قسم کی قربانی کو اس راہ میں کم سمجھے اور اس جدوجہد کو ایک انگلستان کا اور دوسرے ممالک کا باشندہ اپنا فرض اور اپنے لیے باعث فخر و مباہات سمجھتا ہے بلکہ موت کو اس پر ترجیح دیتا ہے اور اسی کے لیے مسٹر چرچل اور دیگر ذمہ داران برطانیہ کی تقریریں اور تحریریں برابر آتی رہتی ہیں یہی فلسفہ ہندوستانی کا بھی ہے۔ اور ہر ہندوستانی کا خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اس کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے۔ میں نے اس تحریک آزادی اور با امن جدوجہد میں نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور پھر کراچی کے مشہور کیس میں دو برس تک سابرمتی جیل کے اندر نہایت شرافت کے ایام گزارے وہاں سے نکلنے کے بعد بھی برابر میں حسب پروگرام کانگریس اور جمعیۃ علماء اسی جدوجہد میں مشغول ہوں اور مشغول رہا اور سیکڑوں جلسوں وغیرہ میں تقریریں کیں۔ متعدد خطبات اور رسالے لکھے مضامین شائع کرتا رہا۔ اس زمانہ

میں جبکہ جمعیۃ علماء اور کانگریس نے اس جنگ[1] کو ہندوستان کے دروازوں تک پہنچتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا کہ کہیں ان ایام میں جب کہ گورنمنٹ برطانیہ جنگ میں مشغول ہو گی اور اس کی تمام پاور اس کے دشمنوں کے مقابل ہو گی اندرون ملک بدامنی اور لوٹ مار چوری اور ڈکیتی فرقہ وارانہ لڑائیاں پرانی دشمنیوں اور خودغرضیوں کے جذبات ظاہر ہو کر کہیں تمام پبلک اور ملک میں ابتری اور ہلاکت نہ پھیلا دیں۔ ادہر مخالفین برطانیہ اور برطانیہ کی جنگی کاروائیوں کی وجہ سے عام ہندوستانیوں کے لیے جو جو مصائب پیش آئیں گے ان سب کے دور کرنے کے لیے جماعت خدام خلق بنانا ضروری اور سب کو خواہ کسی جماعت کے آدمی ہوں اور کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں منظم ہو جانا ازبس لازمی ہے فرقہ وارانہ جذبات اور پرانی دشمنیاں مختلف عقائد سیاسیہ اور مذہبیہ کو اس وقت کبلا دینا اور سب کو خواہ دیہاتی ہوں، قصبات کے باشندے ہوں خواہ شہری، منظم ہو جانا لازم ہے اس پروگرام کو اس وقت چلانا اور اس کی تلقین کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ میں چند مہینوں سے یہی کام کرتا ہوں اور اسی کی تلقین میں نے بچھراؤں کے اس جلسہ میں کی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اس پروگرام کے متعلق جو کچھ میں نے کہا تھا رپورٹر نے اس کو یک قلم حذف کر دیا ہے میں نے اپنی تقریر میں ان تمام اعتراضات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقریر کی تھی جو کہ فرقہ وارانہ جذبات کے بھڑکانے اور لوگوں کو لڑانے کے لیے ناعاقبت اندیش اور خودغرض لوگ کیا کرتے ہیں اور ان تمام امور کو پیش نظر رکھا تھا جن کی بنا پر باوجود اختلاف عقائد و خیالات متحد اور منظم ہونا ضروری ہو جاتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں لڑائی بھڑائی پرانے زمانے سے بلکہ ہمیشہ سے اسی طرح چلی آتی ہے۔ یا کہا جاتا ہے کہ مذہبی اختلافات اور عقائد کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ آپس میں لڑیں۔ کبھی گانے اور بجانے کا مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی مختلف مقامات کے بلوے دکھائے جاتے ہیں۔ کبھی ہندوؤں کے مظالم پیش کیے جاتے ہیں کبھی مسلمانوں کے مظالم پیش کیے جاتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس میں نے وہ ہلاکت آمیز مصیبتیں جو کہ ایام جنگ ہندوستان میں پیش

---

[1] جنگ عظیم دوم کی طرف اشارہ ہے۔

آنے والی ہیں، اور وہ مصائب جو کہ برطانوی حکام کی پالیسیوں سے ہندوستان کے باشندوں کو انتہائی فلاکت بلکہ ہلاکت کے گھاٹ اتار چکی ہیں، اور جن کا خود انصاف پسند اور انسانیت کے ہمدرد مشہور انگریز اقرار کر رہے ہیں، دکھلائیں کہ ایسی مصیبت کے وقت میں ازبس ضروری ہوتا ہے کہ اپنے جھگڑوں کو چھوڑ دیا جائے اور مشترکہ مصیبت کو دور کرنے کی انتہائی کوشش عمل میں لائی جائے۔ گاؤں میں آگ لگتی ہے، سیلاب آتا ہے تو لوگ اپنے پرانے جھگڑوں، نسلی تمیز، اختلاف عقائد کو بھولا دینا ضرور سمجھ کر سب کے سب آگ بجھانے میں لگ جاتے ہیں۔ یہی حال تم لوگوں کا ہونا چاہیے۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ہندوستانیوں کے موجود مصائب کو جو کہ برطانوی حکام کی غلط پالیسیوں سے پیدا ہوتے ہیں جھٹلاتے ہیں اور غافل لوگوں کو دھوکا دے کر کہتے ہیں کہ یہ باتیں چند سرپھروں کی بنائی ہوئی ہیں واقعہ ایسا نہیں ہے اس لیے میں نے تاریخی شہادتیں (جن میں سے بہت بڑا حصہ مجھ کو یاد بھی ہے اور بہت کثیر حصہ میرے پاس معتبر تاریخوں سے تحریری نوٹ میں ہے) معتبر انگریزوں کے حوالے سے پیش کی تھیں ان کے ناموں اور عبارتوں کو خبط عشوا کیا گیا ہے۔ یہ نوٹ میرے پاس موجود ہیں جن کے ماخذ کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کر سکتا ہوں۔ خلاصہ ان کا ان پالیسیوں پر تنقید کرنا ہے جو کہ غلط کار برطانوی مدبرین نے ہندوستان میں جاری کر کے برطانوی قوم اور برطانوی امپیریلزم اور برطانوی تاریخ کو بدنام کیا ہے۔ اور برطانوی رعایا کی بربادی کا سبب بنتے ہیں۔ کسی پالیسی اور حکمت عملی اور سسٹم پر تنقید کرنا۔ اس پر پروٹسٹ اور احتجاج کرنا اس کو پبلک میں پیش کر کے اس کے خطرات کو بتلانا اور اس کے خراب نتائج کو مشہور کرنا نہ قانوناً جرم ہے اور گورنمنٹ سے نفرت پھیلانا شمار کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ سے انگلستان اور ہندوستان میں یہ طرز چلا آتا ہے۔ اور ایسے زمانہ میں ازبس ضروری ہے۔ ورنہ کوئی گورنمنٹ اندھیر نگری سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس کو سر جان شور، سول میرٹ، ڈبلیو جی پیڈر، سر ولیم ڈگبی، ایس ٹنڈاونسنڈ، لارڈ سالسبری، لارڈ ولیم بنٹنک، برکس، ایچ ایم ہنڈولن، ایڈورڈ ٹامسن، لارڈ کیننگ، ایچ ایچ ولسن، اے اے بروسل، پیٹر فریمین، ڈبلیو ایس بلنٹ، لارڈ نارتھ بروک، مسٹر میکڈانلڈ، وغیرہ کہتے رہے ہیں، یقیناً یہ لوگ

برطانیہ کے دشمن نہ تھے۔ اور نہ برطانوی قوم یا حکومت سے نفرت پھیلانے والے تھے۔ ہاں غلط کار مدبرین برطانیہ کو ان کی غلط کاریوں سے روکنا چاہتے تھے جس کا اقرار آج سر اسٹیفورڈ کرپس اور بہت سے بڑے سمجھدار انگریز کر رہے ہیں اور وہی غلطیاں آج برطانوی قوم اور برطانوی شہنشاہیت کے لیے انتہائی مشکلات کا باعث بنی ہوئی ہیں خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ میں کسی ہندوستانی شخص سے اپنے وطن کی محبت اور اس کی آزادی کی خواہش اور اس کے لیے حسب مقدرت جدوجہد کرنے میں پیچھے نہیں ہوں مگر یہ اسپیچ محض اتحاد اور منظم ہونے اور امن وامان کو پھیلانے کے لیے کی گئی تھی جس کو موجودہ بیان سے ہی ہر ایک سمجھدار بلکہ معمولی سمجھ والا بھی سمجھ سکتا ہے اس کو قابل اعتراض وہی شخص قرار دے سکتا ہے جو کہ اہل ہند کے اتحاد اور اتفاق کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ ہمیشہ ان میں جوتی پیزار ہوتی رہے۔ خواہ ان پر کتنی ہی مصائب کیوں نہ آئیں اور کتنی ہی بربادی پیش کیوں نہ آئے کبھی بھی یہ منظم نہ ہوں اور نہ آپس میں میل جول کریں۔

کیا تعجب کی بات نہیں ہے کہ مجھ کو اتحاد کانفرنس جھنگ مگھیانہ کی صدارت کے لیے سفر کرنے سے روکا گیا اور عین اس تقریر کو جو کہ اس اتحاد کے لیے کی گئی تھی، باعث اعتراض قرار دیا گیا۔ اور پھر اس تقریر میں جو میں نے دستور العمل پیش کیا تھا اس کو حذف کر دیا گیا اور جو نوٹ نقل کیے گئے اُن کو پورا نہیں لکھا گیا۔ اور نہ ان انگریزوں کے صحیح نام لکھے گئے جن سے وہ منقول ہیں۔ نہ ان رسائل یا اخباروں کو بتایا گیا جن میں یہ نوٹ موجود ہیں۔ نہ ان کی تاریخیں بتائی گئیں۔ حالانکہ میری اسپیچ میں یہ سب تھا۔ میری عادت ہے کہ تقریر کرتے ہوئے ان سب چیزوں کا ذکر کیا کرتا ہوں۔ فاضل مجسٹریٹ صاحب نے چونکہ نمبر گیارہ میں میری جملہ تقریر کا خلاصہ نتیجہ نکالا ہے اور یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

"آپ کی تقریر کے شروع کے حصہ میں ایسے جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ جن سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انگریزی سرکار ہندو مسلمان کے لڑانے کا باعث ہے۔ اور آپ کی کل تقریر سے انگریزی سرکار کی طرف سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔"

اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اولاً جناب کو اسی نمبر کی طرف توجہ دلاؤں دوسرے ابتدائی دس نمبروں کی تفصیل بعد میں عرض کروں گا۔ اور چونکہ اس نمبر کے دو حصّے ہیں ایک کا تعلق ابتدائی تقریر سے ہے دوسرے کا کل تقریر سے اس لیے میں اس کو دو حصّوں الف اور ب میں تقسیم کر کے پہلے حصّہ الف کو پھر حصّہ ب کو پیش کر دوں گا۔

(حصّہ الف) جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خود غرض اور نفاق پھیلانے والے کہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑائی بھڑائی ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ مذہب کا یہی تقاضا ہے۔ اورنگ زیب مرحوم بہت متعصب بادشاہ تھا۔ ہندوؤں اور غیر مسلموں پر اس نے مذہب کے تعصب کی بنا پر بہت مظالم کیے ہیں۔ ان دونوں فرقوں میں کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ ان سب اعتراضوں کو دور کرنے اور غلط ثابت کرنے کے لیے میں نے ایک مشہور انگریز سیاح کپتان الگزنڈر ہملٹن کا قول پیش کیا تھا یہ شخص شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا اور یہاں پچیس برس تک مقیم رہ کر اورنگ زیب ہی کے زمانہ میں واپس چلا گیا تھا۔ اس نے اپنا سفر نامہ دو جلدوں میں لکھا ہے چیف جسٹس حیدر آباد دکن "نواب مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب" نے اس سفر نامہ کے مختلف مضامین ترجمہ کر کے رسالہ "ہند عہد اورنگ زیب" میں شائع کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سفر نامہ جلد اوّل ص۱۲۶ و ص۱۲۷ میں در بارۂ شہر ٹھٹھہ ملک سندھ کپتان مذکور کہتا ہے:

"ریاست کا مسلّمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ رواداری پورے طور پر برتی جاتی ہے وہ اپنے برت رکھتے ہیں۔ اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانے میں کرتے تھے جب کہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مُردوں کے ساتھ ستی ہوں۔

(ہند عہد اورنگ زیب میں ص۳)

شہر سورت کے متعلق کپتان مذکور صفحہ ۱۶۲ میں لکھتا ہے کہ "اس شہر میں تخمیناً سو

مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات وطریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے صرف اختلافِ مذہب کی بنا پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے (صفحہ ۸)

جمعیت علمائے ہند اور مسلمانوں کے حقوق

"مسلمانوں کے حقوق کے مسئلے میں قوم پرور مسلمان اور جمعیۃ علماء ہند کبھی ان کمیونل مسلمانوں سے پیچھے نہیں رہی ہے اور جب کبھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ سب سے پہلے انھوں نے ایسی تجاویز مرتب کیں۔ جن میں مسلمانوں کی بہتر سے بہتر حفاظت ہوتی ہے اور وہ ہندوؤں کے مساوی ہو کر ہندوستان کی حکومت میں مساوی حصہ دار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے سہارن پور کے ۱۹۴۱ء والے فارمولے میں اس وقت کے پیش کردہ مسٹر جناح کے مطالبات سے زیادہ بہتر طریقے پر مسلمانوں کا معاملہ حل کیا تھا اور آج بھی جمعیۃ علماء ہند کا لاہور ریزولیوشن مسلمانوں کے لیے کمیونل اور فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے مسلم لیگ کے ریزولیوشن (پاکستان) سے زیادہ مفید اور بہتر ہے۔ وہ اقوام ملک کے درمیان مذہبی اور قومی منافرت بھی نہیں پیدا کرتا اور اجنبی اقتدار کو یہ بھی موقع نہیں دیتا ہے کہ وہ ملک کے حصے بخرے کرکے ہمیں اپنے اقتدار واستحکام کا آلۂ کار بنائے۔"

(مولانا حفظ الرحمن، تحریک پاکستان پر ایک نظر)

ایک تاریخی تقریر

۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگامے جنھوں نے پورے پنجاب کو زیر و زبر کر دیا۔ مسلمان دہلی کی نصف آبادی کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا۔ دہلی کے بعد یو پی کے مغربی اضلاع ان فسادات کا نشانہ تھے۔ جن کا سیلاب مشرقی پنجاب کو تباہ کر کے ان اضلاع کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا، یہاں تک کہ جوالا پور اور دہرہ دون کو تباہ کر چکا تھا۔ لاکھوں پناہ گزین (شرنارتھی)، مشرقی پنجاب سے گزر کر ان اضلاع میں پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ صرف شہر سہارن پور تقریباً پچاس ہزار پناہ گزینوں کی چھاؤنی بنا ہوا تھا۔ جو سرحدی علاقوں اور مغربی پنجاب سے تباہ ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ جن کی ہر حرکت خون آشام تھی اور جن کی پیاس صرف خون مسلم سے ہی بجھ سکتی تھی اور فرقہ پرست رہنماؤں کا یہ مطالبہ آگ پر تیل کا کام کر رہا تھا کہ مشرقی پنجاب کی طرح دہلی اور یو، پی کے مغربی اضلاع کو بھی مسلمانوں سے خالی کرا یا جائے تاکہ پرشارتھیوں کے ان نقصانات کی تلافی ہو سکے جو سندھ اور فرنٹیر میں ان کو اٹھانے پڑے ہیں۔ ضلع مظفر نگر اور میرٹھ کی حالت بھی اس کے قریب قریب تھی۔ مسلمانوں کا راستوں سے گزرنا موت سے کھیلنا تھا۔ ٹرین کے ذریعہ سفر کرنا تو درکنار اگر اسٹیشن پر کوئی مسلمان ہوتا تھا تو ٹرین آنے کے وقت اس کو بھی ہٹا دیا جاتا تھا کیونکہ ٹرینیں تباہ شدہ، نیم برہنہ شرنارتھیوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں اور جس قدر پرشارتھی ٹرینوں کے اندر ہوتے تھے۔ اتنے ہی ٹرینوں کی چھتوں پر بھی ہوتے تھے۔ ہر ایک ٹرین مرقع عبرت ہوتی تھی۔

حکومت نے حفاظت امن کے لیے جو کچھ انتظامات کیے وہ قابل قدر تھے، مگر واقعہ یہ ہے کہ حالات اس کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ اور امن پسند برادران وطن کی خاموش

ہمدردیاں قطرۂ شبنم کی طرح بے حقیقت بن گئی تھیں۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر ضلع سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ اور دہلی سے مسلمانوں کا تخلیہ ہو جاتا تو پھر پہر شارتھیوں کا سیلاب ہندیونین کے آخری کناروں تک پہنچتا اور پورے ہندیونین میں مسلمانوں کا نام ونشان ملنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ اس نازک ترین وقت میں سفینۂ ملت کا بوڑھا ناخدا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند اپنے خلوت کدہ سے برآمد ہوا۔ درسگاہ کو چھوڑا اور ضلع مظفر نگر اور سہارنپور کے قصبات و دیہات کا دورہ کر کے مسلمانوں کو صبر و استقامت کا درس دیا افسران حکومت کو بیدار کیا اور ان شکوک وشبہات کو دور کیا جو غیر مسلم قوم پرور اور کانگریسی کارکنوں کے دماغوں کو مسموم کر چکے تھے۔ اس دور میں آپ نے کیا درس دیا اور آپ کا پیغام کیا تھا، افسوس یہ ہے کہ کوئی نامہ نگاران کو قلم بند نہ کر سکا۔ صرف ایک تقریر قلم بند ہو کر شائع ہوئی ہے جو آپ نے دیوبند کی جامع مسجد میں فرمائی تھی اس کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

"۱۵ اگست کے بعد بہت بڑی حد تک غیر ملکی حکومت کے جوئے سے آزاد ہو چکے ہیں مگر انگریزی سیاست اب تک ہمارے اندر کام کر رہی ہے۔ حکومت کی پرانی مشین اسی طرح موجود ہے۔ پرانی حکومت کے کارندوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں نے ہمارے وطن کو فساد اور قتل و غارت گری کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ ان کی سازشوں کے سامنے حکومتیں مفلوج اور ملک کے حقیقی خیر خواہ بے بس ہو گئے ہیں اب یہ تمہاری ہی طاقت ہے جو ان پر فتح پا سکتی ہے اگر تم حالات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لو اور اللہ پر بھروسہ کر کے فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو اپنے وطن اور عوام کے امن کو تباہی کے اس جہنم سے نکال سکتے ہو۔ عوام کی طاقت ان سازشوں کو ملیامیٹ کر سکتی ہے"۔

مسلمانوں کو رحم وکرم کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اسلام محبت، رحمت، امن اور سلامتی کا پیغام ہے، اسلام ایک لمحہ کے لیے بھی اس درندگی کو برداشت نہیں کر سکتا، جو لوگ مذہب کے نام پر یہ درندگی پھیلا رہے ہیں وہ اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ اسلام اور قساوت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے"

آپ نے قرآن پاک اور احادیث سے اس مضمون کے متعلق بہت سے شواہد پیش کیے پھر استقامت کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

"آج خوف اور بزدلی کا جو عالم ہے اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے۔ گھروں میں بیٹھے ڈرتے ہو، راستہ چلتے ڈرتے ہو، اپنی بستیوں میں رہتے ہوئے ڈرتے ہو، کیا تم انہیں بزرگوں کے جانشین ہو، جو اس ملک میں گنی چنی تعداد میں آئے تھے جب یہ ملک دشمنوں سے بھرا ہوا تھا آج تم چار کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہو، یو، پی میں تمہاری تعداد ۸۰ لاکھ سے زیادہ ہے پھر تمہارے خوف کا یہ عالم کہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو، آخر کہاں جا رہے ہو، کیا تم نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈھ لی ہے جہاں خدا کی گرفت سے بچ سکو گے، جہاں تم کو موت نہیں پا سکے گی موت سے بچ کر کہاں جا سکو گے۔

... میرے بھائیو اور عزیزو! موت ڈرنے کی چیز نہیں۔ ایک سچا مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا، موت کی تمنا کو اسلام نے صداقت کا معیار قرار دیا ہے، کفار کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا ہے فتمنوا الموت ان کنتم صٰدقین (موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو) اگر تمہیں اسلام کی سچائی پہ یقین ہے تو موت سے تمہارا یہ خوف بے معنی ہے الموت جسر یوصل الحبیب الی حبیبہ موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر اسلام کے نام پہ جان دے دینا موت نہیں زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ۔ جو اللہ کے راستے میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو بلکہ یہ لوگ زندہ ہیں۔

ہمیں ان کی زندگی محسوس نہیں ہوتی۔

قرآن شریف اور احادیث سے شہادت کے مراتب اور فضائل بیان کرنے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"اس لیے جبن اور خوف اپنے دل سے نکال دو۔ اسلام اور جبن ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ صبر واستقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو، کبھی فساد کی ابتدا نہ کرو، اگر فسادی تم پر چڑھ آئیں تو اُن کو سمجھاؤ لیکن اگر وہ نہ مانیں اور کسی طرح باز نہ آئیں تو پھر تم معذور ہو، بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو اور اس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ تمہاری تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور اپنی عزت وحرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو یہ عزت اور شہادت کی موت ہوگی"

وفاداری اور بے وفائی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"اس ملک کو تم نے اپنے خون سے سینچا ہے آئندہ بھی اس کو اپنے خون سے سینچنے کا عزم رکھو، یہی ملک کی حقیقی وفاداری ہے۔ اس ملک پہ تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے باشندہ کا، اور اس کی خدمت کی ذمہ داری تم پہ بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کسی دوسرے شخص پہ عائد ہو سکتی ہے، وفاداری کے اظہار کا جو ڈھنگ تم نے اختیار کیا ہے وہ نہ مفید ہے نہ ضروری۔ آج اس ملک کے ساتھ اظہار وفاداری یہ ہے کہ ترقی پسند جماعتوں کا ساتھ دو، فرقہ پرستی کے جرائیم کا خاتمہ کرو۔ وفاداری کے پُرانے طور وطریقے اب بدل چکے ہیں اب افسرانِ حکومت یا حکومت کے ساتھ وفاداری کے کوئی معنٰے نہیں۔ جب تک اس ملک میں جمہوریت کا نام و نشان باقی ہے حکومت ہم خود ہیں، وزراءِ حکومت کو ہم نے اپنے ووٹوں سے منتخب کرکے بھیجا ہے تاکہ وفاداری کے ساتھ ملک اور اہلِ ملک کی خدمت کریں۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے کہ وہ عوام کے

وفادار اور ملک کے سچے خیر خواہ اور خادم ہیں۔ ہم کو ان سے باز پرس کا حق ہے، پھر اس غلامانہ اظہارِ وفاداری کا کیا مطلب ؟

مختلف سمتوں سے مسلمانوں کی وفاداری کا سوال اٹھایا جا رہا ہے اور یہ سوال کچھ اس طرح سامنے لایا جاتا ہے۔ کہ گویا انڈین یونین میں مسلمانوں کو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ کسی غیر وفاداری کا نتیجہ ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا غیر وفاداری ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں نے کی ہے ملک کی تقسیم سے پہلے بمبئی، بہار، گڑھ مکتیسر اور یو، پی کے مختلف مقامات کے لوگوں نے جو دکھ اٹھائے ہیں وہ کس غیر وفاداری کا نتیجہ تھے اور تقسیم کے بعد دہلی اور مشرقی پنجاب کی تباہی عوام کی کس بے وفاداری کا تھی وہ کیا غداری تھی جس کی سزا میں ان کو خانہ ویرانی اور تباد لہ آبادی کا تحفہ دیا گیا، اور اگر یہ سب کچھ مسلمانوں کی غیر وفاداری کا صلہ تھا تو کلکتہ، نواکھالی، پٹڑا، مغربی پنجاب اور سرحد میں ہندوؤں اور سکھوں نے جو مصائب برداشت کیے ہیں وہ کس جرم کی سزا تھے۔ ملک کی تقسیم یقیناً زبردست نقصانات کا باعث ہوئی۔ لیکن اس کو غیر وفاداری کا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر یہ غیر وفاداری کا معیار ہے تو منظور کرنے والوں پہ بھی اس کی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی مطالبہ کرنے والوں پہ عائد ہوتی ہے۔ قوم پرور مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی وہ کونسی فرقہ وار یا غیر فرقہ وار جماعت تھی جس نے برطانوی حکومت کے اس تحفہ کو قبول نہ کیا ہو۔ جمعیت علماء ہند کے رہنما آخری لمحہ تک چیختے رہے کہ تقسیم منظور کر کے ملک کو تباہی کے جہنم میں نہ جھونکو۔ ہندوستان کا وہ کونسا وفادار تھا جس نے جمعیت علماء کی آواز کو سُنا۔

تقسیم کے حق ووٹ دینا اگر غیر وفاداری کا معیار سمجھا گیا ہے تب بھی میں پوچھتا ہوں کہ ریاستی عوام (الور، بھرتپور وغیرہ کے باشندوں) کا جُرم کیا تھا جس کی پاداش میں اُن کو خانماں بربادی میسر آئی۔ یہ غریب تو ووٹ دینے کے بھی قصوروار نہ تھے۔

پھر ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام میں کتنے لوگوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ زیادہ سے زیادہ آبادی کے دس فی صدی حصہ کو مالی اور تعلیمی معیار کی بناء پر رائے دینے کا حق دیا گیا تھا یعنی دس کروڑ مسلمانوں میں سے صرف ایک کروڑ کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ اگر یہ تعداد متفقہ طور پر تقسیم کے حق میں فیصلہ کرتی تب بھی مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ نہ ہوتا ایسا فیصلہ تو صرف رائے دہی بالغان کے اصول پر ہی حاصل کیا جاسکتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ انتخابات میں ان تمام دفتری سازشوں اور مداخلتوں کے باوجود جو پچھلی حکومت اور اس کے کارندوں کی طرف سے حامیان تقسیم کے حق میں کی گئی تھیں تقسیم کی حمایت میں پینتالیس لاکھ ایک ہزار ایک سو چھپن ووٹ حاصل کیے گیے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ دس کروڑ مسلم عوام میں سے صرف ساڑھے چار فی صدی کی رائے کو کس طرح پوری قوم کے سر تھوپا جاسکتا ہے اور کس طرح اس کی وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

بلا شبہ ملک کے ساتھ وفاداری ملک کے ہر بسنے والے کا قومی فریضہ ہے لیکن اس وفاداری کا معیار کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں ہے۔ کیا ہندوستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے اپنا خون نہیں بہایا۔ کیا مسلمانوں کے سوا سبھی لوگ ہندوستان کے وفادار رہے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی پالیسی کے خلاف آج جو کچھ کیا جارہا ہے کیا وہ ملک اور حکومت کے ساتھ وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کرتا تاریخ کو جھٹلاتا ہے۔ اس موقعہ پر کسی مذہبی فرقہ کی وفاداری کے سوال کو زیر بحث لاتے کے معنے اس کے سوا کچھ نہیں کہ تباہی کے بنیادی اسباب کی طرف سے چشم پوشی کی جائے۔ اور ملک کی رجعت پسند طاقتوں کے مقابلہ میں اپنی شکست اور بے بسی کے لیے اس سوال کو آڑ بنایا جائے۔ عوام کی موجودہ تباہی اور ملک کی پُرامن ترقی کو روکنے کی ذمہ داری صرف انہیں رجعت پسند طاقتوں پر ہے جنہوں نے فرقہ وارانہ بنیاد پر عوام میں منافرت پیدا کی اور اس نفرت کو اپنے مقاصد کا ذریعہ بنایا۔ یہ عناصر کسی ایک فرقہ تک محدود نہیں تھے اس لیے کسی خاص مذہبی گروہ کی وفاداری پر شک و شبہ کیلیے کوئی وجہ نہیں ہے۔"

خطبۂ صدارت (تقریری)

ناگپور کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۹ء میں

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کو ابھی پورے دو سال بھی نہیں گزرے تھے۔ وطن عزیز کی فضا میں تلاطم موجود تھا۔ طرح طرح کی آوازیں تھیں اور طرح طرح کے تاثرات۔ اس وقت ناگپور کانفرنس میں حضرت اقدس نے جو خطبۂ صدارت (زبانی) ارشاد فرمایا وہ اگرچہ وقتی تھا۔ مگر افادیت کے لحاظ سے وہ گویا صحیفۂ لقمان تھا۔ جس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور اس سے ہمیشہ سبق لینا چاہیے۔ ذیل میں خطبہ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا:۔

"حضرات! جمعیت علماء ہند کوئی نئی جماعت نہیں ہے جو پچھلے دو چار برس میں قائم ہوئی ہو بلکہ یہ وہی جماعت ہے جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے آزادئ ہند کی جدوجہد شروع کی تھی اس کی بنیاد ۱۸۰۳ء میں رکھی گئی تھی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں آئے تھے جن کو بادشاہ دہلی نے بطور ملازم رکھا تھا۔ کہ وہ بنگال بہار اڑیسہ وغیرہ کی مالگذاری وصول کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کریں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے خود اس کا اقرار کیا ہے لیکن انگریز نے آہستہ آہستہ ایسی تدابیر اور حیلے اختیار کیے کہ ان کی قوت بڑھتی گئی اور بادشاہ دہلی سے آہستہ آہستہ کچھ اختیارات حاصل کر کے انھوں نے اپنے پیمان اور وعدوں کو توڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے شہنشاہ دہلی کو بالکل مجبور اور بے بس کر کے یہ لکھوا لیا کہ آج سے تمام ملک کا انتظام کمپنی کے سپرد ہوگا۔

ہندوستان انگریزوں کی آمد سے پہلے نہایت خوشحال اور دولت مند ملک تھا۔

یہاں ضروریات زندگی اور سونے چاندی کی اس قدر افراط تھی کہ جس کی نظیر دنیا بھر میں نہ ملتی تھی۔ یہاں صرافوں کی دوکانوں پر سونے چاندی کے ایسے ڈھیر لگے رہتے تھے .... جیسے کسی منڈی میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں ۱۶۱۲ء میں سونے سکے ۲۰۰ سکے رائج تھے۔ اکبر اور جہانگیر کے دور میں نو قسم کی اشرفیاں چلتی تھیں۔ جن میں سب سے بڑی اشرفی ایک سو دو تولے کی ہوتی تھی۔ اناج کی یہ کثرت تھی کہ ایک روپے کا چار من گیہوں ملتا تھا۔ اور ایسا ہی دوسری ضروریات زندگی کا حال تھا۔

انگریز کی لوٹ مار :-

انگریزوں نے ہندوستان آنے کے بعد نہایت بھیانک اور ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان کو لوٹنا شروع کیا، آہستہ آہستہ حکومت پر قبضہ کیا۔ پھر بھاری بھاری ٹیکس لگائے، لگان اور مالگزاریاں مقرر کیں۔ تمام بڑے عہدوں پر انگریز افسروں کو مقرر کیا اور ہندوستانیوں کو صرف ادنیٰ درجہ کی ملازمتیں دیں اور جابرانہ طریقوں سے ہندوستان کی تمام دولت وثروت کو لوٹ کر انگلستان پہنچا دیا۔

ان بڑھتے ہوئے مظالم اور زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے حضرات علماء نے یہ محسوس کیا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان سے جلد نہ نکالا گیا تو ہندوستانیوں کی تباہی و بربادی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہندوستان کی آزادی ختم ہو چکی ہے ہم سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کہ جلد بدیشی حکومت کو ہندوستان سے نکالیں۔ یہ فتویٰ آج بھی فتاویٰ عزیزیہ میں موجود ہے اور اسی پر جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اسی وقت سے آزادی ہند کی تحریک شروع ہوئی ہے۔

جمعیۃ علماء کے کارنامے :-

جمعیۃ علماء اس وقت سے برابر اپنی جدوجہد میں مصروف رہی شروع میں اس کی تحریک خفیہ طور پر چلائی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں صوبہ سرحد کے اطراف میں مورچہ لگایا گیا جہاں چھ سال تک برابر انگریزوں سے جنگ ہوتی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی اور ۱۹۱۴ء تک اسے اس حد تک پہنچا دیا۔ اگر اس وقت کچھ ملک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔ اسی دوران میں ۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوتی جو کسی ایک فرقہ کی جماعت نہ تھی بلکہ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی وغیرہ سب شریک تھے۔

سمجھ دار مسلمانوں اور علمائے کرام نے جو پہلے ہی سے آزادی وطن کے لیے جدوجہد کر رہے تھے کانگریس کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر انگریزوں کو نکالنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں۔ ان میں سے بہت سوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ کالے پانی کی سزائیں دی گئیں۔ سخت سے سخت قید میں رکھا گیا۔ لیکن وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی نہ گھبرائے۔ اگر تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو آزادئ وطن کی راہ میں کسی کی بھی قربانیاں اتنی نہیں ہیں جس قدر علماء کرام کی ہیں۔

انگریز کی آخری کوشش :-

بہرحال ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی اس تحریک کو کامیاب ہوتا دیکھ کر انگریزوں نے آخری کوشش یہ کی کہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا جائے بدقسمتی سے ہمارے بہت سے بھائی انگریزوں کے اس فریب کا شکار ہوئے۔ جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی بھیانک صورت میں رونما ہوا۔ جس میں لاکھوں ہندو مسلمان قتل ہوئے۔ لاکھوں تباہ و برباد ہوئے۔ ہزارہا عورتوں کی عصمت دری ہوئی، اور کروڑوں

روپیہ کا مال لوٹا گیا اور برباد کیا گیا۔ اور آج تک ان مصیبتوں سے چھٹکارا نہ ملا۔

آج کچھ بے وقوف کہتے ہیں کہ جمعیۃ علماء فرقہ پرست جماعت ہے۔ حالانکہ میں نے آپ کو بتایا کہ جمعیت علماء کوئی نئی جماعت نہیں ہے وہ ہمیشہ سے آزادی وطن کے لیے سب فرقوں کی مشترک جماعت کانگریس کے ساتھ قربانیاں دیتی رہی ہے اس نے کبھی فرقہ واریت کو اپنے اندر نہ آنے دیا۔ اس کے فارمولے، تجاویز اور ریکارڈ موجود ہیں۔ دیکھو اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ تمام فرقے باہم میل جول کے ساتھ ملک کی خوشحالی کے لیے کوشش کریں۔ اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہیں۔ جیسے وہ انگریزوں کے آنے سے پہلے مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے گھر، دکانیں، کھیت اور باغات کے معاملات لین دین۔ ایک دوسرے سے ملے جلے ہوئے تھے، ان میں باہم کوئی نفرت اور دشمنی نہیں تھی۔ بے شک بادشاہ اور رجواڑے لڑا کرتے کرتے تھے مگر وہ حکومتوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ ان سب کی فوجوں میں سب فرقوں کے لوگ ہوتے تھے۔

حضرت مولانا نے تقسیم کے بعد پیدا شدہ حالات پہ روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:۔

"محترم بزرگو! ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں مرے۔ ہم سب کو یہیں رہنا ہے۔ ہماری ترقی اور خوشحالی آپس کے اتحاد اور اتفاق سے ہو سکتی ہے۔ لڑائی ہمیشہ تباہی لاتی ہے۔ ہم بگڑیں گے تو ہمارا ملک بگڑے گا۔ ہم نہتے ہیں تو ہمارا ملک بھی نہتا ہے۔ ہم سب ہندوستانی ہیں۔ اور ایک قوم ہیں۔ اس لیے ہم سب کو بھائی بھائی کی طرح محبت کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے۔ جیسے ہم پہلے رہا کرتے تھے۔

پریشانیاں جلد ختم ہوجائیں گی!

مسلمانو! یہ ٹھیک ہے کہ آج تقسیم کے بعد ہماری حالت بہت نازک ہوگئی ہے اور ہمیں طرح طرح کی پریشانیاں درپیش ہیں۔ لیکن یہ سب پریشانیاں جلد ختم ہوجانے والی ہیں۔ اور آخر ہم سب کو یہیں مل جل کر رہنا ہے۔ ہندوستان کی حکومت ہندو حکومت نہیں ہے وہ غیر مذہبی حکومت ہے۔ وہ سب فرقوں کو ان کے برابر حقوق دیتی اور دینا چاہتی ہے۔ اور یہی اس کا اعلان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیچے درجے کے بعض افسر اور سرکاری ملازم اپنی الگ پالیسی چلاتے ہیں لیکن یہ اسی مشین کے پرزے ہیں۔ جو انگریز نے چلائی تھی۔ اور جس کے ذریعہ وہ حکومت کرتا تھا۔ لیکن انگریز ہندوستان سے جا چکا ہے اس کا اثر بھی جو کچھ باقی ہے وہ جاکر رہے گا۔ اس لیے ہمیں گھبرانا اور بھاگنا نہیں چاہیے۔ بلکہ پورے صبر اور استقلال کے ساتھ اپنا وطن سمجھتے ہوئے یہیں رہنا چاہیے۔ کیا یہاں سے بھاگ کر تم کو مصیبتوں سے بچالے گا؟ تم حیدرآباد بھاگ کر گئے تھے تو اس کا نتیجہ شرمندگی کے سوا کیا ہوا۔ اور آخر تم یہیں لوٹ کر آئے۔ اس لیے تمہیں بتاتا ہوں کہ اگر تم صبر و استقلال کے ساتھ رہو گے، سچائی پر قائم رہو گے، سب کی بھلائی اور بہتری چاہو گے، تو خدا تمہارے ساتھ ہوگا، اور جس کے ساتھ خدا ہو پھر اس کو کس چیز کا ڈر ہوسکتا ہے؟

آزمائش:-

تم مسلمان ہو، تمہارے باپ دادا تو موت کے ایسے شیدائی تھے کہ اس کی آرزو کیا کرتے تھے۔ اور تم آج موت اور پریشانیوں سے ڈرتے ہو؟

اسی لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اگر تم صبر اور استقلال کے ساتھ یہاں رہو گے اور سچائی کی راہ پر قائم رہو گے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔ چونکہ قرآن کریم نے تمہیں بار بار اس کی تاکید کی ہے۔ اس کے بعد اگر تم کہیں کسی ظالم کے ہاتھ سے مارے

بھی جاؤ تو تمہیں اس موت سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ چونکہ وہ شہادت کی موت ہوگی اور تم جانتے ہو کہ شہادت کی موت کا کتنا بلند رتبہ ہے۔ جس کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بار بار آرزو کی اور فرمایا میرا دل چاہتا ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، تو پھر کیوں تم ایسی موت سے ڈرتے ہو مصیبتیں آیا ہی کرتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایمان والو تمہیں دنیا میں ہر طرح سے آزمایا جائے گا لیکن اگر تم نے صبر کیا اور استقلال کے ساتھ سچائی کی راہ پر قائم رہے تو پھر تمہارے ساتھ خدا کی مدد ہوگی اور تمہارے لیے کامیابی کی خوشخبری ہوگی۔

جمعیۃ علمار کا نصب العین!

تقریر ختم کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا۔

بھائیو! یہی وہ تبلیغ اور تعلیم ہے جو اب جمعیۃ علمار کا نصب العین ہے۔ وہ مسلمانوں کی جہالت بے علمی اور مذہب سے ناواقفیت کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اور اسی کے لیے برابر کوشش کر رہی ہے اگرچہ کچھ مالی مشکلات کی وجہ سے اور کچھ کارکنوں کی کمی کی وجہ سے وہ ایسی کوشش نہ کر سکی جیسی ہونی چاہئے تھی۔ لیکن آپ حضرات کی مدد سے امید ہے کہ وہ پوری کوشش کرتی رہے گی۔ پس آج یہی مذہبی خدمات اور تعلیم کی ترویج اُس کا نصب العین ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ بھی اُس کے نصب العین کو اپنائیں۔

دینی اور دنیاوی تعلیم کو مسلمانوں میں پھیلائیں جا بجا مدرسے اور نائٹ اسکول قائم کریں۔

دین کو پھیلائیں اور سب کو دین کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔

اسی نصب العین کی طرف جمعیۃ علماء آپ کو بلاتی ہے سیاسی نصب العین تو حاصل ہو چکا ہے۔ ملک برٹش راج آزاد ہو گیا ہے۔ اب بھی جو سیاسی امور ہیں وہ جمعیۃ علمار کے پلیٹ فارم سے نہیں بلکہ مشترک جماعت کے پلیٹ فارم سے انجام دیئے جائیں گے اور ان میں مسلمانوں کو برابر حصہ لینا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ جمعیۃ علمار کے بھی ممبر بنیں اور کانگریس کے بھی تاکہ وہ سیاسی معاملات میں کانگریس کی راہ سے حصہ لے سکیں اور مذہبی خدمات میں جمعیۃ علمار کی راہ سے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

ب:

حضرت شیخ الاسلام کے چند سیاسی تاریخی خطوط

مکتوب الیہ نامعلوم

محترم المقام! زید مجدکم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک؟ والا نامہ مع "آواز حق" (محمد زمان صاحب) فتویٰ خانقاہ تھانہ بھون دربارہ۔ کانگریس ولیگ وغیرہ باعث سرفرازی ہوا۔ مجھ کو ایسی تحریر اور وہاں کے ایسے فتوے پر تو تعجب نہیں ہوا مگر آپ کے بھولے پن پر ضرور سخت تعجب ہوا کہ آپ جیسا مخلص اور سمجھ دار شخص ایسی کھلی ہوئی غلطی میں پڑ گیا اور اضطراب و بے چینی کی رو میں بہنے لگا۔

(۱) ... میرے محترم! جب سے تحریک آزادی پر ہندوستان گامزن ہوا ہے اور مسلمانوں کو اس طرف قدم بڑھانے کی توجہ دلائی گئی ہے کب خانقاہ تھانہ بھون نے ایسے مضامین شائع نہیں کیے اور کب ایسی آیتیں نہیں سنائیں۔ ہم نے ترک موالات کی تحریک پر یہ اور اسی قسم کی آیتیں پیش کر کے انگریزی حکومت سے مقاطعے کی تجویز مسلمانوں کے سامنے رکھی تو ان آیتوں کی تاویلات کی گئیں (خواہ وہ صحیح تھیں یا غلط)۔ اور بتلایا گیا کہ ہم انگریزوں کو دلی دوست نہیں بناتے، ہم ان کے ساتھ صرف اشتراک عمل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر آج ہم کو وہی آیتیں کانگریس سے مقاطعہ کرنے کے لیے سنائی جا رہی ہیں۔

(۲) ... کانگریس کو فرض کر لیا گیا ہے بلکہ یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ خالص مذہبی اور ہندو

جماعت ہے اس لیے اس سے دور رکھنے کے لیے ہم کو کفار اور مشرکین سے موالات کی آیتیں بطور وعظ سنائی جاتی ہیں۔آپ ہی بتلائیے کہ یہ دونوں نظریے یعنی۔

اول یہ کہ وہ خالص مذہبی جماعت ہے اور

دوم یہ کہ وہ ہندو جماعت ہے۔ یہ صحیح ہیں یا نہیں؟

امر اول کے متعلق یہ عرض ہے کہ وہ خالص سیاسی جماعت ہے مذہبی نہیں ہے۔ اس کی تجاویز اور اصول پر غور فرمائیے اگر موالات ایسی غیر مذہبی جماعت سے ممنوع ہے تو ٹاؤن ایریا، میونسپل بورڈ، لوکل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلی، ایجوکیشنل بورڈ، تجارتی بورڈ، زمیندار پارٹی، مارشل وغیرہ جس میں اکثریت یا کلیت غیر مسلم کی ہوتی ہے اور سول سروس کے جتنے محکمات اور حکومت کے جتنے دوائر ہیں اور جن میں سراسر حکومت غیر مسلمہ کی امداد ہوتی ہے۔انگریزی اقتدار کے تحفظ ہی نہیں بلکہ اس کے استحکام اور بڑھانے کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔وہ سب کیوں جائز یا واجب یا حلال ہیں اور مسلمان ان میں کیوں بھیجے جاتے ہیں اور آپ کیوں ریلوں میں، بازاروں میں، اسٹیشنوں پر اور دوسری مجالس میں جن میں اکثریت یا کلیت کفار کی ہوتی ہے، جاتے ہیں اور آپ کیوں ان بورڈوں وغیرہ میں لاکھوں روپے صرف کرنے اور تکالیف شاقہ کے بوجھ اٹھانے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں؟اور

اور امر ثانی کی نسبت یہ عرض ہے کہ اگر کانگریس خالص ہندو جماعت ہے تو کیوں اس کے ممبر مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، یہودی، جینی، بودھی وغیرہ بنتے اور حصہ لیتے ہیں اور ہندوستان کے ہر باشندے کو اس میں ہر طرح حق دیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اور کیوں وہ اپنے بنیادی حقوق میں تمام مذاہب کو مذہبی آزادی دیتی ہے اور ہر اقلیت کو اس کے کلچر اور زبان وغیرہ کے متعلق مکمل طریقے پر آزاد کرتی ہے۔کیوں اس کی کرسی صدارت پر کبھی عباس طیب جی، کبھی ڈاکٹر انصاری کبھی مولانا محمد علی، کبھی مولانا ابوالکلام آزاد، کبھی حکیم اجمل خان وغیرہ براجتے ہوئے

نظر آتے ہیں۔

(دیکھیے فنڈامنٹل، نہرو رپورٹ، کانگریس کی مفصل تواریخ وغیرہ)

باقی رہا یہ امر کہ اس میں ہندو بکثرت ہیں مسلمان تھوڑے ہیں تو اس میں مسلمانوں کا قصور ہے یا کانگریس کا؟ حالاں کہ اس نے اپنا دروازہ ہر باشندہ ہندوستان کے لیے کھول رکھا ہے۔ یہ کہنا کہ اس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے تو بتلائیے کہ اس دارالکفر ہندوستان کی کون سی مجلس ملکی اور اقتصادی، تجارتی، زراعتی، سیاسی وغیرہ ایسی ہے جس میں غیر مسلم کی اکثریت نہیں ہے اور جس میں اکثریت ہی کے قواعد پر فیصلہ نہیں ہوتا اور اکثریت اپنی ہی راے نہیں چلاتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندو متعصب ہے اور اکثریت کی بنا پر اپنی متعصبانہ آرا کو منواتا ہے تو بتلائیے کہ جس قدر بھی لوکل باڈیز ہیں ان سب کے ہندو کیا غیر متعصب ہیں۔ صرف کانگریس ہی کے متعصب ہیں اور کیا تمام باڈیز میں مہا سبھائی ممبروں کے موجود ہونے بلکہ اکثریت پر فائز ہونے کی بنا پر کانگریس کیا اہون اور اخف نہیں ہے۔ پھر اس کے کیا معنی ہیں کہ اوروں کو تو ضروری الشمول قرار دیتے ہیں اور اس کو حرام؟

میرے محترم! ایک غلطی سرسید نے کرائی تھی کہ جب سے ہندوستانی اقوام میں سیاسی بیداری شروع ہوئی (یعنی ۱۸۸۴ء سے) اس وقت سے مسلمانوں کو علاحدہ رکھ کر وہ مسلمان جو کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے سیاسیات کا دیوتا اور معلم تھا اور ہندو قوم اس کے سامنے طفل مکتب تھی (جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی رپورٹ میں انگریزوں نے تسلیم کیا ہے) آج وہ ہندو قوم کے سامنے طفل مکتب بھی نہیں مانا جاتا۔ دوسری غلطی آج کل کے لیڈر اور ان کے ہمنوا علما کر رہے ہیں۔ آج کانگریس سے جدا کر کے تمام مسلم قوم کو اچھوتوں سے بھی زیادہ ہندوستان میں ذلیل اور بے دین بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک معمولی غلطی نہیں ہے، انتہائی شرمناک غلطی ہے۔ کیجیے اور کرائیے۔ دس پندرہ برس کے بعد خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

(۳) .... رہا مسلمانوں کی تنظیم کا سوال تو یہ مسئلہ بجائے خود ہمیشہ اور ہر حال میں لازم اور ضروری ہے۔ مگر اس اسپرٹ میں جو کہ مسلم لیگ کے اہل حل وعقد کرنا چاہتے ہیں کہ کانگریس کے خلاف محاذ جنگ قائم کیا جائے اور ہر امر میں مخالفت ہر قسم کی کی جائے۔ انتہائی مضرت رساں اور تباہ کن ہے۔ کیوں نہ آپ کی منظم قوت کانگریس کے اندر اور باہر موجود کر دی جائے جیسی کہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں کی گئی، اگرچہ غیر مکمل تھی۔ کانگریس کے ماتحت مشترکہ مفاد کی جدوجہد کی جائے اور خصوصی مفاد کی جدوجہد اپنی تنظیمی کارروائی سے اندر اور باہر عمل میں لائی جائے جیسے کہ سکھ، پارسی اور دوسری اقلیتیں کر رہی ہیں اور باوجود معمولی اور نہایت کم اقلیت ہونے کے کانگریس میں اپنا لوہا منواتی رہتی ہیں۔

(۴) .... اپنے اور اپنے مذہب و کلچر اور دیگر حقوق کے شرط کرانے کا سوال اگر فنڈامنٹل اور بنیادی حقوق کے تسلیم کردہ اعلانات موجود یا کافی نہیں ہیں۔ تو ان کا مطالبہ اپنی جگہ پر جائز اور صحیح ضرور ہے اور ہر جگہ اکثریت پر لازم ہے کہ اقلیت کو مطمئن کر دے۔ مگر کانگریس کے داخلے کو اس پر موقوف کرنا اس وقت میں صحیح ہو سکتا ہے جب کہ مشترکہ مفاد کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں پر مثل دیگر غیر مسلم اقوام ضروری نہ ہو۔ اور انگریزی موجودہ اقتدار سے مسلمانوں کو اس قدر نقصان نہ پہنچتا ہو جتنا کہ غیر مسلم اقوام کو پہنچ رہا ہے۔ اور اگر معاملہ اس کے خلاف ہے، جیسا کہ واقعہ ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ شرطیت کا ڈھونگ کس طرح ہمارے لیے سبک دوشی فرائض کا ذریعہ بن سکے گا۔ کیا اگر کانگریس نے شرطیت کا انکار کر دیا تو مسلمانوں پر مشترکہ مفاد کے لیے جدوجہد کرنا اور آزادی کے حاصل کرنے میں سعی بلیغ کرنا، انگریزی آہنی پنجے کو ڈھیلا کرنا ضروری نہ ہو جائے گا؟ اور کیا مسلمانانِ ہند تمام غیر مسلم ہندوستانی آبادی سے علاحدہ ہو کر برطانیہ سے آزادی حاصل کر سکیں گے اور کیا مسلمانوں کو اور مدت میں ہندوستان میں انگریزوں کے دائمی باقی رکھنے کی جدوجہد کرنی جائز ہوگی اور کیا مسلمان

ایسا کرنے کے لیے تیار ہوں گے اور کیا انگریز مسلمانوں کی خاطر ہندوستان میں اپنا موجودہ اقتدار باقی رکھیں گے اور رکھ سکیں گے اور کیا یہ معاملہ مسلمانوں کے لیے مستقبل میں انتہائی بربادی کا باعث نہ بنے گا؟

میرے محترم! یہ زمانہ سرکاٹ کر حکومت کرنے کا نہیں ہے۔ نیز اس وقت شخصی حکومت کے پیدا ہونے اور کامیاب ہونے کا امکان بہ ظاہر نہیں ہے۔ یہ زمانہ سروں کو گن کر اور ووٹوں کو شمار کر کے جمہوریت اور کثرتِ آرا پر فیصلہ کرنے کا ہے ستائیس کروڑ غیر مسلموں میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یعنی ایک زبان کو بتیس دانتوں میں زندہ رہنے اور بسر کرنے کا سوال ہے۔ ذرا غور و فکر سے کام کیجیے۔ اگر میری عرض آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر میری رائے پر اناللہ پڑھیے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے زیادہ کہنے سے معذور ہوں۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ،
۱۱۔ شوال ۱۳۵۶ھ [۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۷ء]
وارد حال قصبہ ٹانڈہ، ضلع فیض آباد

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے نام

جمیل المناقب محترم المقام دامت برکاتکم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مزاج سامی۔ باعث تصدیعہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی اعتبار سے جو حالت ہے وہ جناب والا کے سامنے ہے۔ نوجوانوں میں لامذہبیت اور بے دینی جس رفتار سے روز بروز پھیلتی جارہی ہے، وہ دیندار حضرات کے دل میں نہایت درجہ تشویش پیدا کرنے والی ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی

رہنمائی پر ایسے لوگوں کا قبضہ ہوتا جارہا ہے جن کو اسلام اور اسلام کی مصالح اجتماعیہ سے نہ پوری طرح واقفیت ہے اور نہ ان کے دل میں دین اور ملت کی حقیقی بہی خواہی کا کوئی جذبہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جن خطرات اور اندیشوں کی بنا پر انگریزی تعلیم کی اجازت کی مخالفت کی تھی وہ ایک ایک کر کے سامنے آرہے ہیں۔ نئے تعلیم یافتہ حضرات نہ صرف اسلامی اعمال واخلاق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں بلکہ اسلامی عقائد سے بھی دور نظر آرہے ہیں۔ ان کا یہ ایک عام عقیدہ ہے کہ اسلام اور شریعت اسلامی موجودہ زمانہ کی ضروریات اور مقتضیات کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لیے وہ اس زمانے میں قابل عمل نہیں۔ اسی عقیدے کی بنا پر وہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف قوانین بنواتے ہیں۔ اس وقت مسلم لیگ پر ایسے ہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں مسٹر جناح نے اسمبلی میں قانونی شادی کے بل پر تقریر کرتے ہوئے انھیں خیالات اظہار کیا تھا اور آج بھی وہ قرآن کو ایک فرسودہ کتاب کہتے ہیں جیسا کہ عنایت اللہ صاحب مشرقی نے لاہور اور امرتسر میں ظاہر کیا ہے۔

یامین خان صاحب نے ۱۹۳۲ء میں اسی قانون پر تقریر کرتے ہوئے اسمبلی میں کہا کہ یہ قانون اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن کا صاف صاف حکم موجود ہے کہ مسلمان مرد مشرکہ عورت سے اور مسلمان عورت مشرک مرد سے شادیاں نہ کریں۔ شریعت بل کو انھیں مسٹر جناح نے اسمبلی میں ترمیمات پیش کر کے تباہ کیا۔ خلع بل کی ایک دفعہ حذف کر کے اس کو شریعت اسلامی کے خلاف پاس کرا کر مسلمانوں میں ایک فتنہ عظیم کا دروازہ کھول دیا۔ قاضی بل کی مخالفت کی اور اس جذبے کے ساتھ مخالفت کی (کہ) اس سے مسلمانوں میں مذہبی علما کا اقتدار قائم ہوگا، جس کو مٹانا ان کا اولین نصب العین ہے۔ غرض ایک نہیں بیسیوں قوانین اسمبلیوں میں ایسے سامنے آئے ہیں جس میں مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں نے صراحتہً اسلامی احکام اور اسلامی تعلیمات کی مخالفت کی ہے۔ انھی مفاسد کا سد باب

کرنے کے لیے دارالعلوم اور دوسرے مدارس عربیہ ہمارے اکابر نے قائم کیے تھے (قدس اللہ اسرارہم) اسی لیے حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے جمعیتہ علماء ہند کو قائم فرمایا تھا ۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء سے جمعیتہ علماء حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے بتلائے ہوئے راستہ پر گامزن ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کر رہی ہے چنانچہ پچھلے انتخابات میں جمعیتہ علماء نے اسی شرط پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے جو تمام مفاسد کا تنہا علاج ہے اور تمام مذہبی معاملات میں جمعیتہ علماء کی رائے کا اتباع کریں گے ۔ لیکن جمعیتہ علماء کی کوششوں سے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ان تمام وعدوں اور شرطوں کو پولٹیکل وعدے کہتے ہوئے نظر انداز کر دیا جو ہم سے کی گئی تھیں اور نہ صرف جمعیتہ علمائے ہند بلکہ تمام علماء دین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔ متعدد مقامات پر مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں اعلان کیا کہ ہم نے عوام کو علماے کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے ۔ ہم نے علماے کا اقتدار مٹا دیا ہے اور یہ ہماری کامیابی کی اولین منزل ہے ۔ یہ اعلان طبقہ علماے کے خلاف ہی اعلان جنگ نہیں ہے بلکہ اسلام اور شریعت اسلامی کے خلاف اعلان جنگ ہے ۔ غور تو فرمائیے کہ علماے کوئی نسلی گروہ نہیں ہے جس کو مٹانے سے اسلام کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا بلکہ عالم تو وہی فرد کہلایا جائے گا جو اسلامی احکام اور شریعت سے باخبر ہے ۔ اس کو مٹانے کے تو معنی یہی ہیں کہ اس طبقے کو مٹا دیا جائے جو دینی احکام سے واقفیت رکھتا ہے اور قدم قدم پر ان بے مہار یورپ زدوں کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکتا رہتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علماے مذہب کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے بعد اسلام، شریعت اور مذہب کو کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے ۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان لوگوں کے اس قسم کے دعاوی کے باوجود دو چار علما بھی آج ان کی تائید کس طرح کر رہے ہیں ۔ بہ ظاہر اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ان

حضرات علما کے پیش نظر ذوات ہیں۔ اس لیے وہ علما کی مخالفت کے عام دعووں کو ذوات ہی تک محدود سمجھتے ہیں یا ان کے سامنے مجبوریاں ہیں اور یا وہ اسی طرح ان یورپ زدوں کا فریب کھا رہے ہیں۔ جس طرح کل ہم کو فریب دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان لوگوں کا صاف صاف اعلان ہے کہ ہمارے سوائے کوئی جماعت (یا فرد) آٹھ کروڑ مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا حق نہیں رکھتا۔ لیگ ہی تنہا وہ نمائندہ جماعت ہے جو مسلمانوں کی نمائندگی کر سکتی ہے۔ اسی دعوے پر اس نے انتخابات کا مطالبہ کیا ہے اور انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے وہ اپنے دعوے کو ثابت کرنا چاہتی ہے۔ لیگ کے اس دعوے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے سوائے مسلمانوں کی کسی جماعت کا وجود تسلیم نہیں کرتی اور انتخابات میں لیگ کو رائے دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم بھی ان جماعتوں کے قتل کے محضر پر دستخط کرتے ہیں۔ اسی لیے جمعیتہ علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ موجودہ انتخابات میں پوری قوت کے ساتھ حصہ لے کر اس چیز کو ثابت کرے کہ لیگ کے حلقے کے باہر دیندار مسلمان اپنا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں اور ان کی جماعتوں کو بھی مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی مسائل کے متعلق اسی طرح بولنے کا حق ہے، جس طرح لیگ کو ہے۔ اگر آج بھی وہ مصالح دینیہ واسلامیہ موجود ہیں جن کے لیے حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے جمعیتہ علماء کی بنیاد رکھی تھی اور اگر آج اس کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے دیندار طبقے کی موجودگی کو ثابت کیا جائے تو ہم سب کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان انتخابات میں جمعیتہ علماء کی ہر ممکن امداد کریں اور لیگ کے اس دعوی "انا ولا غیری" کو غلط ثابت کر دیں۔ میرے ناقص خیال میں تو یہ مسئلہ موجودہ حالات میں دوسرے تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے اور میں اس کے لیے پوری بصیرت رکھتا ہوں۔

مصلحت دید من آن ہست کہ یاران ہمہ کار
بگذارند وخم طرہ یارے گیرند

مجھے نہیں معلوم کہ جناب والا میری رائے سے کہاں تک اتفاق فرماتے ہیں۔ تاہم یہ یقین ہے کہ اگر جناب والا اس کو موجودہ مسائل میں وقتی طور پر سب سے زیادہ اہم نہیں تو کم از کم اہم مسائل میں سے ضرور خیال فرماتے ہوں گے۔ اس لیے مودبانہ میری استدعا ہے کہ جناب والا جہاں تک ممکن ہو اس مہم میں جمعیتہ علماء کی امداد فرمائیں جو دیندار طبقے کی طرف سے لیگ کے خلاف جنگ کرنے کا بیڑا اٹھا چکی ہے۔ پنجاب کی بعض اطلاعات سے معلوم ہوا کہ جناب والا کے بعض متوسلین پنجاب میں اور خصوصاً جالندھر کے اطراف میں لیگ کی پرزور حمایت کر رہے ہیں۔ اگر جناب اپنے متوسلین سے ایک عمومی اپیل فرما دیں کہ وہ ہر جگہ جمعیتہ علما اور آزادی پسند جماعتوں احرار وغیرہ کی انتخابات میں امداد کریں اور مسلم لیگ کا کسی طرح ساتھ نہ دیں تو یہ جمعیتہ علماء اور احرار وغیرہ کی بہت بڑی امداد ہو گی۔ جہاں پر جمعیتہ علماء کا نظام قائم نہیں ہے وہاں بھی لیگ کی مخالفت ضروری ہے۔ لیگ کے مقابلہ میں دوسری جماعتوں کا ساتھ دینے سے بھی بالواسطہ جمعیتہ علماء ہی کی تائید ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ لیگ کے سوا مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کا بھی وجود ہے۔

جناب والا کے ملاحظہ کے لیے میں اپنا ایک عریضہ جو رائے دہندگان کے نام لکھا گیا ہے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اس میں بالاجمال لیگ کے زعما و قائدین کی بعض کارگزاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں بہت کچھ مواد فراہم کیا ہے جو انشاء اللہ طبع ہونے پر وقتاً فوقتاً ارسال خدمت اقدس کروں گا۔ واللہ الموفق وھو یہدی السبیل۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۹ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ [۱۵۔ نومبر ۱۹۴۵ء]

مرکزی و صوبائی اسمبلی کے راے دہندگان کے نام

(۱۹۴۵ء)

حضرت علیہ الرحمہ کا یہ مکتوب گرامی ۱۹۴۵ء میں مرکزی مسلم پارلیمنٹری بورڈ، دہلی کی طرف سے مرکزی و صوبائی مسلم ووٹروں کی رہنمائی کے لیے کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ حضرت کا یہ وہی گرامی نامہ ہے جس کا ذکر حضرت راے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام مکتوب کے آخر میں آیا ہے۔

محترم المقام! زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف۔ آپ کو معلوم ہوگا اور اگر معلوم نہ ہو تو تحقیق کرنے اور ہمارے پمفلٹوں کے دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مسلم لیگ صرف نام کی مسلم جماعت ہے۔ اور اس کے دعوے صرف زبانی دعوے ہیں۔ کام اور حقیقت اس سے بہت دور ہیں۔ دین اور مذہب سے اس کو لگاؤ نہیں۔ اس پر قبضہ سرمایہ داروں اور خود غرض نوابوں، راجاؤں، سروں، خان بہادروں، خان صاحبوں، تعلقداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کا ہے۔ جن کا نصب العین ہمیشہ حکومت برطانیہ اور اس کے حکام کی خوشنودی اور ان کے یہاں جاہ اور عہدہ طلبی رہا کیا ہے۔ نہ ان کو مسلمانوں کے عوام غریب طبقوں سے واسطہ رہتا ہے اور نہ ان کو ایسے لوگوں سے حقیقی ہمدردی ہوتی ہے مذہب اسلام اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے وہ اسی طرح کتراتے ہیں۔ جس طرح بکری بھیڑیے سے اور ظلمت نور اور روشنی سے۔ زبان پر تو مذہب اور اسلام کے ترانے ہیں۔ مگر ان کی عملی زندگی اور صورت و سیرت اس کے بالکل خلاف اور اس کی تکذیب کرنے والے ہیں۔ اردو کی حمایت میں نہایت پرزور تقریریں اور تحریریں کرتے ہیں۔ خط و کتابت، بول چال انگریزی زبان میں ہے۔

(۱) ... انھوں نے اسمبلی میں شریعت بل کو مکمل طور سے اسمبلی کے آخر وقت تک پاس نہ ہونے دیا بلکہ ایسی قیود لگادیں کہ وہ بالکل ناکارہ اور بے روح ہو گیا
(دیکھو اسمبلی رپورٹ ۳۵،۔ ۳۷،۔ ۴۲۔)

(۲) ... گورنمنٹ کے اصرار پر خلع بل جس صورت میں پاس ہوا۔ یعنی یہ کہ اس میں سے مسلم حاکم کی دفعہ نکال دی گئی۔اس کے تدارک کے لیے جو قاضی بل پیش کیا۔ یہی نہیں کہ اس کے پاس کرانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کی مخالفت کر کے نامنظور کرادیا
(دیکھو اسمبلی کی رپورٹ ۳۹۔)

(۳) ... انھوں نے قاضی بل کو جس سے خلع بل کے مذکورہ بالا نقصان کی تلافی ہو سکتی تھی۔ نیز مسلمانوں کو اپنے پرسنل لا اور خصوصی احکام شرعیہ میں بہت سی سہولتیں اور کامیابیاں ہو جاتیں۔آخر وقت تک پاس نہ ہونے دیا۔جس کی وجہ محض یہ خیال تھا کہ علما کا اقتدار ہو جائے گا۔
(اسمبلی رپورٹ ۱۵۔اپریل ۱۹۴۵۔)

(۴) ... انھوں نے پانچ سو علماء کے فتوے کے خلاف آرمی بل حکومت سے مل کر پاس کروادیا۔

(دیکھو انڈین اینول رجسٹر ۳۸۔ جلد دوم صفحہ نمبر ۸۷، مورخہ ۲۲۔اگست ۳۸۔)

(۵) ... انھوں نے مسجد شہید گنج کے معاملہ کو پنجاب سے کلکتہ لے جا کر ہمیشہ کے لیے دریاے ہگلی میں ڈبو دیا۔
(تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۴۸۰)

(۶) ... انھوں نے ۱۹۱۲ء میں سول میرج کی ترمیم کی تائید کرتے ہوئے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں باہم شادی بیاہ کی انتہائی کوشش کی حالانکہ انھیں اقرار تھا کہ یہ قانون بنوانا قرآنی حکم کی مخالفت ہے۔

(گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ، شعبہ قانون سازی صفحہ ۱۶۰۔۱۶۱)

(۷) ... انھوں نے موٹر ڈرائیوروں پر لائسنس کی سخت شرائط میں گورنمنٹ کا ساتھ دیا جس سے غریب ڈرائیوروں کے لیے سخت مشکلات پیدا ہو گئیں۔

(رپورٹ مرکزی اسمبلی ۱۹۳۸ء)

(۸) ... انھوں نے ۱۹۱۶ء میں لکھنو پیکٹ کر کے صوبہ بنگال اور پنجاب کی مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا۔

(روشن مستقبل ص ۳۵۷ اور (لیگ وزعمائے لیگ کی سیاسی غلطیاں)

(۹) ... انھوں نے ۱۹۳۱ء میں راؤنڈ ٹیبل روم میں جاکر یورپین ایسوسی ایشن اور ہندوستانی عیسائیوں وغیرہ سے ساز باز کر کے مسلمانوں سے غداری کی اور پنجاب وبنگال کے لیے آئینی اقلیت اور دیگر ایسے امور پر جو کہ نہ صرف مرکزی دستوری کمیٹی سے عہد کے خلاف تھے بلکہ ہندوستانی غلامی کی جڑیں مضبوط کرنے والے بھی تھے ان پر دستخط کر دیے۔

(روزنامہ انقلاب ۹ فروری ۱۹۳۲ء اور مسلم لیگ کی آٹھ مسلم کش سیاسی غلطیاں)

(۱۰) ... انھوں نے ۱۹۳۳ء میں کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) تسلیم کر لیا، جس کی بنا پر بنگال کے مسلمانوں کو جو کہ ۵۳ فیصدی تھے ساڑھے ۴۷ فیصدی اور پنجاب کے مسلمانوں کو جو کہ ۵۵ یا ۵۶ فیصدی تھے ۴۹ فیصدی نشستیں ملیں اور یورپینوں اور عیسائیوں کو ان کے حقوق سے پچیس گنا زیادہ ۳۱ سیٹیں مل گئیں۔

(تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۴۲۰ وروشن مستقبل صفحہ ۴۲۱، ۴۲۲)

(۱۱) ... ۱۹۳۵ء میں شہید قوم عبدالقیوم مرحوم کو جبکہ پھانسی دے کر جیل والوں نے بلا نماز جنازہ پڑھائے ہوئے اندھیرے میں علی الصبح دفن کر دیا تھا اور اس کی خبر مسلمانان کراچی کو پہنچی جو کہ لاش ملنے کے منتظر تھے تو انھوں نے قبر کھود کر لاش نکال کر عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھنے کے لیے لے جانا چاہا، پولیس اور حکام نے مزاحمت کی، مگر مسلمانوں نے اپنا مذہبی فریضہ جان کر پولیس کے حکم کو نہ مانا، پولیس نے بہ حکم افسران بالا گولی چلا دی جس سے ۴۷ مسلمان شہید اور ایک سو سے زیادہ زخمی ہو گئے۔ اس پر مرکزی اسمبلی میں تحریک التواء پیش کی گئی جو کہ ۶۷ آراء کی اکثریت سے بہ

مقابلہ ۵۲ پاس ہوگئی اور حکام کراچی مجرم اور مستحق سزا قرار دیے گئے۔ مگر سر یامین خان نے جو کہ لیگ کے نہایت سربرآوردہ رکن ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف داری میں ایڑی سے چوٹی تک زور لگا کر نہایت طویل اور مہمل تقریر کی اور حکام کراچی کو بے قصور قرار دیتے ہوئے وقت اجلاس کو ختم کر دیا۔اس خدمت کو انجام دینے کے بعد ہی ان کو سر کا خطاب گورنمنٹ سے عطا کیا گیا۔(رپورٹ کونسل آف اسٹیٹ، ۱۰۔اپریل ۱۹۳۵ء)

(۱۲) انھوں نے محافظین مذہب اور علمائے دین کے خلاف ان کے اقتدار اور قبولیت کے مٹانے کے لیے نہایت شرمناک اور تہذیب سوز پروپیگنڈہ کیا اور اس پر کامیابی پر اپنی تقریروں اور تحریروں میں فخر کیا کہ ہم نے علما کے اقتدار کو ختم کر دیا ہے۔ جس کا صریح اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مذہبیت مسلمانوں سے مٹ جائے اور لادینیت اور الحاد کا دور دورہ تمام ہندوستانی مسلمانوں میں قائم ہو جائے۔

(۱۳) .... انھوں نے صوبہ بنگال میں ۱۹۴۴ء میں قحط ڈلوایا جس کی بنا پر ۳۵ لاکھ سے زیادہ انسان بھوک کی وجہ سے مر گئے، جن میں اکثر مسلمان تھے۔

(کلکتہ یونیورسٹی کی رپورٹ روزنامہ انصاری۔دہلی، ۲۔جولائی ۱۹۴۴ء ورپورٹ قحط بنگال رائل کمیشن)

(۱۴) ... انھوں نے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو سنڈیکیٹ کے ذریعے ٹھیکے دے کر عام خلقت کو انتہائی افلاس اور گرسنگی میں مبتلا کر دیا۔ ہر جگہ رشوت کا بازار انتہائی درجہ گرم ہو گیا۔ (روزنامہ اجمل۔بمبئی، ۱۵۔جنوری ۱۹۴۵ء)

(۱۵) .... ۱۹۳۷ء میں حکومت نے سرحدی قبائل پر ہوائی جہازوں سے سات ہزار بم گرائے۔ سرکاری ممبروں نے اسمبلی میں اس کا خود اقرار کر لیا۔اس پر مسٹر ستیہ مورتی نے احتجاج کرتے ہوئے تحریک التواء پیش کی، مگر ان لیگیوں نے اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ یہ لوگ جن پر بم گرائے گئے ہیں خالص مسلمان ہیں، حکومت کے خلاف

ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالا۔ (رپورٹ مرکزی اسمبلی ۱۹۳۷ء)

(۱۶) .... اقلیت والے صوبوں کے متعلق کانگریس کے مظالم کا انھوں نے ڈھنڈورا پیٹا۔ پیرپور رپورٹ تیار کی گئی۔ تقریروں اور تحریروں سے شعلہ بار گیس پھینکا گیا۔ مگر جب بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس نے چیف جسٹس کے ذریعے سے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ساتھ ساتھ مواقع پر چلنے کے ذریعے سے اور مولانا ابو الکلام آزاد نے فیڈرل کورٹ کے ججوں کے ذریعے سے تحقیقات کا چیلنج دیا تو اس کو ٹھکرا دیا اور رائل کمیشن کا مطالبہ حکومت سے کیا، جس پر بعض گورنروں نے سرے سے مظالم کے پائے جانے کا ہی انکار کر دیا اور وائسرائے نے رائل کمیشن کے مطالبے کو مسترد کر دیا۔

(روشن مستقبل صفحہ ۴۳۳، مدینہ۔ بجنور، ۲۱و۲۹ دسمبر ۱۹۳۹ء)

مگر لیگ کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ حکومت کے خلاف ڈائرکٹ ایکشن لیا جاتا۔ یا کم از کم چاروں طرف سے پروٹسٹ ہی کیا جاتا۔

(۱۷) .... انھوں نے شاردا بل جیسا منحوس قانون مسلمانوں پر مسلط کیا، ورنہ مسٹر ہربلاس شاردا نے فقط ہندوؤں کے لیے یہ قانون بنوانا چاہا تھا۔ مگر ان لوگوں نے مسلمانوں پر بھی مسلط کر دیا۔ جمعیتہ نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا کہ مسلمانوں کو اس سے مستثنے کر دیا جائے۔ یہ مذہب اسلام کے خلاف ہے اور اس کو پاس کرنا مداخلت فی الدین ہے، مگر ایک بھی نہ سنی گئی۔ جمعیتہ نے زیر سرکردگی مولانا محمد علی مرحوم ایک وفد بھی وائسرائے کے پاس بھیجا اور مولانا محمد علی مرحوم نے تیس ورق کا ایک ایڈریس بھی پیش کیا۔ آخر میں مولانا احمد سعید صاحب نے وائسرائے کو تار بھی دیا کہ وہ اپنے ویٹو سے اس کو پاس نہ ہونے دے مگر مسلمان مستثنیٰ نہیں کیے گئے۔

(اینول رجسٹر ۱۹۲۹ء، نیز مدینہ۔ بجنور، اکتوبر ۱۹۳۹ء)

(۱۸) .... فلسطین کے مظالم پر جبکہ ۲۳۔ اگست ۱۹۳۷ء میں مسٹر غیاث الدین نے تحریک التوا پیش کی تو انھوں نے ذرا بھی لب کشائی نہیں کی اور تمام لیگ پارٹی ساکت ہی

رہی ۔ بالآخر تحریک التوا کی وائسرائے نے اجازت نہ دی ۔

(رپورٹ مرکزی اسمبلی ۱۹۳۷ء)

(۱۹) .... بلوچستان، صوبہ سرحد، آسام کے ان علاقوں کی نسبت جن میں مسٹر جوشی نے اصلاحات کے نفاذ کا بل ۲۸۔ فروری ۱۹۳۶ء میں پیش کیا۔ جس سے مسلمانوں کو زیادہ فائدہ پہنچتا تھا، مگر انھوں نے حمایت نہ کی ۔ وہ بل اگرچہ اکثریت سے پاس ہوا مگر آج تک عملی صورت ظاہر نہ ہوئی ۔

(رپورٹ اسمبلی ۱۹۳۶ء)

(۲۰) .... انھوں نے لونگ بل میں حکومت کا ساتھ دے کر زنجبار کے ہندوستانی تاجروں اور مسلمان عرب کاشتکاروں کو سخت نقصان پہنچایا اور وہاں کے انگریز تاجروں کو بہت نفع پہنچایا ۔

(رپورٹ مرکزی اسمبلی، ۲۳۔ اگست ۱۹۳۷ء)

یہ اور ایسے بہت سے امور ہیں جو کہ بتلا رہے ہیں کہ لیگ کی پالیسی نہایت ہی غلط ہے اور اس کی رہنمائی بالکل گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے ۔ نہ وہ مذہبی امور میں قابل اعتبار ہے اور نہ سیاسی میدان میں لائق اعتماد ہے ۔ اس کے لیے کسی مسلمان کے لیے جو ادنیٰ عقل اور غیرت اور دیانت رکھتا ہو درست نہیں ہے کہ لیگ کی کسی قسم کی بھی اعانت اور امداد کرے یا کسی لیگی کو ووٹ دے ۔ خصوصاً جبکہ اس قسم کی غلط کاریاں اور بے دینیاں کرنے کے باوجود لیگ یہ بھی دعویٰ کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمایندہ ہے ۔ اس کے سوا کوئی پارٹی بھی خواہ جمعیتہ العلماء ہو یا احرار، مسلم مجلس ہو یا انڈی پنڈنٹ پارٹی، بہار، آل انڈیا مومن کانفرنس ہو یا خدائی خدمت گار، کرشک پرجا پارٹی ہو یا امارت شرعیہ بہار، نان پارٹی نیشنلسٹ ہوں یا یونینسٹ مسلمان پنجاب ۔ ان کا کوئی مطالبہ مسلمانوں کا مطالبہ نہیں ہے، نہ گورنمنٹ کو ان کی طرف آنکھ اٹھانا چاہیے اور نہ کانگریس وغیرہ کو ان سے بات چیت کرنی چاہیے ۔

ان ہی بداعمالیوں اور بے دینیوں سے مجبور ہو کر مسلمان پارٹیوں نے جمع ہو کر لیگ کے خلاف مسلم بورڈ بنایا ہے جس کے اغراض و مقاصد اس کے مینی فسٹو اور

پلیج (Pledge) سے بہ خوبی ظاہر ہیں اور عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گزریں گے۔

ان تمام مسلم پارٹیوں کے ممبران اور نمایندے وہ لوگ ہیں جو سالہا سال سے آزادی ہند اور خدمت اسلام میں سربکف چلے آتے ہیں۔ سیکڑوں قربانیاں کر چکے ہیں اور بے دھڑک تحریکات ملکیہ اور مذہبیہ کے میدان میں کود چکے ہیں اور آئندہ کے لیے تیار ہیں وہ مثل سربرآوردگان لیگ عافیت کوش اور راحت وآرام کے گدوں اور حکومت کی کرسیوں اور عہدوں کے گرداگرد طواف کرنے والے نہیں ہیں، وہ قول اور فعل کے سچے ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے نمائندوں ہی کو ووٹ دے اور ان ہی پر اعتماد کرے۔ لیگی زعما برطانویوں کے شاگرد رشید اور ان ہی کی طرح جھوٹ بولنے والے اور وعدہ خلاف اور خودغرض ہیں۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں جمعیتہ العلماء کو مختلف وعدوں اور عہدوں سے اپنے ساتھ ملایا اور جب اس کی امداد واعانت سے اتنے کامیاب ہوگئے کہ تیس برس کی مردہ لیگ زندہ ہو گئی تو تمام عہدوں کو توڑ دیا اور جب احتجاج کیا گیا تو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ وہ پولٹیکل وعدے تھے۔

(دیکھو رسالہ "مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل")

ان کے وعدوں کا اعتبار نہ کرنا چاہیے اور نہ ان کے سبز باغ کے دھوکے میں آنا چاہیے۔ قابل اعتماد صرف جمعیتہ العلماء اور اس کے شرکائے کار ہیں۔ ان ہی کی خدمتیں بے لوث اور مخلصانہ ہیں اور یہی سچے رہنما اور حقیقی خیرخواہ ہیں۔ انھیں کی تاریخ مردانگی اور جرأت اور قربانیوں اور جانبازیوں سے بھری ہوئی ہے۔ انھیں پر اعتماد کیجیے اور انھیں کے امیدواروں کو ووٹ دیجیے۔

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

آپ کا سچا اور بے لوث نیازمند

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ،

ہندوستان کی آزادی اور اسلامی ممالک

"روئے زمین پر اور ہندوستان میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے۔ جتنا اس نے اسلام کو برباد کیا اور کر رہا ہے اور کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ دنیا بھر میں کسی قوم اور کسی ملک نے نہیں کیا۔" (مکتوبات: ج ۴، ص ۳۲۸)

اپنی تقریروں اور تحریروں میں حضرت پوری تفصیل اور مکمل دلائل کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ عالم اسلامی کے گلے میں طوق غلامی کا بڑا سبب ہندوستان کی غلامی ہے اور اسی بنا پر وہ انگریز کی مخالفت کو مقدس فریضہ گردانتے تھے اور ملک کی جدوجہد آزادی کو جہاد کا درجہ دیتے تھے۔ اجمالی طور پر حضرت کی پالیسی پر ایک نظر ڈال لیجیے:

"ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، عراق، مصر، فلسطین، حجاز وغیرہ بھی انہی مصیبتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں اور افسوس یہ کہ ان تمام ممالک کی مصیبتیں صرف ہندوستان کی غلامی کے سبب سے ہیں۔ لہذا ہر مسلمان کا مذہبی اور دینی فرض ہے کہ اس ظالمانہ شاہنشاہیت کے بار گراں کو جلد از جلد ہندوستان سے ہٹا کر عدل وانصاف کی حکومت قائم کرے۔" (مکتوبات: ج ۴، ص ۱۴۱)

اس مقام پر ایک منٹ ٹھہر کر غور کر لیجیے کہ یہ وہ مقصد تھا، جس کے لیے حضرت نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور یہی وہ منزل تھی جس کے لیے تمام عمر سنگلاخ صحراؤں اور خار زار راہوں میں جادہ پیما رہے۔ دوسرے لیڈران، سیاسی جماعتیں اور ہندوستان کے اعیان جس جدوجہد کو تحریک آزادی ہندوستان، جس جنگ کو سیاسی اور ملکی لڑائی اور جن قربانیوں اور سرفروشیوں کو لیلائے آزادی کے حضور نذرانہ قرار دیتے تھے، حضرت کے مسلک میں وہ ساری سرگرمیاں اور قربانیاں مذہبی و دینی فریضہ تھیں۔ ایک ایسی جدوجہد جس کے ذریعے حجاز مبارک، حرمین شریفین، بیت المقدس، عرب و مصر، خلافت اسلامیہ، ہندوستان اور سبھی اسلامی طاقتوں کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہوں اور بیڑیاں کٹ رہی ہوں۔ وہ جہاد مقدس اور دینی فریضہ کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتی ہے۔

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی از عزیز الو حیدی: ص ۲۶۷-۲۶۶)

اسلامی تعلیمات کی روح

انسانیت اور اسلام کی روح یہ ہے کہ آپ برائی کا بدلہ بھلائی سے، زیادتی کا بدلہ احسان سے اور ظلم کا بدلہ عفو و درگذر سے دیں۔ یہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: صل من قطعک واعف عمن ظلمک واحسن الی من اساء الیک (جو تم سے قطع تعلق کرے تم اس سے تعلق قائم کرو، جو تم پر ظلم کرے تم اسے معاف کر دو، جو تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو) مصائب کے طوفانوں اور مشکلات کے ہجوم میں اللہ تعالے سے لمحہ بہ لمحہ تعلق مضبوط ہونا چاہیے اور صبر و ضبط کا دامن نہایت مضبوطی کے ساتھ پکڑنا چاہیے۔ ضبط، تحمل، استقلال، عالی حوصلگی اور توجہ الی اللہ ایسی طاقتیں ہیں جن کے سامنے دنیا کی ہر طاقت بالآخر سپر ڈال دیتی ہے اور شکست کھا جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار انہی طاقتوں سے امداد حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوۃ (اے ایمان والوں نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو۔) جذبات اور اشتعال کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسان برائی کا بدلہ برائی سے، بلکہ ایک برائی کا بدلہ ہزاروں برائیوں سے دے۔ لیکن یہ کوئی علاج اور مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس طرح ممکن ہے آپ گردنوں کو جھکا دیں مگر دلوں کو فتح کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ برائی اس طرح ختم ہو سکتی ہے کہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے۔ اگرچہ یہ بہت مشکل ہے، مگر قلوب کو اسی طرح مسخر کیا جاتا ہے اور حق کا مشن اسی طرح کامیاب ہوا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ادفع بالتی ھی احسن. فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔ برائی کا بدلہ ایسے اخلاق سے دیجیے جو بہت بہتر ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن سے آپ کی دشمنی ہے، آپ کے مخلص دوست بن گئے۔ مگر یہ بات صابر و شاکر لوگوں کو اور قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہاں! یہ ضرور خیال رہے کہ صبر، ضبط اور مکارم اخلاق کا مطلب بزدلی، خوف زدگی اور کمزوری نہیں ہے۔ صبر و ضبط کا مطلب یہ ہے کہ انتقام کے مواقع ملتے ہوئے بھی شرافت، اخلاق، مروت اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے۔"

(خطبہ صدارت جمعیت علماء ہند، حیدرآباد، ۱۹۵۱ء)

مجلس یادگار شیخ الاسلام

قاری منزل، پاکستان چوک، کراچی ۷۴۲۰۰